

رُوسی ادب

۲

محمد مجیب

جے ہاے (آکسن)

انجمن ترقی اُردو پاکِستان

روسی ادب

دوسرا حصہ

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی۔ ۱۵۹۔ بلاک ۷ گلشن اقبال
کراچی۔ ۷۵۳۰۰

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان / قدیم نمبر ۱۳۴ / جدید نمبر ۴۹۱

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح انجمن کو بھی اشاعت
کتب کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی
ہے)

۱۹۴۰ء

۱۹۹۲ء

مشور آفسٹ پریس، کراچی



پہلی اشاعت:

دوسری اشاعت:

طابع:

قیمت:

فہرست مضامین

۵	سیاسی تحریکیں، سیاسی تصانیف اور ادبی تنقید روسی ناول :-
۲۳	پہلا باب : گوگول
۵۲	دوسرا باب : اکساکوف
۷۵	تیسرا باب : گرگیو رودویچ، پی سم سکی، گونچروف
۱۰۳	چوتھا باب : تورگنیف
۱۵۲	پانچواں باب : دستہ کف سکی
۲۱۴	چھٹا باب : سالتی کوف (شچدرن)
۲۳۱	ساتواں باب : سکوف
۲۴۴	آٹھواں باب : تالستائی
۲۹۴	نواں باب : گارشین اور کورولینکو
۳۰۳	دسواں باب : چخوف
۳۴۴	گیارھواں باب : گورکی



سیاسی تحریکیں ، سیاسی تصانیف اور ادبی تنقید

اٹھارویں صدی تک روس اور فرانس کے تعلقات ایسے ہو گئے تھے کہ روس پر فرانسیسی انقلاب کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ روس کی مشہور ملکہ کیتھرین (۱۷۶۲-۱۷۹۶) جس کے عہد کے آخری زمانے میں فرانسیسی انقلاب ہوا، ادب سے بڑی دل چسپی رکھتی تھی، مگر اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ روسی قوم فرانسیسیوں سے بناوٹ کے طریقے سیکھے اور اس نے آزاد خیالی کا سر کچنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ۱۸۰۵ سے ۱۸۱۵ تک فرانس کے شہنشاہ نپولین سے جو لڑائیاں ہوئیں انہوں نے روس میں سیاسی حوصلوں کو دوبارہ زندہ کر دیا اور وہ روسی دطن پرست جن کی جاں بازی نے روس کو نپولین کے پنجے سے بچایا تھا یہ امید کرنے لگے کہ ان کا ایثار قوم کی آزادی کا راستہ صاف کر دے گا۔ نپولین کے خون نے روسی قوم اور حکومت کے درمیان جو ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اس کا نتیجہ بھی ہونا چاہیے تھا، مگر کامیابی کے بعد زار الکسانڈر اول کے رویتے نے روشن خیال روسیوں کو بالکل مایوس کر دیا اور وہ زار کی مدح سرائیوں کی جگہ خفیہ انجمنیں قائم کر کے اپنی آزادی کی

تدبیریں آپ کرنے لگے۔ ان انجمنوں کے ممبر زیادہ تر فوجی افسر تھے اور وہ لوگ جنہوں نے یورپ کی سیر کر کے آزادی کی فضا کا لطف اٹھایا۔

حکومت ان انجمنوں کے خلاف شروع ہی سے کارروائی کرتی تو یہ تحریک اٹھنے ہی نہ پاتی، لیکن زارا لکساندر نے اصل حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی کچھ کرنا مناسب نہ سمجھا، ان انجمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کی تعلیم اور حوصلوں نے روشن خیال روسیوں کو اپنا کردیدہ کر لیا۔

الکساندر کے مرنے پر جب زار نکولائی اول (۱۸۲۵-۱۸۵۵) تخت پر بیٹھا جو آزادی اور آزاد خیالی کا کٹر دشمن سمجھا جاتا تھا تو صوبہ پودولیا اور شہر پیتر برگ کی انجمنوں نے بغاوت کر دی۔ باغی صرت ایک مظاہرہ کر کے حکومت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے، انھیں اس کی امید نہ تھی کہ وہ ملک پر قبضہ کر لیں گے اور بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ پانچ باغیوں کو پھانسی اور قریب سو کو ساری عمر کے لیے سائبیریا میں جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ یہ سب کے سب ادب، تہذیب اور اخلاقی بلند آہنگی کے پھول تھے جو کھلنے سے پہلے توڑ دیے گئے اور قومی زندگی کا باغ مدتوں کے لیے بالکل بے رونق ہو گیا۔

اس بغاوت کے بعد جو دسمبر ۱۸۲۵ء میں ہوئی اور اس سبب سے ڈیکا برست، یاد سبیری، کہلاتی ہے، جبر اور تشدد کا ایک دور شروع ہوا جو ۱۸۵۵ء تک جاری رہا۔ تمام اخباروں اور ہر قسم کی تصانیف کو ان خیالات سے پاک کرنے کے لیے جو حکومت کو مخدوش معلوم ہوتے تھے اخصاً

کا ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ ہر اخبار کو ضمانت داخل کرنے کے علاوہ ہر پرچے کو چھپنے سے پہلے دفتر احتساب میں بھیجنا پڑتا تھا، کتابیں بھی اسی وقت چھاپی جاسکتی تھیں جب دفتر احتساب اس کی اجازت دے دے اور چونکہ احتساب میں کلیسا کو بھی دخل تھا، اس لیے صرف وہ کتابیں یا وہ عبارتیں ہی نہیں جو سیاسی نقطہ نظر سے اشتعال انگیز ثابت کی جاسکتی تھیں بلکہ وہ بھی جن پر بے دینی پھیلانے کا الزام لگایا جاسکتا تھا رد یا خارج کر دی جاتیں اور محتب کو اس کا بھی اختیار تھا کہ عبارت میں حسب مرضی ترمیم کر دے۔ مصنفوں کے لیے ایک اور آفت یہ تھی کہ محکمہ احتساب کا پولیس سے تعلق تھا اور جو اصلاح محتب کے بس کی نہ ہوتی وہ پولیس کے سپرد کر دی جاتی ۱۸۳۵ تک صرف لشکن کی ذات تھی کہ جس نے ادبی ذوق کو زندہ رکھا، مگر اس کا محتب جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، خود بادشاہ تھا اور دربار میں رکھ کر اسے اس طرح پابند اور مجبور کر دیا گیا تھا کہ جس سے شاید جلاوطنی بھی بہتر ہوتی۔

اس دور میں جب کہ احتساب اور پولیس آزاد خیالی کا گلا دبائے ہوئے تھے، روسیوں کے غیر ملکوں سے تعلقات قائم رہے، تعلیم اور سیر کے لیے روسی فرانس اور جرمنی جاتے رہے اور فرانسیسی اور جرمن فلسفیان کا مطالعہ کرتے رہے۔ بھوکے کو سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی ایک نعمت معلوم ہوتا ہے، تعلیم یافتہ روسیوں میں فلسفے اور تہذیب کے مسائل پر غور و بحث کرنے کا شوق پھیلا اور مباحثوں کے لیے مختلف حلقے قائم ہوئے جن میں

ستان کیے وچ (۱۸۱۷ء - ۱۸۴۰ء) کا حلقہ بہت مشہور ہوا۔ ہاکونن، ہرٹن، بیے لن سکی اور ان کے علاوہ اور بہت سے نوجوان جنہوں نے سیاست اور ادب میں نام پیدا کیا سب اس حلقے میں شامل تھے اور یہیں کے مباحثوں میں ان کے خیالات کی تشکیل ہوئی۔ بعض خصوصاً طالب علموں کے حلقے ایسے تھے جن میں فرانس کی اشتراکی تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا، روس کے سیاسی مسائل پر آزادی کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوتا اور روس کو آزاد کرنے کی تدبیریں سوچی جاتیں۔ ہرٹن اور شاعر اور گاریٹوف ایسے ایک حلقے کے حلقوں میں شریک ہو کر کرتے تھے اور جب پولیس کو اس کا پتہ لگ گیا تو حلقے کے تمام اراکین کو پکڑ کر سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن سزائوں کے باوجود طالب علموں کے حلقے بنتے رہے، معاشی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر بحثیں ہوتی رہیں۔ انشا پر دازوں کو سزا کے خوف نے اپنی بات صاف صاف نہیں کہنے دی، یا محکمہ احتساب نے ان کی تصانیف کو رد کر دیا، یا ان کی صورت بگاڑ دی، بہتیرے ایسے بھی تھے جنہوں نے چند سال کسی قید خانے میں گزارے مگر ادب نے وہ شمع کبھی بجھنے نہ دی جو جوانی کے دلوں سے جلاتے تھے۔

۱۸۲۵ء کی سزائوں نے بارہ تیرہ برس تک روسیوں کو سہمائے رکھا، پھر ماسکو کے ایک اخبار ”دورین“ میں چادائف (۱۷۹۳ء - ۱۸۵۵ء) کا ایک خط چھپا جس نے تعلیم یافتہ لوگوں میں ہل چل مچا دی۔ چادائف نے لکھا تھا کہ ”دینا میں بس ہماری قوم ایک ایسی ہے کہ جس نے دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچایا نہ

دوسروں سے کچھ حاصل کیا۔ ہم نے انسانیت کے علمی خزانے میں ایک نئے خیال کا اضافہ نہیں کیا، انسانی عقل کو ترقی دینے میں ہم نے ذرا بھی مدد نہیں دی اور دوسروں کی حاصل کی ہوئی علم اور عقل کی دولت جو ہمارے ہاتھ لگی اس کی بھی ہم نے مٹی پلید کی... ہمارے خون میں کوئی مادہ ہی جو ہم کو تہذیبی اثرات کا دشمن بنا دیتا ہی، ہم دنیا میں ناجائز اولاد کی طرح بھیجے گئے ہیں... ہماری نشوونما ہوتی ہی مگر ہم بچنگی سے محروم رہتے ہیں... ہم آگے بڑھتے ہیں مگر ہمارے قدم پڑھ پڑتے ہیں، ہمارا سفر کسی منزل کی طرف نہیں ہوتا... ”چادائف یورپ میں ایک عرصے تک رہا اور وہاں کے بہترین عالموں کی صحبت میں بیٹھا تھا، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اسے روس کی حالت ایسی گری ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر بھی چادائف کا خیال تھا کہ اگر روسی کیتھلک روسی کلیسا کا مذہب اختیار کر کے عیسائی ملت میں پورے طور پر شامل ہو جائیں تو ان کا مستقبل اتنا تاریک نہ ہوگا۔ اس خیال سے اتفاق کرنے والے بہت کم تھے، مگر چادائف نے جو الزام اپنی قوم پر لگائے تھے ان سے وطن پرست اور روشن خیال روسیوں نے بہت اثر لیا اور اس پر عام طور سے غور کیا جانے لگا کہ روس کی تاریخ سے کیا سبق حاصل کیا جاسکتا ہی اور آئندہ کے لیے روسی قوم کا مسلک کیا ہونا چاہیے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ روسی تاریخ کی خصوصیات کیا ہیں اور اس میں کون ایسے ادارے، قاعدے یا اصول ملتے ہیں جن کی بدولت روسی معاشرے نے

ایک خاص شکل پائی، جن کے سانچے میں روسی ذہنیت ڈھالی گئی۔ یہ معلوم کر لیا جاتا تو پھر طر کرنا تھا کہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لیے کیا کیا لازمی ہو اور اسے کس طرح حاصل کیا جائے۔ ۱۸۵۵ تک تو ان مسائل پر بحث کرنا صرف خاص حلقوں میں ممکن تھا، کیوں کہ تصنیف تالیف پر محکمہ احتساب کو پورا اختیار تھا، اخبار وہی چل سکتے تھے جو اس محکمے کو راضی رکھے کے لیے لغویات میں پڑے رہیں اور رسالے بھی سیاسی اور تاریخی مسائل سے دور بھاگتے تھے۔ اس کے باوجود غور و فکر کا ایسا چرچا رہا کہ ۱۸۵۵ تک ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں دو بڑی پارٹیاں بن گئی تھیں، جو ”یورپ دوست“ اور ”سلاو دوست“ کے ناموں سے مشہور ہوئیں۔

ان پارٹیوں کی بنیاد عقیدوں سے زیادہ رجحانات پر تھی اور اس طرح جو لوگ کسی ایک پارٹی میں شامل سمجھے جاتے تھے ان کے درمیان بھی خاصا اختلاف تھا۔ ”یورپ دوست“ وہ تمام لوگ تھے جو یورپی تہذیب سے اثر لینا اور یورپ کے سیاسی اور معاشی تصوروں اور تجربوں کے سبق لینا روس کی ترقی کے لیے لازمی سمجھتے تھے، کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ فطرً روسی یورپ کی قوموں سے مختلف نہیں اور انھیں بھی ان منزلوں کو طر کرنا ہو گا جن سے یورپ کی ترقی یافتہ قومیں گزر چکی ہیں۔ چنانچہ اس پارٹی میں انتہا پسند اشتراکی تھے اور وہ اشتراکیت کی تعلیم روس میں پھیلانا چاہتے تھے، جو میانہ روی کے قائل تھے وہ روس میں جمہوریت کا چراغ روشن کرنا، عام رائے پیدا کرنا اور قوم سے آپ اپنی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔

بعض اس پارٹی میں ایسے بھی تھے جو ریاست اور حکومت کی ہر طرح سے حمایت اور فرماں برداری کرتے تھے، اس خیال سے کہ ان کی قوم تہذیب سے بالکل نا آشنا تھی اور صرف حکومت ہی اسے اس لائق بنا سکتی تھی کہ وہ یورپی قوموں کی پیروی کر سکے۔ اسی طرح "سلاط دوستوں" میں اگر یہ بات عام طور سے مانی جاتی تھی کہ روسی قوم ایک نرالی فطرت رکھتی ہے تو بعض یہ کہتے تھے کہ وہ تمام قوموں سے زیادہ آزاد ہے اور چوں کہ وہ تاریخ کی روسے کسی خاص سیاسی اور سماجی نظام کی پابند نہیں، وہ اپنی قومی زندگی کو جو شکل چاہے دے سکتی ہے، بعض کہتے تھے کہ نہیں، یہ خیال بالکل غلط ہے، قدیم روس میں ایسے تصورات اور ادا ردل کا پتہ چلتا ہے کہ جنہیں دوبارہ زندہ کیا جائے تو روس میں ایک ایسا نظام قائم کیا جاسکتا ہے جو یورپی قوموں کی تنظیم سے اصولاً بہتر اور بہت زیادہ پائدار ہوگا، بعض ایسے بھی تھے جو زاری حکومت، باز نطینی کلیسا اور ان دونوں کی دل سے اطاعت کرنے والی روسی قوم کو بذاتِ خود مایہ ناز سمجھتے تھے اور ان کی دعا تھی کہ روس یورپ کی تقلید اور آزادی اور آزاد خیالی کی دبا سے محفوظ رہے۔

"یورپ دوست" فرحے کے لوگ روس کی وحشی طبیعتوں اور غیر شائستہ زندگی پر افسوس کرتے تھے اور ان میں جو انشا پرداز اور ادیب تھے وہ بھی اپنی شکایتیں اور اپنے درد کو بیان کر کے رہ گئے۔ یورپ دوست نادل نویوں میں ادان تورگینف (۱۸۱۸-۱۸۸۳) پیٹم سکی (۱۸۲۰-۱۸۸۱) شچدیرن (۱۸۲۶-۱۸۸۹) سب سے زیادہ ممتاز ہیں، شاعروں میں

نیکراسوف (۱۸۲۱-۱۸۷۷) اور اڈگار یوٹ (۱۸۱۳-۱۸۷۷)۔ لیکن ان لوگوں کی قدردانی ہونے کے سبب سے بھی، روس کے نوجوانوں پر کہیں زیادہ اثر ان لوگوں کا تھا جنہیں ادبی شہرت حاصل کرنے کی ہنسی بلکہ اپنے خیالات کے پرچار کی فکر تھی، ہرٹسن (۱۸۱۲-۱۸۷۰) باکونن (۱۸۱۴-۱۸۷۶) لا فروف (۱۸۲۷-۱۹۰۱) چرنی شف سکلی (۱۸۲۸-۱۸۸۹) اور پاریٹ (۱۸۴۰-۱۸۶۸)

ہرٹسن کو شروع جوانی سے سیاسی معاملات سے دلچسپی تھی اور ۱۸۴۲ میں وہ انقلاب پسند نوجوانوں کے ایک حلقے کے رکن ہونے کی سزا میں چھ سال کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس سزا کو بھگتنے کے فوراً بعد ہی وہ ایک ادنیٰ عہدے پر مامور کر کے ماسکو سے نوٹ گوردو بھیج دیا گیا، مگر اس نے عہدے سے استعفیٰ دے کر انٹابردازی کی مشق شروع کر دی۔ پہلے اس نے فلسفیانہ مسائل پر ایک کتاب لکھی اور پھر دوناول، جن کے عنوان ”کس کی خطا ہے؟“ اور ”ڈاکٹر کروپوت“ تھے اور جن میں چند رسموں پر اعتراض کیے گئے تھے۔ ناول شایع ہونے کے دو سال کے بعد ہرٹسن نے روس چھوڑ دیا اور باقی عمر انگلستان، فرانس اور سوستان میں گزاری۔ شروع میں ہرٹسن سلاف دوستی کی طرف مائل ضرور تھا اور اپنی ایک کتاب میں اس نے پشین گوئی کی کہ یورپ کو بہت جلد زوال آنے والا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ باکونن اور یورپی اشتراکیوں کا اثر اس کی سلاف دوستی پر غالب آ گیا اور وہ بھی اشتراکی اور یورپ دوست

بن گیا۔ ۱۸۵۲ء میں، جب اس نے مستقل طور پر لندن میں رہنے کا ارادہ کر لیا تھا، اس نے ”قطب“ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اسی میں اپنی سرگزشت ”زمانہ اور خیالات“ کے عنوان سے شایع کی۔ ہرٹسن کی ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں سے جان پہچان تھی، دنیا کی ادب و سخن بھی اس نے خوب دیکھی تھی، زبان میں اسے بڑا ملکہ تھا، اس لیے اس کی یہ تصنیف دل چسپ واقعات، کیر کڑوں اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ایک کارنامہ مانی جاتی ہے۔

۱۸۵۰ء میں ہرٹسن نے ایک ہفتہ وار رسالہ ”گھنٹی“ کسانوں کو آزاد کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی اس میں حصہ لینے اور اس سے تقویت پہنچانے کے لیے جاری کیا۔ ہرٹسن کا ایک دوست (اور مشہور ناول نویس تو گینف کا رشتہ دار) نکولائی توگینف جو ایک بڑا رئیس تھا اور دوبارہ اور حکام کے طبقے میں بہت رسوخ رکھتا تھا اسے ایسی خبریں پہنچا دیا کرتا تھا جن کا روسی اخباروں کو پتہ نہ ہوتا تھا اور ہوتا بھی تو وہ انھیں چھاپ نہ سکتے۔ دفتر احتساب اور پولیس کی طرف سے ”گھنٹی“ کو روس میں بیچنے اور پڑھنے کی ممانعت تھی، لیکن چون کہ زار الکساندر دوم (۱۸۵۵-۱۸۸۱) خود روشن خیال آدمی تھا، پولیس کی سختیاں اس زمانے میں ذرا کم ہو گئی تھیں اور ہرٹسن کا اخبار بہت چلا۔ لیکن جب ۱۸۶۱ء میں کسان آزاد کر دیے گئے تو لوگوں کی توجہ ختم ہو گئی، ہرٹسن اخبار کے پڑھنے والوں کو اشتراکی تعلیم کی طرف مائل نہ کر سکا اور جب ۱۸۶۳ء میں پولینڈ میں بغاوت ہوئی اور ہرٹسن

باغیوں کا ساتھ دیا تو اس کے پرچے کی اشاعت قریب قریب بند ہو گئی اور لوگ خود ہرٹسن کو بھی بھول گئے۔

ہرٹسن کے حلقے میں نکولائی توگینف (۱۷۸۹-۱۸۷۱) میخائل باکونن

(۱۸۱۴-۱۸۷۹) پوٹرلافون (۱۸۲۳-۱۹۰۱) وہ خاص لوگ تھے جنہوں نے

صرف اسے نہیں بلکہ ۱۸۴۰ سے ۱۸۵۰ تک اکثر آزاد خیال روسیوں کو

اشتراکیت کے سبق پڑھائے۔ ۱۸۴۰ تک روس کے سمجھ دار لوگ جرمن فلسفے

کے پھر میں پڑے تھے اور اسی سے اپنے سیاسی عقیدے اور معاشرتی تعلیم

اخذ کرتے تھے۔ چنانچہ جرمن فلسفی ہیگل کے اس نظریے نے کہ ”جو کچھ موجود

ہو وہ عقل پر مبنی ہوتا ہے“ بیسے لن سکی جیسے آزادی کے دل دادہ ادیب

اور نقاد کو زاری حکومت کا حامی اور فرماں برداری کا مبلغ بنادیا۔ باکونن

بھی ایک عرصے تک اسی قسم کے فلسفیانہ مقولوں کے پھندے میں پھنسا ہوا

لیکن جب وہ ۱۸۴۲ میں یورپ گیا اور وہاں کی زندگی اپنی آنکھ سے

دیکھی تو اس کے خیالات بالکل بدل گئے اور اسی کے سمجھانے سے اس

کے دوست احباب بھی مجرد تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر حقیقت

سے روشناس ہوئے مگر باکونن نکولائی توگینف اور لافون کا اثر ان

کے اپنے ملک میں بہت کم رہا، اس لیے کہ وہ خود زیادہ تر غیر ملکوں میں

رہے اور ۱۸۵۰ کے بعد روس کے آزاد خیال لوگ اشتراکیت کی طرف

اس قدر مائل نہیں ہوئے جتنے کہ ”منکریت“ کی طرف۔

”منکریت“ محض انکار کا مسلک تھا، کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ ”منکر“

یہ کہتے تھے کہ سیاسی اور سماجی مسائل میں جذبات کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جسے علم اور سائنس صحیح بتائیں۔ اس لیے ”منکروں“ مذہب، رسم و رواج، اخلاقی اصولوں اور اس معاشرتی نظام کو جو ایک نسل سے دوسری کو ورثے میں ملتا ہی تسلیم نہیں کرتے تھے اور تقدیر پر ہندی کے جذبے کو صدمے پہنچانے میں انہیں خاص مزہ آتا تھا۔ لیکن سینکڑوں سالوں کا صرف ایک پہلو تھا اور اس کو لوگ مذاق اڑا کر ختم کر دیتے اگر منکروں کے ساتھ ساتھ خدمت اور ایثار، جوش اور استعداد کی سینکڑوں اعلیٰ اور قابلِ شکر مثالیں نہ پیش کرتے۔ ان کے فرقے میں زیادہ تعداد نوجوان مردوں اور عورتوں کی تھی جنہوں نے سائنس یا طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور منکریت اصل میں حوصلہ مند اور کارپرداز نوجوانوں کی بغاوت تھی ایک عام بے حس کے خلاف جس نے قدامت پسندی اور اخلاق کی آڑ لے کر ریاست کو جبر کرنے اور اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

”منکروں“ کے فرقے نے اسی سال سر اٹھایا جب کہ زاراٹھرا کی طرف سے کسانوں کو آزاد کرنے کا حکم جاری ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کسانوں میں آزادی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرنے کے لیے پانچ چھو سال تک ”منکروں“ نے ان میں گھل مل کر بہت کام کیا تھا اور کسانوں کو جو آزادی دی گئی تھی وہ ان حوصلوں کے مقابلے میں بہت بے حقیقت معلوم ہوتی تھی جو ”منکروں“ اور بعض مقاموں پر کسانوں کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ زاراٹھرا کی دین کا شکر یہ ادا کرنے کی جگہ کئی ضلعوں میں کسانوں نے

منکروں کی اشتعال انگیز تعلیم سے اثر لے کر بغاوت کر دی، ریاست کا نظم اور تشدد اسی نسبت سے بڑھ گیا اور ۱۸۸۱ تک منکروں اور حکومت کے درمیان کھلم کھلا لڑائی ہوتی رہی۔ ریاست نے ہزاروں نوجوانوں کو قید یا جلا وطن کیا، سینکڑوں کو بھانسی پر لٹکایا اور منکر اس کے جواب میں حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کو موقع پا کر قتل کرتے رہے۔ انتہا یہ ہوئی کہ ویرازا سوہج، ایک نوجوان عورت نے ماسکو کے گورنر کو مارا اور ۱۸۸۱ میں خود زار الٹ اندر کو ایک دمنکر نے قتل کر دیا۔ اس کارنامے کے بعد ”منکریت“ کی تحریک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ حکومت کو تو ”منکر“ سردار نہ سکے، لیکن جوش اور ایشار کی انھوں نے ایسی روشن مثالیں چھوڑیں کہ مخالفوں کے سر بھی ان کے سامنے ادب سے جھک گئے اور اس نئی زندگی کے لیے میدان تیار ہو گیا جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں رد نما ہوئی۔

یورپ دوست فرقے نے جو اشتراکی اور منکر پیدا کیے ان کے جواب میں ”سلاف دوست“ فرقے کے پاس کچھ بھی دکھانے کو نہیں۔ اس کے ممتاز نمائندوں نے یا تو تاریخ کا مطالعہ کیا یا قوم کو اپنی فطرت سمجھنے میں مدد پہنچائی اور ان کا عمل یہاں تک محدود رہا کہ تاریخ کے مطالعے یا رسمی فطرت کے مشاہدے سے جو اصول قائم کیے جائیں ان کا سیاست میں پورا لحاظ رکھا جائے۔ کیری لیف سکی (۱۸۰۶-۱۸۵۶)، فرمیا کوٹ (۱۸۰۴-۱۸۶۰) اور کونستان تن اکا کوٹ (۱۸۱۷-۱۸۶۰) کی کوششوں سے

فائدہ اٹھا کر سرگےئی سولہ فیوف (۱۸۲۰-۱۸۷۹) اور کوسٹو ماروف (۱۸۱۷-۱۸۸۵) نے روس میں تاریخ نویسی کو کمال تک پہنچایا اور ایک کم نام داستان کو قومی زندگی کی تعمیر کا ایک ذریعہ بنایا۔ دوسری طرف سلاف دوستوں نے اس بیگانگی کو دور کرنے کی بھی بڑی کوشش کی جو پیتر اعظم کی اصلاحوں کے بعد عوام اور تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

تنقید

سیاسی تحریکوں کی تحت میں تنقید کا ذکر نابظا ہر مناسب نہیں معلوم ہوتا، لیکن روس میں تنقید کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے سیاسی اور معاشی تعلیمات کو اپنا معیار مانا، اور اس طرح ادب کو سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کا خادم بنانے کی کوشش میں لگی رہی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انشا پرداز می کے سوا خیالات ظاہر کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اگر ادیب کو محض ایک فن کا ماہر مان لیا جاتا اور اس سے سیاسی اور معاشرتی مسائل میں قوم کی رہبری کرنے کی امید نہ رکھی جاتی تو اصلاح کا دروازہ ہی بند ہو جاتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روسی نقاد ستاعروں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کی شخصی زندگی قوم کے سامنے اخلاق کا اچھا نمونہ نہیں پیش کرتی، یا ناول نویسوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی عقیدے غلط اور مضمر ہیں اور تنقید کے اس اصول کو سب مانتے ہیں، چاہے نقاد کی رائے سے اختلاف کریں۔ روس میں ایسے انشا پرداز ہوئے ہیں

جن کا قوم میں بہت چرچا رہا مگر نقادوں نے انہیں بالکل نظر انداز کیا ، اس لیے کہ انہوں نے کوئی سیاسی یا اخلاقی نظریے پیش نہیں کیے تھے اور ایسے انشا پرہیزگار بھی ہوئے ہیں جنہیں نقادوں نے بہت سراہا مگر وہ پڑھنے والوں میں کبھی مقبول نہ ہوئے ، اس لیے کہ ان میں ادبی خوبیاں بہت کم تھیں۔ نقاد اپنے مسلک پر قائم رہے ، اس لیے کہ وہ تنقید کے پہانے سے معاشرتی مسئلوں پر بحث کرنا چاہتے تھے ، پڑھنے والے اپنے مسلک پر چلے ، کہ انہیں ابھی کتابوں سے مطلب تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نقاد اپنی الاپتے رہے اور پڑھنے والوں نے جو چاہا پڑھا۔ نقاد خود بھی اچھے ادیب تھے اور اگر کسی شاعر یا ناول نویس کے بارے میں ان کی رائے نہ مانی جاتی تب بھی ان کے مضامین شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ان سے اثر بھی لیا جاتا تھا ، اس لیے کہ سیاست اور اخلاقیات میں معلومات کے فرائض وہی انجام دیتے تھے۔ یہی نہیں ، بلکہ ہر دور کی ذہنیت اور مذاق کا پتہ ہمیں اس نقاد کے خیالات سے چل جاتا ہے جو اس دور میں سب پر حاوی رہا۔ روس کا پہلا نقاد وینے ویتوف (۱۸۰۵ - ۱۸۲۷) خود ایک شاعر تھا جس کی قبل از وقت موت نے روسی ادب کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد نچرزون (۱۸۰۴ - ۱۸۵۶) ایک عالم اور فلسفی نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور پولیبوئی (۱۷۹۷ - ۱۸۴۶) نے ۱۸۳۰ میں ایک اخبار جاری کر کے جو ریاست کے اثر سے بالکل آزاد تھا ، اس نے واسے نقادوں کے لیے میدان تیار کر دیا۔ روسی ادیبوں پر

جس نقطہ نظر سے تنقید کی جاتی رہی وہ بھی سب سے پہلے دینے دیوتوف کے
منصامین میں ملتا ہو، یعنی اس نے بہترین یورپی شاعروں کے کلام کو سامنے
رکھ کر لشکین پر یہ اعتراض کیا کہ اس کا کلام ان بلند خیالات اور حوصلہ پیدا
کرنے والی صفتوں سے خالی ہے جو ایک بچے قومی شاعر میں ہونا چاہئیں۔
نجیر دن اور پولیو دے بھی دینے دیوتوف کی طرح یورپی شاعری کا گہرا
مطالعہ کر چکے تھے اور چاہے اپنے زمانے کے ادیبوں کے متعلق ان کی رائے
صحیح نہ ہو، انھوں نے روسیوں کے سامنے ایک معیار رکھ دیا جو ادیبوں
اور ان کے قدر دانوں کو بھٹکنے سے کچھ نہ کچھ روکتا ضرور تھا۔ ۱۸۴۰ء
سے ۱۸۴۸ء تک روسی تنقید کی باگ ڈور بیے لن سکی کے ہاتھ میں رہی،
پھر ۱۸۴۳ء تک چرنی شفت سکی اور دوبرولیوٹوف، جو منکریت کی طرف
مائل تھے اس کی رہبری کرتے رہے، ان کے بعد پانچ سال تک پٹار
کا دور دورہ رہا اور پھر صدی کے آخر تک میخائلوف سکی کے خیالات کا
رنگ تنقید پر چڑھا رہا۔

بیے لن سکی روس کا ایک دور افتادہ صوبے میں پیدا ہوا مگر اس کے
باپ کے دل میں تعلیم کی اتنی قدر تھی کہ مغلسی کے باوجود بیے لن سکی کو بہت
اچھی تعلیم دلائی۔ ۱۸۳۲ء میں بیے لن سکی پیز برگ کی یونیورسٹی سے ایک اشتعال
انگیر ڈراما لکھنے کی بنا پر نکال دیا گیا اور چونکہ اسے انشا پردازی کا شوق
تھا، اس نے اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے روس
میں اس وقت جرمن فلسفے کا بڑا چرچا تھا اور بیے لن سکی کے ابتدائی زمانے

کے معنابن اسی کے رنگ میں ڈوبے تھے۔ لیکن گوگول کی تصانیف پڑھنے سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر فلسفے کی جگہ زندگی اس کا معیار بن گیا۔ اس معیار نے اسے نومیٹن انشا پردازوں کا قبلہ بنا دیا اور اس طرح بیہ لن سکی نے ادب ادا دیوں دونوں کی بڑی خدمت کی۔ ۱۸۳۶ء سے مرتے دم تک وہ روس کی ادبی دنیا کا بادشاہ مانا جاتا تھا، اور وہ مفاتیح جن کی بدولت وہ حکمرانی کرتا تھا واقعی بڑی شان کے ہوتے تھے اور ان سے وہ خلوص اور ہمدردی بکیتی تھی جو اصلاح بھی کرتی ہی اور بناتی بھی ہے۔

چرنی شف سکی (۱۸۲۸-۱۸۸۹) کی زندگی کا مرکز ادب اور آرٹ کے بچے معیار کی جستجو تھی اور اسی کی تلاش میں وہ عقلیت اور اشتراکیت کا معتقد ہو گیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم ختم کرنے کے چند سال بعد ہی اس نے تین چار کتابیں لکھیں جن میں تنقید کے معیار پر بحث کی گئی تھی اور جمالیات کا ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے خیالات کا چرچا اسی وقت سے ہوا جب اس نے ۱۸۵۸ء میں ”ہم عصر“ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ ”ہم عصر“ کا ہرٹسن کے اخبار ”گھنٹی“ سے کچھ کم اثر نہیں تھا اور اس کی قدر اس وجہ سے اور بھی کی جاتی تھی کہ اس میں ادب پر بہت اچھے مضمون نکلتے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں چرنی شف سکی قید کر دیا گیا اور قید خانے میں اس نے ایک کتاب ”اب کیا کرنا ہو“ کے عنوان سے لکھی جو روسی نوجوانوں کو اس کا آخری پیغام تھا۔ ادب میں اس تصنیف کا کوئی خاص مرتبہ نہیں، لیکن نوجوانوں کو ایسی ہی کتاب کی ضرورت

تھی اور اسے نوجوانوں میں ایک عرصے تک ایک الہامی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ اس اعتبار سے یہ تصنیف دس کے بہترین ادبی کارناموں سے بازی لے گئی۔

”اب کیا کرنا ہے“ میں چرنی شغسکی نے ناول کے پیرائے میں اپنے سیاسی و سماجی عقیدے بیان کیے، فرانسیسی اشتراکی فوری اے کے دل فریب خوابوں کی تعبیر کی، اور ایک بچے منکر کا خاکہ کھینچا۔ یہ گویا اس کی اپنی تعلیم تھی، نفاذ کی حیثیت سے جن اصولوں پر وہ چلا وہ اس نے اپنی تصانیف میں سے ایک میں بیان کیے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ادیب اور آرٹسٹ کی دلی آرزو ہونا چاہیے کہ زندگی کے مسائل کو سمجھے اور سمجھائے اور اپنے فن کے ذریعے لوگوں کو بہتر زندگی کا گرویدہ کرے۔ چرنی شغسکی کی نظر میں وہ تصانیف کوئی قدر نہیں رکھتی تھیں جن میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح مغمر نہ ہو۔ دو برو لیو بوٹ (۱۸۳۶) ۱۸۶۱ اور پبارف عقیدے کے لحاظ سے چرنی شغسکی کے ہم خیال تھے لیکن دو برو لیو بوٹ یہ نہیں مانتا تھا کہ آرٹسٹ کو ماحول کی ضروریات کا اس قدر پابند کیا جاسکتا ہے جتنا کہ عالم یا مدبر کو، کیوں کہ آرٹسٹ کی تخلیقی قوت کو عمل میں آنے کے لیے آزادی چاہیے۔ پبارف (۱۸۴۰) ۱۸۶۸ کو اخلاقیات سے زیادہ دلچسپی تھی اور اس کا اثر اس کے خیالات سے زیادہ اس کی شخصیت کی وجہ سے ہوا۔ پبارف کے دل میں آرٹ کی کوئی خاص قدر نہیں تھی، وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کو ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو

حقیقت کو مضبوط پکڑ سکتے ہوں مگر بہتر دنیا کے خواب بھی دیکھتے رہیں۔ اگر آرٹسٹ ہوں تو گوتے جیسے ہوں، نہیں تو نہ ہوں۔

پیارن کے بعد صدی کے آخر تک میخانوفسکی کا دور دورہ رہا
میخانوفسکی کو زیادہ شوق فلسفے سے تھا اور اس زمانے کی تنقید زیادہ
تر فلسفیانہ عقائد کے ماتحت رہی۔ فلسفے کا یہ نیا شوق ترقی کی علامت
نہیں تھی بلکہ اس مایوسی کا عکس تھا جو منکریت کے زوال کے ساتھ
پھیلتی گئی اور جس کے کالے بادلوں اور جس کو انقلاب کی طوفانی ہواؤں
نے آکر دور کیا۔ اس زمانے میں، جب کہ خاص انقلابی فرقوں کے سوا
سب بہتر زندگی کے اصولوں کو چھوڑ چکے تھے، بعض نقاد، جن میں مرژ
کوفسکی (۱۸۶۶ء) سب سے ممتاز ہے، روس کے ادبی مشاہیر کا مطالعہ
کر کے ان کو پورے طور پر سمجھنے اور ان کے خیالات کی صحیح تشریح کرنے کی
طرف متوجہ ہوئے اور اس اعتبار سے مرژ کوفسکی نے ایک نیا معیار
پیش کیا جس میں ادب کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔ لیکن تنقید کے اس اصول
نے زیادہ رواج نہیں پایا۔

روسی ناول

پہلا باب

نکولائی وکیل یوچ گوگول (۱۸۰۹-۱۸۵۵)

روسی انشا پرداز سی کی پہلی کوششوں کا ذکر ایک گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ گوگول کی تصانیف میں روسی ناول اور ڈراما پہلی مرتبہ اپنی مخصوص اور دلفریب شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت تک روسی ادیب یورپی مذاق کی پیروی کرتے رہے تھے، گوگول نے ہمت سے کام لے کر اپنی بات اپنے انداز سے کہی اور تعلیم یافتہ روسیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے زمانے میں رومانیت کا اثر زائل نہیں ہوا تھا، لیکن کے قہقہے اور اکثر نظمیں اسی رنگ میں لگی ہوئی تھیں، اس کی ایک جھلک فورگنیف کے افسانوں میں بھی ملتی ہے، لیکن گوگول کے افسانوں میں اس کی بوجھ نہیں۔ تربیت اور مذاق کے اعتبار سے وہ ٹھیکہ دہی آدمی تھا اور بعد کی زندگی بھی اس کی طبیعت کو بدل نہ سکی۔ وہ صوبہ اوکرائن کے ایک گائوں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کو سک نسل کا ایک چھوٹا زمیندار تھا، اور اس کا بچپن ایک ایسی فضا میں گزرا جس پر پرائی کو سک

وضع اور فلسفہ زندگی کا اثر اس وقت تک نمایاں تھا۔ گولگول کی ذہنیت اس دیہاتی کی سی تھی جو شہری زندگی کی نفاستوں سے مرعوب نہیں ہوتا، اسکول اور کالج میں اس کی آزاد خود مختار اور مغرور طبیعت نے اس کی تعلیم میں بہت خلل ڈالا۔ اکثر مضمون جو پڑھائے جاتے تھے اسے ناپسند تھے یونانی اور رومن ادب کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور جرمن اور فرانسیسی انشا پردازی کی بھی اس کے دل میں زیادہ عزت نہیں تھی اس لیے اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، عام معیار کے لحاظ سے اس کی تعلیم خراب رہی، لیکن اس خرابی کا نتیجہ اچھا نکلا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ناولیں، افسانے اور ڈرامے لکھنا شروع کر دیے۔ اور یہ مشق آگے چل کر بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر پیربرگ پہنچا اور وہاں اُسے وزیر زراعت کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ لیکن اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایک طریقے پر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ دو سال کے اندر اس نے ملازمت ترک کر دی اور یورپ کا سفر کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا، مگر آدھے راستے سے واپس آگیا۔ اس کی تعلیم کی طرح اُس کے اس سفر کا نامکمل رہ جانا بھی اس کی ذہنی آزادی کی علامت تھی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا کیونکہ اگر وہ یورپ جا تو ممکن ہے اپنے خلقی ذوق اور آزادی کو وہیں چھوڑ آتا۔ سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے انشا پردازی کا شغل اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا اور ۱۸۳۱ میں اس کی پہلی کامیاب تصنیف شائع ہوئی جس کا عنوان

”جکائیکا کے قریب ایک باڑی میں سنی ہوئی کہانیاں“ تھا۔ افسانوں کے اس مجموعے نے گوگول کو مشہور کر دیا، کیونکہ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جنہیں نے گوگول کو روسی ادب میں اس کے بلند درجے پر پہنچا دیا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، ان افسانوں میں دیہاتی زندگی کے قہقہے سنائے گئے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک جدت تھی، مگر ان افسانوں کے اور اوصاف کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ صفت معلوم ہوتی ہے۔ گوگول نے ادکرائن کے مناظر قدرت کی نہایت دل کش تصویریں کھینچی ہیں، اسے زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اس کی باریک بین نظر اس کا نازک احساس اور اس کی ہر ذرہ بھری ظرافت اپنا پورا کمال دکھا سکی۔ اس کے افسانوں میں مافوق الفطرت قوتوں کا اکثر ذکر آتا ہے، ان میں بھوت پریت، پڑلیں اور شیطان بے تکلفی سے انسانی زندگی میں شریک ہوتے ہوئے اور مداخلت کرتے دکھائے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا رہنا سہنا اور فلسفہ زندگی بیان کیا گیا ہے، وہ ان سب چیزوں کو مانتے تھے اور اس عقیدے کو ان کے کردار سے بہت گہرا تعلق تھا اس لیے دراصل بھوت پریت کے ذکر سے افسانوں کی حقیقت نگاری پر حرف نہیں آتا۔ گوگول کی طبیعت میں دیہاتی فضا اور دیہاتی لوگوں کی سہشت کے ہر رنگ اور ہر کیفیت کے سمجھنے کی وجدانی قوت تھی، اس کی زبان کی شستگی، شیرینی اور روانی پڑھنے والے کے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔

”ادکرائن کی رات دیکھیے۔ بیچ آسمان سے چاند زمین کو تباہ رہا ہے۔“

آسمان کا گنبد جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں، معلوم ہوتا ہے پھیل کر اور وسیع ہو گیا ہے، اور اب گرم ہے اور سانسیں بھر رہا ہے۔ ساری زمین پر سمیں روشنی جھلکی ہوئی ہے؛ پڑتا نیر ہوا میں خنکی ہے، وہ آدمی کو گلے مل کر بھیجتی ہے، اس کی رفتار متوالی ہے اور خوشبوؤں کے سمندر کو جنبش دیتی ہے۔ جانفزارات! مسحر کن رات! جنگل کسی روحانی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ساکت کھڑے ہیں، اندھیرے میں پٹے ہیں اور اپنے سائے سے دور دور تک اندھیرا پھیلا رہے ہیں، تالاب خاموش اور ساکن ہیں، ان کی سطح پر ایک لہر تک نہیں، ان کے پانی کی ٹھنڈک اور تاریکی باغوں کی سیاہی مائل سبز دیواروں میں قید ہے اور قید ہونے سے کچھ اُداس ہو گئی ہے، جنگلی پھلوں کی گھسنی بھاڑیاں جن میں کسی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ہے ڈرتی ڈرتی اپنی جڑوں کو چسٹے کے ٹھنڈے دھارے کی طرف پھیلاتی ہیں اور ان کی پتیاں چپکے سے کچھکتی ہیں، ایسے لمبے میں جس سے ناراضگی اور خفگی ظاہر ہوتی ہے، جب رات کی ہوا کا کوئی شریر جھونکا آہستہ آہستہ آتا ہے اور آنکھ بچا کر ان کا پوسہ لے لیتا ہے۔ ساری زمین پر قنبد طاری ہے، مگر آسمان پر چاند اور تارے سب آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں اور اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ انسان کی روح میں اس وقت عجیب وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی ہر ہر ہا چاندی کی طرح چمکتے ہوئے خیالی پیکر نکل کر دنیا کو آباد کر دیتے ہیں۔ جانفزارات! مسحر کن رات! ایکبارگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور جنگل اور تالاب اور میدان سب جاگ اُٹھتے ہیں، ہر طرف سے اُکرائشی بیلوں کے نغموں کی

کی ہر اہی کے لیے کس طرح سے منتخب ہوا، اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف کیونکر حاصل ہوا۔ کھیا کو کبھی کبھی بہرائچے میں مرا آتا ہے، خصوصاً جب اسے ایسی باتیں سنائی جاتی ہیں جنہیں وہ سنا نہیں چاہتا ہے۔ کھیا لباس میں کسی قسم کا بالکلین برداشت نہیں کر سکتا..... کھیا رنڈوا ہے، مگر اس کے گھر میں اس کی سالی رہتی ہے، جس کا کام دونوں قوت کھانا پکانا، بنچیں دھونا، مکان پر سفیدی کرنا، کپڑوں کے بے سوت کاتنا اور گھر گستی کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ گانڈو میں مشہور ہے کہ کھیا سے اس کی کوئی عزیز داری نہیں، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ کھیا کے بہت سے بدخواہ ہیں، جو ہر قسم کی افواہ خوشی سے پھیلانے پر تیار رہتے ہیں..... یہ بھی ممکن ہے لوگوں کو بات بنانے کا موقع اس وجہ سے ملا ہو کہ کھیا کی سالی کو مہذبہ بُرا لگتا ہے۔ اگر کھیا کسی ایسے کھیت میں چلا جاتا ہے جہاں گانڈو کی عورتیں کام کرتی ہیں، یا ایسے کوسک سے ملنے جلنے جاتا ہے جس کے گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے۔ کھیا کا ناہی، مگر اس کی اکیلی آنکھ۔ بڑی شریر ہے اور دور سے خوبصورت عورت کو پہچان لیتی ہے۔ ہاں، مگر وہ خوبصورت چہرے کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اچھی طرح ادھر ادھر دیکھ لیتا ہے، کہ کہیں اس کی سالی کی نظر تو اس پر نہیں پڑ رہی ہے.....

شراب ساز کھیا کے یہاں مہمان آیا ہے۔ ایک ٹھنگنا، موٹا سا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت مہنتی رہتی ہیں، غالباً اس خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے جو اسے اپنا چھوٹا سا پائپ پینے میں ہوتی ہے۔ وہ ہر

وقت تھوکتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی انگلی سے پائپ میں تباکو کی راکھ دباتا جاتا ہے۔ دھوئیں کے بادل اس کے منہ اور اس کے پائپ سے نکل کر ہر طرف چھا گئے ہیں اور خود اسے بھی سُرمئی رنگ کے کہرے نے لپیٹ لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی شراب کے کارخانے کا دود دان جو جھپٹے پر بیٹھے ٹھک گیا ہے، سیر کے شوق میں نکلا ہے اور کھیا کے گھر میں آکر ادب سے نیز کے پاس بیٹھ گیا ہے، شراب ساز کی ناک کے نیچے اس کی گھنی اور چھوٹی مونچھیں ہیں، جن کے سارے بال کھڑے ہیں، لیکن پائپ کے دھوئیں میں وہ بہتا دھندلی نظر آ رہی ہے اور خیال ہوتا ہے وہ مونچھیں نہیں ہیں بلکہ ایک چوہا جسے شراب ساز منہ میں دبائے ہوئے ہے۔۔۔۔۔“

”بازمی میں سنی ہوئی کہانیوں“ کے بعد ہی گوگول نے ایک مجموعہ ”میر گور دو“ کے عنوان سے شائع کیا۔ میر گور و و نام ہی پولتاوا کے پاس ایک گاؤ کا جس میں گوگول پیدا ہوا تھا، اس مجموعے میں گوگول کی انشا پر دازی کی خوبیاں اور نکھر آئیں اور اس میں ظرافت کے ساتھ درد ہی جو پہلے مجموعے میں نہیں پایا جاتا۔ ایک آنکھ سے ہنسا، ایک سے رونا، گوگول کی انشا پر دازی اور حقیقت نگاری کا خاص وصف ہے اور اس مجموعے میں یہ وصف اپنی پوری شان سے نظر آتا ہے۔ لیکن گوگول کی طبیعت نہ معلوم کس درجے سے ناول نویسی سے ہٹ گئی اور اس نے روس کو چاکلے کی تاریخ لکھنے کا ارادہ لے لے روس کا جنوب مغربی حصہ جس میں ”چھوٹے“ روسیوں کی نسل آباد ہے ”چھوٹے“ اور ”بڑے“ روسیوں میں مذکر علاوہ سیرت اور مزاج کا بھی کچھ فرق ہے ”چھوٹا“ روسی فطرتاً ہی کچھ ہوتا ہے ”بڑا“ روسی غلیظ اور باس مشرب۔

کر کے قدیم کتابوں اور تاریخی داستانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اس میں مورخ بننے کی صلاحیت بہت کم تھی اور اس کے مطالعے کا پہلا نتیجہ ”تراس بلبا“ ایک تاریخی ناول کی صورت میں نکلا۔ ناول کی تاریخی بنیاد بہت کمزور ہے، کبھی کبھی مصنف بھول جاتا ہے کہ اسے زیر بحث زمانے کے ذہنی معیار کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اس لیے بعض تقریریں جو ناول کے انتخاب کرتے ہیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں، مگر زرمید داستان کی حیثیت سے ناول ہنایت قابل قدر ہے اور کوسک نسل کی مردانگی، بہادری، جفاکشی اور سادگی کی جو تصویریں لکھنی گئی ہیں بہت ہی ہمت افزا اور سبق آموز ہیں۔ ایک پوڑے باب کا اپنے میٹوں کی طاقت آزمائی کے لیے ان سے کشتی لڑنا، اس کے ایک لڑکے کا شائستگی اور نفاست پسندی کی تحقیر کرنے کے لیے بہت اچھے کپڑے پہن کر زمین میں لوٹنا، اس ماں کے دل کی کیفیت جو اپنے بچوں کی ہمت و جواں مردی پر فخر کرتی ہے مگر دل سے خوف اور اندیشہ۔ نہیں نکال سکتی ہے یہ سب پہلے صفحوں ہی میں بیان کیا گیا ہے اور سارے ناول میں یہ نضا قائم رہتی ہے۔ ”تراس بلبا“ کی تصنیف کے بعد گوگول کا تاریخی مطالعہ کچھ دن جاری رہا، مگر دس کوچک کی تاریخ محض خیال ہی کی صورت میں رہی چند مضامین کی بنا پر جو بظاہر بہت عالمانہ تھے گوگول کو تاریخ کے پروفیسر کی جگہ مل گئی، مگر اس کے علم کا سارا سرمایہ پہلے لکچر میں ختم ہو گیا اور تقریر کے ڈیڑھ سال بعد اسے مجبوراً استعفا دینا پڑا۔

اس کے بعد پھر گوگول نے عالم فاضل سمجھے جانے کی ہوس بندیر کر

اور ناول نویسی میں مشغول ہو گیا۔ دو تین سال کے اندر اس نے ”محل کاریوں“ اور کہانیوں کے عنوان سے افسانوں کا تیسرا مجموعہ شایع کیا جس کے بہترین قصبے ”پُرانی وضع کے زمیندار“ ”ادان اوان کی لڑائی“ ”نفسکی پر ویکٹا“ اور ”لبادہ“ ہیں۔

”پُرانی وضع کے زمیندار“ ایک بڑے اور بڑھیا افسانسی فی اوانچ اور پلخیر یا اوانوفا کی کہانی ہے۔ دونوں چین سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے اور ساری دنیا سے خوش تھے۔ لیکن اگر زندگی کے معنی حرکت اور تغیر ہیں تو وہ دونوں جوانی میں بھی ”زندگی“ کی نعمت سے محروم تھے۔ گو گول کو ان سے بہت محبت ہے۔ ان کے سفید بالوں سے اور ان کے معصوم دلوں سے مکران کی تصویر کھینچنے میں اس کا اصل مقصد روسیوں کی ذہنی بے مانگی اور ان کی زندگی کا جمود دکھانا ہے اور اسی لحاظ سے یہ افسانہ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ افسانسی اوانچ دن بھر کھاتے رہتے ہیں، ان کی بیوی پلخیر یا اوانوفا کا دن میٹھے اجار اور مرے تیار کرنے گزرتا ہے، گفتگو بھی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے البتہ ”کبھی کبھی آسمان صاف، دن اُجالا اور کمرے خوب گرم ہوتے تو افسانسی اوانوفا کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور وہ پلخیر یا اوانوفا کو چھیڑتے ہیں۔۔۔۔“

”پلخیر یا اوانوفا، اگر ہمارے گھر میں ایک بارگی آگ لگ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

”اے لو۔ خدا نہ کرے! بڑی بی کہتی ہیں اور صلیب کا نشان باقی ہیں۔
 ”پھر بھی، فرض کرو کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تو ہم کہاں
 بھاگ کر جائیں گے؟“

”خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں، افتاسی ادا نو بچ! یہ کیسے ہو سکتا
 ہے کہ ہمارے گھر میں آگ لگ جائے؟ خدا کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا“
 ”پھر بھی اگر سب کچھ جل گیا“

”گھر سب جل جائے تو میں باورچی خانہ میں چلی جاؤں گی اور آپ
 اس کمرے میں جہاں چوکیدارنی رہتی ہے۔“
 ”اگر باورچی خانہ میں آگ لگ گئی اور سب جل گیا“

”لو اور سنو! خدا ہمیں ایسی مصیبت سے بچائے کہ گھر میں آگ
 لگ جائے اور باورچی خانے میں بھی، اگر ایسا ہوا تو ہم گودام میں جا کر
 رہیں گے، جب تک دوسرا مکان نہ بن جائے“
 ”اور اگر گودام میں بھی آگ لگ گئی؟“

”خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں، بس اب میں بہت سن چکی،
 ایسی باتیں کرنا گناہ ہے، ایسی باتوں کی خدا کے یہاں سے سنرا ملتی ہے!“
 افتاسی ادا نو بچ، اس بات سے خوش ہو کر کراؤں نے
 پلنیر یا ادا نو فنا کا مذاق اڑایا ہی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہے۔
 ایسی زندگی کا انجام بھی مناسب ہوا: پلنیر یا ادا نو فنا کی بیٹی
 کھیر گئی، کچھ دنوں کے بعد انھیں اسی طرح کی بیٹی باغ میں دکھائی دی۔

اور وہ اسے چمکار پکار کر گھر ساتھ لائیں اور پیالہ بھر دودھ اُس کے سنے پینے کے لیے رکھ دیا، مگر جیسے ہی اُنھوں نے اس کی پیٹھ سہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا بتلی زن سے کھڑکی سے کود کر نکل بھاگی۔ پلنیر یا اوانو فنا کو یقین ہو گیا کہ دراصل یہ ایک بتلی نہیں تھی بلکہ ان کی موت جو بتلی کی شکل میں آئی تھی، اُنھوں نے گھر کا سب سامان ٹھیک کیا، افسانسی اوانو پوج کے لیے اتنے مرتبے اور اچار تیار کر دیے کہ وہ برسوں تک کھاتے رہیں اور یہ وصیت کی کہ ان کا کفن ملل کا ہو، اس لیے کہ وہ سستا ہی اور اسی کا سا جو دوسرا کپڑا رکھا ہی اس کی افسانسی اوانو پوج کے لیے عبا تیار کرائی جائے۔ یہ وصیت کرنے کے کچھ دنوں بعد وہ مر گئیں۔ افسانسی اوانو پوج چار پانچ سال اور زندہ رہے اور پھر خوشی خوشی اپنی پلنیر یا اوانو فنا سے ملاقات کے لیے چل دیے۔

”ادان اوان کی لڑائی“ عام روسی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ دو اوسط درجے کے زمیندار ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے بگڑ جاتے ہیں، ان میں صلح، کرانے کی بہت کوشش کی جاتی ہے، دونو چاہتے ہیں کہ پھر آپس میں دوستی ہو جائے، مگر عین اس وقت جب وہ پہل گیری کے لیے تیار ہوتے ہیں تو ذرا سی بات پر لڑائی ہو جاتی ہے اور مصافحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

”نفسکئی پراسپیکٹ“ میں گوگول نے روسی شہر کی ایک دروناک داستان سنائی ہے۔ دونو جوان، ایک فوجی افسر اور دوسرا مصور جن کی

آپس میں جان پہچان تھی، پیتربرگ کی مشہور سڑک نفسکئی پراسپکٹ پر چلے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے سے دو عورتیں گزریں، جو ہنایت حسین تھیں، ان میں سے ایک کے بال سیاہ تھے، دوسری کے سنہرے، فوجی افسر نے سنہرے بالوں والی کا پیچھا کیا، مصور نے سیاہ بالوں کا، محض اس ارادے سے کہ اس کے مکان کی شان و شوکت دیکھے، کیوں کہ بظاہر وہ بہت امیر معلوم ہوتی تھی، لیکن وہ ایک معمولی طوائف نکلی، مصور کی بھولی معصوم طبیعت، جس پر اس عورت کے حسن کا بہت اثر ہوا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور چند دنوں میں وہ ایک نازک پھول کی طرح کھلا کر مر گیا۔ جس عورت کے فراق میں فوجی افسر گیا تھا وہ ایک جرمن موجی کی بیوی تھی۔ افسر نے بہت کوشش کی کہ اس سے آشنائی ہو جائے، مگر کامیاب نہ ہوا، اور آخر کار جب جرمن موجی نے اسے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا دیکھا تو اپنے دوست کی مدد سے اسے اٹھا کر دروازے کے باہر پھینک دیا۔ فوجی افسر ایسا بے حیا تھا کہ اس بے عزتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور دوسرے دن وہ اسے بالکل بھول گیا۔

”نفسکئی پراسپکٹ“ گوگول کے عام طرز سے جہاں، مگر اس میں بھی اس کی باریک بینی اور ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ صبح سے شام تک جو مختلف قسم کے لوگ نفسکئی پراسپکٹ پر سے گزرتے ہیں ان کے اوصاف ہنایت مفصل اور دلچسپ طریقے پر دکھائے گئے ہیں، جرمن موجی، جو اپنی ناک کٹوا ڈالنا چاہتا ہی، کیونکہ ناک کی وجہ سے اس کی

ناس لینے کی مادہ پڑ گئی ہو اور ناس خریدنے میں اس کا بہت رد و پس منہ ہوتا ہو، گو گول کے بہترین مضحک کیرکٹروں میں سے ہو۔

اس وقت تک گو گول کے تصور نے جو خیالی پیکر بنائے تھے، وہ روسیوں کے پتے نمونے تھے، لیکن وہ کیرکٹر جس کے ہم شکل روسی نادوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جسے عام رائے نے روسی تمدن کی مخصوص پیداوار قرار دیا ہو پہلی بار گو گول کے افسانے ”بادا دے“ میں اپنی صورت دکھاتا ہو۔ ”بادا دے“ کا ہیرو اکائی اکا کئے وچ ایک مضحک مگر سیدھا سادا اور مسکین آدمی ہو، جسے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ کہہ اٹھتے ہیں: ”دیکھو بچارے غریب کو! اکائی اکا کئے وچ ایک دفتر میں نوکر ہو، جہاں اسے زیادہ تر کاغذات اور خطوط نقل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اس کام سے اس کا جی نہیں گھبراتا، بلکہ اسے اس میں خاص لطف آتا ہو، کیونکہ اسے خوش نویسی کا شوق ہو اور اس کام میں اسے خوش نویسی کا بہت موقع ملتا ہو۔ خطوط اور کاغذات نقل کرنے کا کام اس کے لیے پُر لطف اور رنگارنگ احساسات کا ایک عالم تھا۔ ایک خاص قسم کے خط اسے بہت ہی پسند تھے۔ اگر انھیں دوبارہ لکھنا ہوتا تو اسے دلی مسرت ہوتی۔ لیکن ”شوق“ اور ”لطف“ کے الفاظ اکائی اکا کئے وچ کے صحیح جذبات ادا نہیں کر سکتے، اسے اپنے کام سے حقیقی عشق ہو، اس کی ساری امیدیں ارمان اور تمنائیں اسی سے وابستہ ہیں، زندگی کا کوئی مزہ نہیں جو اسے اس کام میں حاصل نہ ہوتا ہو۔ لیکن اکائی اکا کئے وچ کا جسم ذرا کمزور ہو،

جاڑوں میں اسے سردی بہت لگتی ہے، اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک لبادہ خریدے اور رفتہ رفتہ خطاط ہونے کے علاوہ ایک نئے لبادے کا مالک بننا بھی اس کی دلی آرزوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ کئی سال تک تھوڑا تھوڑا روپیہ اکٹھا کر کے وہ آخر کار ایک نیا لبادہ خریدتا ہے، مگر آسمان کا ظلم دیکھیے کہ اکائی اکائی روپے کا لبادہ پہلے ہی دن چوری جاتا ہے۔ اس کا دل ایسا سخت صدمہ برداشت نہیں کر سکتا، وہ بے چارہ مر جاتا ہے، اور بھوت بن کر شہر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔

عموماً دنیا اکائی روپے بچے بچارے غریبوں پر ہنستی ہے اور اس کی ہنسی حقارت بھری ہوتی ہے، روسی حقیقت نگار اپنی قوم کے نمونوں کی صورت اور سیرت کے تمام پہلو کمال وضاحت اور ہار یک بینی سے دکھاتے ہیں، مگر اپنے تعصبات اور رجحانات کو اس طرح سے معطل کر دیتے ہیں کہ ان کی صورت گری میں حقیقت کا منظر دکھانے کے سوا اور کوئی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں ہوتا، ہم ان کے کیر کڑوں کو ان کی نظر سے نہیں، اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہمارے دلوں پر وہ اثر نہیں ہوتا جو حقیقت نگار پیدا کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جو خود بخود پیدا ہوتا، اگر ہم ایسی ہستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اکائی روپے بچے لوگوں سے ہمیں پہلے الجھن ہوتی ہے، پھر ان پر غصہ آتا ہے اور آخر کار اگر ہم کو انسانی مہر دہی چھو بھی گئی ہے، تو ہم کو ان پر ترس آتا ہے اور دل محبت کے درد سے بھر آتا ہے گو گول کی بحیثیت انسان کے یہی کیفیت تھی، لیکن بحیثیت آرٹسٹ اور مصور کے اس نے

بچارے اکا کئے وچ پر رحم کھا کر یا اس سے خفا ہو کر کسی قسم کا مبالغہ یا غلط بیانی جائز نہیں رکھی۔ وہ ایک آنکھ سے اکا کئے وچ پر ہنستا ہی، اس لیے کہ اکا کیے وچ کے مضحک ہونے میں کوئی شک نہیں اور ایک آنکھ سے روتا ہی، اس لیے کہ اکا کئے وچ بھی انسان ہی اور ہمدردی کا مستحق۔ جذبات کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر اس طرح روکنا خواہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہو، حقیقت نگاری کا تقاضا تھا کہ اکا کئے وچ جیسے لوگ ہرگز نظر انداز نہ کیے جائیں۔ روس میں اکا کئے وچ جیسے بیچاروں کے وجود کا سب نے گوگول کا افسانہ پڑھتے ہی اعتراف کیا، بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روس کے اکثر باشندوں میں اکا کئے وچ کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہو چنانچہ افسانہ پڑھ کر گوگول کے معاصرین میں سے کسی نے لکھا: ”ہم سب گوگول کے ”بچارے“ سے نکلے ہیں۔“ جس کے معنی یہ تھے کہ ہر روشن خیال روسی ”بچارے“ اکا کئے وچ سے مشابہت محسوس کرتا تھا، بے کسی نے اسے بھی اکا کئے وچ کی طرح مضحک اور مسکین اور قابلِ رحم بنا دیا تھا اور تقویٰ اس کے اور اس کی تنائوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرتی تھی، جیسا اس نے اکا کئے وچ کے ساتھ کیا۔

”گل کاریوں اور کہانیوں“ کے بعد گوگول نے دو ڈرامے لکھے ”ایپیکٹر جنرل“ اور ”شادی“۔ ان میں مضحک کیرکٹروں کی کوئی انتہا نہیں، لیکن ان میں بھی وہی لاشخصی انداز نمایاں ہو جو گوگول نے اکا کئے وچ کی صورت گیری میں اختیار کیا تھا اور ان موقعوں پر بھی جب گوگول ہمیں ہنسی سے

بے چین کر دیتا ہے، انسانی ہمدردی آنسوؤں یا آہوں کی شکل میں اپنا خراج وصول کر لیتی ہے۔ انسپکٹر جنرل "کے کیرکٹر مضحک ہونے کے علاوہ منفرد اور بددیانت بھی ہیں اور گولڈ نے ڈراما محض ان کا مذاق اڑانے کے لیے نہیں بلکہ اس غرض سے بھی لکھا تھا کہ قوم سرکاری ملازموں کی رشوت خوری اور بے ایمانیوں سے آگاہ ہو، مگر مصور کے کمال نے مصلح کے خیالات پر بالکل پردہ ڈال دیا اور ریاست کی بد نظمی پر خفا ہونے کے بجائے ہم کو ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی پر ترس آتا ہے جو فطراناً ایک خاص طرح کا چال چلن اختیار کرنے پر مجبور ہیں اور اپنی صفائی کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ بالکل مسخرے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک شہر کے سرکاری عہدہ داروں کو پتہ لگتا ہے کہ دارا سلطنت سے ایک خاص افسران کا کام جانچنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے، کیونکہ ان لوگوں کی مرکزی حکومت تک بہت سی شکایتیں پہنچی ہیں۔ شہر کے تمام عہدہ دار یہ خبر سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے، سب بڑے رشوت خور ہیں اور تمام شہر والے ان کی حرکتوں سے بہت نالاں ہیں، اس لیے سب کو یقین ہے کہ اگر واقعی انسپکٹر جنرل بھیجا گیا تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئے گا اور بدحواسی میں وہ ایک آوارہ نوجوان کو جو اتفاق سے شہر کے ایک ادنیٰ ہوٹل میں آکر ٹھہرا ہی انسپکٹر جنرل سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نوجوان جسے روپے کی سخت ضرورت تھا

تقدیر کے اس کھیل سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور خوب دعوتیں کھا کر اور روپیہ وصول کر کے اپنا رستہ لیتا ہے۔ آخر میں ان سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان انسپکٹر جنرل نہیں تھا، کوئی معری لنگٹکا تھا اور اسی وقت کوئی سپاہی آکر اطلاع دیتا ہے کہ انسپکٹر جنرل آیا ہی در اس نے سب کو طلب کیا ہے۔

جلی انسپکٹر جنرل کے آنے کا منظر نہایت دلچسپ ہے۔ صدر مینوسپلی کو خبر ہوتی ہے کہ دارالسلطنت سے ایک بڑا افسر آنے والا ہے وہ تمام بڑے عہدے داروں کو بلا بھیجتا ہے اور انہیں یہ خبر سنا دیتا ہے۔ سب کے سب بہت پریشان ہوتے ہیں، مگر چونکہ سب پر یکساں گرفت ہو سکتی ہے، اس لیے ایک دوسرے کو تنبیہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ صدر مینوسپلی ہچکچا کر منصف سے کہتا ہے:-

”آپ کی کچہری کے برآمدے میں، جہاں لوگ عموماً عرضیاں لے کر آتے ہیں، اردلیوں نے بطخوں کے نیچے پال رکھے ہیں، جو ادھر ادھر بھلگے پھرتے ہیں اور پیروں تلے آجاتے ہیں۔ گھر گرتی کرنا ہر شخص کے لیے قابلِ تعریف بات ہے تو اردلیوں کے لیے کیوں نہ ہو، مگر بھئی ایسی جگہ پر تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا.....“

منصف فوراً جواب دیتا ہے:-

”میں ان سب کو آج ہی باورچی خانے پر لٹ بھجاتا ہوں، آپ کا جی چاہے تو آج میرے یہاں کھانا کھائیے۔“

صدر مینوسپلی چند اور بے قاعدگیوں کی طرف توجہ دلا کر کہتا ہے:-

”..... اسی طرح آپ کا اسیسر..... یوں تو وہ آدمی خاصا ہوشیار ہے، مگر اس کے منہ سے ایسی بڑا آتی ہے، معلوم ہوتا ہے، سیدھا کسی شراب کے کارخانے سے آرہا ہے۔ یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں..... اگر یہ بدبودار آدمی کوئی پیدائشی مرض ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، تو اسے سمجھائیے، پیاز یا لہسن یا کوئی اور دوا کھائے.....“

لیکن اس معاملے میں منصف کا بس نہیں چل سکتا:-

”نہیں، اب یہ بدبو نہیں مٹ سکتی، وہ کہتا ہے بچپن میں اس کی دای کے چوٹ لگ گئی تھی اور تب سے اس کے منہ سے کچھ وودکا کی بو آنے لگی ہے“

اس ناکامی سے صدر میونسپلٹی کی اصلاحی کوششوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، وہ تمام افسروں کو فلسفیانہ طرز پر ان کی خاص کم زوری سے آگاہ کرتا ہے:-

”..... عجیب بات ہے، ایسا کوئی آدمی ہی نہیں، جس کے سر کوئی گناہ نہ ہو، خدا ہی نے دنیا کو ایسا بنایا ہے.....“

منصف سمجھتا ہے کہ اس کی رشوت خوری کی طرف اشارہ ہے اور بگڑ کر کہتا ہے کہ گناہ گناہ میں فرق ہے، ”میں سب سے کھلم کھلا کہتا ہوں کہ میں رشوت لیتا ہوں، مگر کیسی رشوت؟ شکاری کتے کے بچے یہ کچھ اور ہی چیز ہے“

پھر صدر میونسپلٹی ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جن کے ماتحت

اسکول اور اوقاف اور خیرات خانے ہیں۔

”.... آپ کو استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیے،

وہ بڑے لائق لوگ ہیں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

مگر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، جو ممکن ہی علم و فضل کے ساتھ لادری

ہوں۔ مثلاً استادوں میں سے ایک جس کا چہرہ کچھ پھولا سا ہی... کبھی

اپنی کرسی پر بیٹھ ہی نہیں سکتا، البتہ اس طرح (منہ بنا کر) منہ بنائے ہوئے

اور پھر چلق کے پاس ہاتھ لے جا کر اپنی ڈاڑھی کو انگلیوں سے باہر کی

طرف پھینکتا ہے۔ اگر وہ صرف طالب علموں کا اس طرح منہ چڑھاتے تو

کوئی بات نہیں.... لیکن آپ خود غور کیجیے، اگر وہ کسی شخص کا جو

اسکول کا معائنہ کرنے آیا ہو اس طرح منہ چڑھاتے تو اس کا نتیجہ بہت

بڑا ہو سکتا ہے؛ ممکن ہی انسپکٹر جنرل یا کوئی اور اس بات کو اپنی رپورٹ

میں درج کر دے۔ خدا جانے پھر اس کا کیا انجام ہو.... مجھے آپ کو

استاد تاریخ کی طرف بھی توجہ دلانا ہے.... میں نے ایک مرتبہ ان کا

لکچر سنا تھا.... جب انھوں نے اسکندر اعظم کا ذکر شروع کیا تو خدا

جانے انھیں کیا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر ایک کرسی

اٹھائی اور پوری طاقت سے اسے زمین پر دے مارا۔ میں نے مانا

اسکندر اعظم بڑا بہادر تھا، مگر آخر کرسیاں کیوں توڑی جائیں؟ اس سے

تو خزانے کا نقصان ہوتا ہے....“

اس مجمع میں پوسٹ ماسٹر بھی شریک ہو جاتا ہے۔ صدر میونسپلٹی

الگ لے جا کر اس سے کہتا ہے کہ فی الحال تمام خط کھول کر دیکھ لیا کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت ڈاک کے ذریعے سے دارالسلطنت نہ بھیجی جاسکے۔ پوسٹ ماسٹر جواب دیتا ہے کہ اسے یہ باتیں سکھانے کی ضرورت نہیں، اسے خود خط پڑھنے کا بہت شوق ہے، اور اگر کوئی خط اسے خاص طور سے پسند آتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بار بار بار پڑھا کرتا ہے..... یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دو حضرات جن کا کام شہر بھر میں خبریں سننا اور سنانا ہے دوڑے ہوئے آتے ہیں، اور خبر دیتے ہیں کہ انھیں فلاں ہوٹل میں ایک آدمی نظر آیا ہے، جو دارالسلطنت سے آیا ہے اور انسپکٹر جنرل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔

صدر مینوسپلٹی فوراً ہوٹل پہنچتا ہے۔ نوجوان لفنگے کی پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ کس غلط فہمی میں ہیں تو انھیں اچھی طرح سے ٹوٹتا ہے۔ آخر کار پوسٹ ماسٹر اس کا ایک خط کھول لیتا ہے، جو اس نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور جس میں شہر کے تمام مشاہیر کو خوب گالیاں دی ہیں اور ان پر بھتیائیں کی ہیں۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب نے دھوکا کھایا ہے، مگر اس وقت تک چڑیا اڑ جاتی ہے۔

گوگول کا دوسرا ڈراما "شادی" بھی اسی طرح مضحک سیرتوں کا عجائب خانہ ہے۔ اس کا ہیرو پود کو لین، ایک کھاتا پیتا آدمی ہے جو شادی کرنا چاہتا ہے، مگر ایسا جیسو ہے کہ خود کسی لڑکی سے دوستی کر کے

اس سے شادی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایک مشاطہ اس کا ایک لڑکی سے نکاح کرانے کا وعدہ کرتی ہے اور پود کو لیں کپڑے وغیرہ تیار کرنے لگتا ہے۔ اس کی کیفیت پہلے منظر میں ظاہر ہو جاتی ہے، جب وہ اپنے نوکر کو بار بار بلا کر اس سے چرج کرتا ہے:-

”دورزی کے یہاں گیا تھا؟“

”گیا تھا۔“

”تو کیا ہوا، وہ فراک کوٹ سی رہا ہے؟“

”سی رہا ہے۔“

”ہست ساسی چکا ہے؟“

”ہاں کافی سی لیا ہے، کاج بنانے شروع کر دیے ہیں۔“

”کیا؟“

”میں نے کہا: اُس نے کاج بنانے شروع کر دیے ہیں۔“

”اور اُس نے کہیں یہ تو نہیں پوچھا کہ صاحب کو بھلا فراک کس لیے چاہیے؟“

”ہنیں، ہنیں پوچھا۔“

”ممکن ہے اس نے کہا ہو! صاحب شادی تو نہیں کرنا چاہتے؟“

”ہنیں کچھ نہیں کہا۔“

”... ہاں، مگر کیا اُس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ صاحب اتنی باریک

بانات کا کوٹ کیوں سلوار ہے ہیں؟“

”ہنیں۔“

”اس کا بھی کوئی ذکر نہیں آیا کہ شاید صاحب شادی کرنا چاہتے ہوں؛
 ”نہیں اس کے متعلق کچھ باتیں نہیں ہوتیں۔“.....

پود کو لیں کہ اس کا خوف ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی شادی کی خبر تمام شہر
 میں مشہور ہو جائے اور لوگ اسے چھیڑیں اور اُس کا مذاق اڑانے لگیں۔
 تو کر ایک بار چلا جاتا ہی تو کچھ سوچنے کے بعد وہ پھر اس کو آواز دیتا ہے۔
 ”پولش خرید لایا؟“

”خرید لایا۔“.....

”تجھے پالش دیتے وقت دکان والے نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ بھلا
 صاحب کو اس پالش کی کیوں ضرورت پڑی؟“
 ”نہیں۔“

”مکن ہے اُس نے کہا ہو؛ کہیں صاحب شادی کرنے کی فکر میں
 تو نہیں ہیں؟“

”نہیں، اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔“

یہ گھڑبھٹ اور خوف اور اندیشوں کا یہ عالم دیکھتے ہوئے بھلا کب ممکن
 تھا کہ پود کو لیں دو ٹھابنے کی ہمت کر سکتا۔ اتفاق سے اس کے ایک
 دوست کو پچ گرفت نے اس کی شادی کر دینے کا بیڑا اٹھالیا۔ پود کو لیں
 کے علاوہ اور امید داروں کو جنہیں مشاطہ نے پھانسا تھا کو پچ گرفت نے
 بہکا کر اور ڈرا کر بھگا دیا اور پود کو لیں کے لیے میدان صاف کر دیا۔ لیکن
 عین اُس وقت جب دُہن گر جا میں جانے کے لیے تیار ہوئی، پود کو لیں

ہمت ہار گیا اور چونکہ کوچ گرت نے اس خیال سے کہ ہمیں وہ فرار نہ ہو چکا
 دروازے پر پہرہ کھڑا کر دیا تھا، پود کو لین کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔
 ”انسپکٹر جنرل“ کا اصلاحی مقصد نہیں پورا ہوا۔ زار نکولائی نے خود
 اسے پڑھا بہت پسند کیا اور اسے ایسٹج پر دکھلانے کا حکم دیا: اور پہلے تماشے
 میں جا کر مہینے اور داد دینے میں پیش قدمی کی۔ لیکن سرکاری عہدہ داروں
 نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ایسٹج
 پر دکھانے کی قطعی ممانعت ہو گئی۔ مگر گول کی طبیعت میں اس ڈراما لکھنے
 کے ساتھ قومی اصلاح کا دلولہ اٹھا اور اس کا نقطہ نظر بھی کسی قدر بدل گیا
 اس کی باریک بینی ویسی ہی رہی ظرافت اتنی ہی رہی مگر واقعات کو وہ مصلح
 کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، اور جو درد روسی زندگی کا نظارہ اس کے دل
 میں پیدا کرتا تھا وہ اس امنگ میں منتقل ہو گیا کہ روسیوں کو حقیقت حال سے
 آگاہ کیا جائے اور روسی زندگی کی عبرت انگیز تصویریں دکھا کر لوگوں کے
 دل بہتر زندگی کی آرزوؤں سے معور کر دیے جائیں۔ ”انسپکٹر جنرل“ کی
 تصنیف کے بہت جلد بعد اس نے ایک ناول لکھنا شروع کر دیا جس کا
 عنوان ”مردہ روحیں“ تھا۔

”مردہ روحوں میں مصوری بہت بڑے پیمانے پر لگی گئی ہے، گول کا
 ارادہ تھا کہ روسی زندگی کی ایک جامع تصویر کھینچے اور اسی غرض سے اس
 نے ایک ایسا بوجھار پلاٹ منتخب کیا جو اس پر قصے کے تسلسل کی کوئی ذمہ
 داری یا پابندی نہیں ڈالتا۔ ناول کا ہیرو چکوف ایک نہایت درجہ چاک

خود غرض اور عیار آدمی ہی جو دو ہارس کار می ملازمت سے غبن اور رشوت خوری کی بنا پر نکالا جا چکا ہے۔ وہ روپیہ کمانے کی ایک اور تدبیر سوچ کر مردہ روہیں خریدنے نکلتا ہے۔ اس زمانے میں تمام روسی کاشتکار زمینداروں کی ملکیت تھے اور دوسری چیزوں کی طرح بیچے اور خریدے جاسکتے ہیں۔ زمینداروں پر لگان ان نفوس "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا تھا جو ان کی ملکیت میں تھیں، لیکن چونکہ مردم شماری ہر دسویں سال ہوا کرتی تھی، اس لیے زمینداروں کو ان کاشتکاروں کا لگان بھی دینا ہوتا تھا جو درمیان میں مر جانے تھے۔ چچکوف کی تدبیر یہ تھی کہ ایسی مردہ "روحیں" زمینداروں سے سستے داموں خریدے، فرضی قیمتیں لگا کر ان کا ایک باقاعدہ بیع نامہ لکھوائے، جیسا کہ زندہ روحوں کی خرید و فروخت کے وقت لکھوایا جاتا تھا، اور تب انہیں کسی بڑے بینک میں جا کر ایک معقول رقم کے عوض رہن رکھا دے۔ وہ روحیں خریدنے کے لیے وہ ایک گاڑی پر بیٹھ کر سفر کو نکلتا ہے، اور گول بھی ہمیں اس کے ساتھ ساتھ سیر کراتا ہے اور ان زمینداروں میں جن کے پاس چچکوف بیوپار کرنے جاتا ہے، ہمیں روسی سیرت مختلف شکلوں میں دکھلائی جاتی ہے، مٹی کوٹ ایک جوان زمیندار ہے، جس میں کوئی خصوصیت نہیں، کسی قسم کا شوق نہیں جو کبھی سوچتا ہے کہ اپنے گھر سے تالاب تک ایک زمین دوڑا سٹے بنائے، کبھی اسے تالاب پر ایک ایسا ٹیل بنانے کی سوچتی ہے جس کے دونوں طرف ٹھکانے کی دوکانیں ہوں، مگر وہ کرتا کرنا کچھ نہیں اس کے گول کمرے میں کئی کوچ ہیں جن پر کپڑا چڑھانا باقی رہ گیا ہے، وہ اپنے تمام مہانوں سے کہتا ہے کہ اپنے

نہ بیٹھیں، وہ ابھی تیار نہیں ہیں، لیکن کئی سال گزر گئے اور وہ کوچ اسی لٹا
میں پڑے ہیں۔ اس کی جائداد کا انتظام بہت خراب ہے، اسے کھانا تک ٹھیک
طرح سے نہیں ملتا، مگر وہ خوش ہے اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتا۔ اس کے برعکس
سو با کیے ویرج ایک ہنایت کجوس، اکھڑ آدمی ہے، جو اپنی جائداد کا انتظام
بہت اچھا کرتا ہے اور روپے کے لالچ میں ہر طرح کی بے ایمانی کرنے پر خوشی
سے راضی ہو جاتا ہے، اگر اسے یہ یقین ہو جائے کہ اس میں فائدہ ہوگا۔ کھانے

میں اور دوسروں کو گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا
نوز دریوف اسی قسم کا مگر کسی قدر مختلف آدمی ہے، بے ایمان، جھوٹا، فساد
آوارہ، جو ملنے جھلنے میں بڑا بے تکلف ہے۔ مگر جیسا کہ چکوف کو ذاتی تجربے سے
معلوم ہو جاتا ہے، اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پٹوانے اور ذلیل کرنے پر بھی
بہت جلد آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب شہر میں چکوف اپنا کام ختم کر چکتا ہے،
بیع نامے لکھ کر کچہری میں داخل کر دیے جاتے ہیں اور رخصت ہونے سے
پہلے وہ دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے میں مصروف ہوتا ہے تو یہی نوز
دریوف سب سے کہہ دیتا ہے کہ چکوف نے مردہ روحیں خریدی ہیں اور نادول
کے ہیر و کا سارا کام بگڑ جاتا ہے وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہو جاتا بلکہ
ملک کے دوسرے حصے میں جا کر اسی طرح مردہ روحوں کا بیوپار شروع کر دیتا
ہے۔ اسی سلسلے میں وہ جعلی وصیت نامہ بنا کر ایک رئیس عورت کی جائداد کا
بڑا حصہ ورثے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کا جعل پکڑا جاتا ہے
اور وہ پیشکل قید خانے سے اپنی جان بچاتا ہے۔

جو ہنسنا چاہے اسے ”مردہ روحوں“ میں اس کے بہت سے موقع ملیں گے۔
گو گول کی نظر انسانی زندگی کا ہر پہلو دیکھنے میں کبھی نہیں چوکتی۔ شہر کے سرکاری
دکیل کی باتیں آنکھ اس طرح چپکتی تھی گویا وہ کہنا چاہتا ہو ”بیٹا ذرا دوسرے
کمرے میں چلو تو تم کو پتے کی بات سناؤں“ لیکن وہ نہایت سنجیدہ اور غامض
پسند آدمی تھا، چپکوت سے اس کی خاصی دوستی ہو گئی اور جب اس نے آخر
میں افواہ سنی کہ چپکوت کوئی سرزیا فتنہ مجرم ہے، اور جلی نوٹ بناتا ہے تو اس
کو بہت صدمہ ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں فلجی گرنے سے یا قلب کی
حرکت بند ہونے سے وہ اچانک مر گیا۔ لوگوں نے ڈاکٹر کو فصد کھولنے کے
لیے بلوایا، لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری دکیل کے جسم سے روح
نکل چکی ہے تب انھیں..... احساس ہوا کہ وہ واقعی روح رکھتا تھا، اگرچہ
اس کے انکسار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا..... ایک زمیندار سے جو بلینا
چوڑان میں یکساں ہے اور کھاتے کھاتے پھول گیا ہے، ایک ہمایہ شکایت کرتا
ہو کہ اسے زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا ہے اور اس کا جی گھبرایا کرتا ہے۔
”بھٹا راجی کیوں گھبراتا ہے؟“ وہ بزرگ حیرت سے پوچھتے ہیں ”تم کھاتے کافی
نہیں ہو، اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں۔“ لیکن ایسے چٹکے ”مردہ روحوں“
کی مایوس کن اور بہت شکن فضا پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے، گو گول ہنستاؤ
ہنستا ہی، مگر یہ بھی ایک مجبوری سی ہے۔ ”مردہ روحوں“ میں ایک جنرل
ہیں جنھیں چپکوت کا ایک لطیفہ بہت پسند آتا ہے اور جب ان کی رڑکی اصرار
کرتی ہے کہ انھیں ہنسنے کے بجائے افسوس کرنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں: ”بیٹی میں

کروں کیا..... یہ بات ہی کچھ ایسی مضحک ہے، ”گوگول کا بھی یہی انداز ہے،
 لیکن ظرافت سے وہ کبھی اپنے یا اپنے پڑھنے والوں کے دل پر غم کا بوجھ ہلکا
 نہیں کرتا۔ ”مردہ روحوں“ میں ایک بزرگ فرماتے ہیں: ”مجھے اکثر خیال
 ہوتا ہے کہ روسی کو بالکل گیا گزرا سمجھنا چاہیے، اس کے ارادے میں قوت
 نہیں، اس میں اتنی ہمت نہیں کہ استقلال سے کام کرے۔ وہ سب کچھ کرنا چاہتا
 ہے، مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ وہ ہر دن سوچتا ہے کہ کل سے ایک نئی زندگی شروع
 کروں گا، جس قدر محنت کرنی چاہیے وہ کروں گا، کھانے میں پرہیز کروں گا
 مگر ہوتا ہوا تا کچھ نہیں۔ اسی رات کو وہ ضرورت سے زیادہ کھا جاتا ہے،
 بے وقوفوں کی طرح آنکھیں میچا جاتا ہے اور منہ سے ایک حرف بھی نہیں
 نکال سکتا۔ ہاں، واقعی، ہمیشہ یوں ہی ہوا کرتا ہے گوگول نے جب ”مردہ
 روحوں“ کے پہلے دو چار باب لکھے تو شاعر بننے کے زندہ تھا اور گوگول نے
 اسے یہ پڑھ کر سنائے۔ لیکن گھبرا کر چلا اٹھا ”یا خدا، ہمارا دس بھی کیا
 عجیب ویرانہ ہے“ مسئلہ ”مردہ روحوں“ کی پہلی جلد شائع
 ہوئی اور اس کے پڑھنے سے اور سب پر بھی ایسا ہی اثر ہوا۔ لیکن
 گوگول کی حقیقت بینی تسلیم کرتے ہوئے نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ
 جس سوسائٹی میں صرف ایسے ہی لوگ ہوں جیسے گوگول نے اپنی ناول
 میں دکھائے ہیں تو اس کا صفحہ ہستی پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ گوگول نے بھی
 یہ محسوس کیا، اور اپنے نقادوں کو یقین دلایا کہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا
 ہے، اس کا پہلا حصہ روسی زندگی کا صرف ایک رخ دکھاتا ہے اور آگے

چل کر وہ ناول کے پیرائے میں نجات کی بھی کوئی صورت دکھائے گا، لیکن نجات کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ”مردہ روحوں“ کا دوسرا حصہ تین بار لکھ کر جلا دیا گیا اور جس شکل میں اس کی آخر کار چھپنے کی نوبت آتی وہ نہایت نامکمل تھا اور اس میں نجات کا راستہ سمجھانے کا وعدہ بھی ذرا بے تکے طریقے سے پورا کیا گیا تھا۔ مگر ”مردہ روحوں“ کے دوسرے حصے کو دیکھ کر گوگول پر اعتراض کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ یہ حصہ گوگول کے مرنے کے بعد شایع ہوا، اور مرے سے کئی سال پہلے ۱۸۸۷ء میں گوگول نے ”احباب کے نام خطوط“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ناول نویسی ترک کر دی ہے۔

قومی نجات کا مسئلہ دراصل نہایت اہم تھا اور اگر گوگول نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے طرح کرنا ناول نویس کے امکان سے باہر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی ”احباب کے نام خطوط“ ایک قسم کے مذہبی وعظوں کا مجموعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوگول نے اپنی عاجزی اور بے کسی محسوس کر کے مذہب کے آغوش میں پناہ لی تھی۔ اس کے معاصرین کو اس تصنیف سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ہوا، کیونکہ وہ مذہبی جذبے اور مذہب کی پیروی میں فرق کرتے تھے۔ گوگول کے وعظوں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ نار اور روسی کلیسا کے سامنے سر تسلیم خم کرانے کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بھول گئے کہ وہ کیسے نار اور کیسے کلیسا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک روسی فطرت کی تعبیر کا تعلق ہے، گوگول کے وعظ بھی اسی قدر پر حقیقت تھے جتنے

اس کے ناول اور دستخط کی اور تالستانی کی تصانیف نے اسے ایک حد تک ثابت بھی کر دیا۔ ہر حال یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ روسی کو صرف مذہبیت کا جذبہ نجات دلا سکتا ہے، گو گول کا انجام صاف طور سے ظاہر کر دیتا ہے کہ روسی ناول نویسوں کے لیے ناول محض قصے کہانی نہیں تھے۔ ان کی نظروں میں ناول وہی حیثیت رکھتا تھا جو قدیم یونانی معیار کے مطابق کلیف کی تھی، اس کا مقصد صرف جی پہلاتا یا عبرت دلانا نہیں تھا۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کی ہر شکل اور کیفیت تھی، وہ ایک آئینہ تھا جس میں صرف موجودہ حالات کا عکس نہیں تھا، بلکہ اس زندگی کا ایک دُعا لاسا پر تو جسے انسان اپنے تمام قومی کی نشوونما کے بعد اپنی جولا لگا ہ بنا سکتا ہے۔ گو گول پہلا ناول نویس تھا جس نے ناول کے کل امکانات سمجھے اور ناول نویسی کے پورے فرائض محسوس کیے اور باوجود اپنے فلسفیانہ مقاصد کی ناکامی کے وہ دنیا کے ناول نویسوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔

دوسرا باب

سرگے نئی تہونے پوچ اکسا کوف (۱۷۹۱-۱۸۵۹)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ”مردہ۔ وحوں“ کی حقیقت نگاری نے گوگول کو گویا ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا جہاں سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملا، اور ایک قیدی کی طرح جو آزادی کے لیے تڑپ رہا ہو وہ اپنے قید خانے کی دیواروں پر سر ٹپک ٹپک کر رہ گیا۔ اس کے ہم عصر اکسا کوف نے بھی حقیقت کو اتنی ہی تیز اور نکتہ بین نگاہوں سے دیکھا، مگر اپنے آپ کو جان بوجھ کر کسی فریب میں مبتلا نہیں کیا اور اس کی حقیقت نگاری خود اس کے اور دوسروں کے لیے تسکین اور تسلی کا ذریعہ اور امید کا ایک پیغام بن گئی جیسا کہ ایک اخبار نے اکسا کوف کی تصنیف ”ایک خاندانی داستان“ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا اس وقت روسی انشا پردازوں میں وہی ایک ایسا تھا جس نے روسی زندگی کو محض نکتہ چینی کے لیے تختہ مشق نہیں بنایا، بلکہ روسی سر زمین اور روسی رہن رہن سے سچی دل چسپی دکھائی اور محبت برتی۔ یہی اس کی عظمت کا راز ہے۔ اکسا کوف کی تصانیف مروج مذاق اور معیار کے مطابق نہیں ہوں تاہیں نہ کہی جاسکیں، مگر جس زندگی کا ان میں خاکہ کھینچا گیا ہے، جو داستان وہ سناتی ہے وہ لطف، دل کشی، حقیقت نمائی اور سبق آموزی میں بہترین

ناووں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر دوسے اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے بیزار نہیں ہونے، ان کو قوم اور قومی معاشرت سے اور گہرا تعلق ہو گیا، اس وجہ سے نہیں کہ اس کا کون نے انھیں خود ستائی اور حیوانوں کے سے سکون و اطمینان کا سبق پڑھایا، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے ان کے دلوں میں محبت کے جذبے کو سیدار کیا اور اس جذبے نے ان کی نظر کو یڑائی کے ساتھ اچھائی کو دیکھنا بھی سکھایا، یورپ پر خشک کرتے کرتے ان کے دلوں میں جو بے صبری اور بے اطمینانی کا طوفان برپا ہوا تھا اسے کسی قدر فرو کیا اور روسی عینیت کے شبکے ہوئے مسافر کو منزل مقصود کا راستہ بتایا۔

اس کا کون شہر اڈف، صوبہ اورن برگ میں پیدا ہوا اور اس نے کا زان کے اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ پانچ سال تک پتربرگ میں ملازم رہا، چند سال ماسکو پتربرگ اور اڈف کا چکر لگا تا رہا اور ۱۸۱۶ میں مستقل طور پر ماسکو میں سکونت گزریں ہو گیا۔ انشا پر داری کا اسے لڑکپن ہی سے شوق تھا، لیکن اس کی نامور تصانیف کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس دوران میں اس نے متعدد مضامین لکھے اور کئی ڈراموں کے ترجمے کیے مگر ان میں اُن خوبوں کا نام و نشان تک نہیں جھنوں نے اس کے بڑھاپے کی تصانیف کو اس قدر مشہور اور ہر دل عزیز کر دیا۔ یہ معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے اگر ہم اس کا کون کی طبیعت پر غور کریں اور یاد رکھیں کہ انسان اپنا جو ہر اسی حالت میں دکھا سکتا ہے

جب وہ اپنی تخلیقی کوششوں میں اپنی پوری شخصیت کو محو کر کے۔ اکساکوف طبعاً نہایت درجہ نیک دل، خوش اخلاق اور محبت کرنے والا تھا، ادبی شہرت حاصل کرنے سے پہلے اس نے ہزار ہا لوگوں کو اپنی شریفانہ سیرت اور دوستانہ سلوک کا گردیدہ کر لیا تھا۔ مضامین اور ترجمے اُس کی شخصیت کی تاثیر سے محروم رہے، مگر وہ اپنے بچپن کے حالات اور خاندان کی سرگزشت سنانے بیٹھا تو وہ تمام صفتیں جنہوں نے باسکو کے ہر بچے آدمی کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا اس کی تصانیف میں ایک ساتھ ظاہر ہوئیں اور ادبی دنیا میں اس کا وہی مرتبہ ہو گیا جو دوستوں کے حلقے میں تھا ”مچلی کے شکاری کا روزنامہ“ ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا، ”صوبہ اورن برگ کے شکاری کا روزنامہ“ ۱۸۴۸ء اور اس کے تین سال بعد ”شکاری کے قصے اور تذکرے“ تینوں کتابوں کی بہت جلد کئی اشاعتیں نکل گئیں اور جب ۱۸۵۶ء میں اکساکوف نے ”خاندانی داستان“ کے ابواب کی اشاعت شروع کی تو اس کا روس کے ادبی مشاہیر میں شمار ہونے لگا تھا اور تعلیم یافتہ روسی اس کے فریفتہ ہو چکے تھے۔

ان تصانیف میں اکساکوف کا ارادہ اپنی طبیعت کا جوہر یا اپنی انشا پر دازی کے کرشمے کھانا نہیں تھا۔ اسے بڑھاپے میں اپنا بچپن یاد آیا اور اپنے لڑکپن اور جوانی کی دلچسپیاں، وہ لوگ یاد آئے جن کی محبت میں وہ پلا تھا اور اس طرح اس کی نظر ایک نسل سے دوسری تک دوڑ گئی، جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ جیتی جاگتی تصویروں کی طرح پھر اس کے سامنے آ گیا اور اس کے قلم نے بڑے شوق سے کاغذ پر ان کا پورا پورا

نقشہ اُتار دیا۔ اکسا کوف کے بیان سے سادگی اور خلوص ٹپکتا ہوا بیان کی رونق اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان مناظر اور انسانوں کی تصویروں میں جو وہ دکھاتا ہے اپنی طرف سے کچھ گھسنا تا بڑھاتا نہیں اور اس اصول پر استقلال سے عمل کرتا ہے کہ سچی بات اور سچی تصویر میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پہلی دو تصانیف میں اس نے اپنے وطن کے مناظر قدرتِ اس کی فضا، اس کے حیوانات و نباتات کا ذکر کیا ہے۔ اسے اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی، ایسی گہری اور سچی محبت کہ وہ اس کی تصانیف کا ایک جزو بن گئی اور پڑھنے والے کو فوراً اپنی تاثیر سے مسحور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ”خانمانی داستان“ میں جن لوگوں کی سرگزشت سنائی گئی ہے ان سے اکسا کوف کو محبت تھی، وہ ان کی بُرائی بھلائی سب دیکھتا اور دکھاتا ہے، مگر وہ ہر حالت میں انہیں اپنا سمجھتا ہے اور جو محبت انہوں سے کرنا چاہئے اسے ہمیشہ برتا ہے۔ پڑھنے والے کو بھی یہی نقطہ نظر اختیار کرنا ہوتا ہے، اکسا کوف کے عزیز اس کے عزیز بن جاتے ہیں، ان کی بُری حرکتیں اور خصلتیں اس کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرتی ہیں، کیونکہ اکسا کوف سے وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے کہ خطاؤں سے درگزر کرنا نفرت کرنے سے بہت بہتر ہے اور اگر اس کے دل میں ذرا بھی محبت کا مادہ ہے تو وہ محسوس کر لیتا ہے کہ محبت کا یہی تقاضا ہے۔ اکسا کوف کے عزیز ان لوگوں سے کسی صورت مختلف یا بہتر نہیں ہیں جن سے ”مردہ روحوں“ میں چھکوت بے پار کرتا ہے، لیکن اکسا کوف کی انسانی ہمدردی اور محبت نے دونوں کتابوں کی

روح اور ان کی تاثیر میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

”خاندانی داستان“ روسی طرز معاشرت کی بہت ہی صحیح اور سچی تصویر ہے، اس لیے ذیل میں اس کے چند اقتباس دیے جاتے ہیں، کہانی سننا اکا کوٹ کا مقصد نہیں تھا، اس داستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے، مگر مصنف کی انشا پردازی کے کمال نے روزمرہ زندگی کو ایک دل ربا کہانی کا رنگ روپ دیدیا ہے اور ہمیں وہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔

”خاندانی داستان“ کا قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اکا کوٹ کے دادا نے خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر اپنا وطن چھوڑ دیا اور صوبہ اورن برگ میں، شہر ادو سے کوئی ڈھائی سو میل کے فاصلے پر زمین خریدی اور گائو آباد کر لیا۔ یہ جگہ نہایت خوبصورت اور یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی، کسان اور زمیندار دونوں اپنے وطن کو بہت جلد بھول بھال گئے اور نئی بستی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر بھی گائو کے گائو کو ایک بستی سے لے جا کر اور کئی سو میل کا سفر کر کے کسی دوسری جگہ آباد کرنا ہمت کا کام تھا اور ستیپان میخائلوویچ، اکا کوٹ کے دادا کو کامیابی زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے دنیا سے نرالی طبیعت پائی تھی، اس کے اسامی اس سے ڈرتے بھی تھے اور محبت بھی کرتے تھے۔ ”وہ قرب و جوار کے تمام لوگوں کے سچے محسن تھے۔۔۔ ان کے لبالب بھرے ہوئے کٹھار سب کے لیے کھلے تھے، جس کا جو بنی چاہتا لے سکتا تھا۔۔۔ وہ ایسے سمجھدار تھے

دوسرے کی خواہشوں اور ضرورتوں کا اتنا لحاظ کرتے تھے، اپنے قول کے اتنے پکتے تھے کہ بہت جلد ان لوگوں کی نظر میں جو وسیع صوبہ اور نبرگ کے ایک کونے پر آباد ہوتے تھے علم اہود دانشندی کا مجسمہ بن گئے۔ وہ اپنے ہمسایوں کو مدد پہنچانے کے علاوہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتے تھے۔ جس نے ایک بار جھوٹ بولا، ایک بار دھوکا دیا اس کی خیریت اسی میں تھی کہ پھر وہ ان کو اپنا منہ نہ دکھائے؛ کیونکہ تب صرف یہی اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ واپس جائے گا، بلکہ اگر وہ اٹھے پیروں بھاگ کر اپنی جان بچالیتا تو بھی سمجھنا چاہیے تھا خاندانے اس کے حال پر رحم کیا۔ ستیان بنیا لموچ نے بہت سے خاندانوں کے جھگڑے طو کیے، ہزار ہا فتنوں کو سر اٹھاتے ہی کچل دیا۔

”میں نے لوگوں کی زبانی ستیان بنیا لموچ کی بہت سی باتیں سنی ہیں، بعض معمولی، بعض ایسی جنھوں نے دل پر بہت گہرا اثر کیا اور جن کو سنا تے وقت لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

”اس نیک دل فیاض اور بامردت شخص پر کبھی کبھی غصے کا بھوت ایسا سوار ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر انسانیت کی علامتیں باقی نہیں رہتی تھیں اور اس وقت وہ نہایت درجہ بے رحم اور نفرت انگیز حرکتوں

لے آکھون نے ”خاندانی داستان“ کی پہلی اشاعتوں کی تہذیب میں لکھا تھا کہ یہ اس کے اپنے خاندان کا قصہ نہیں ہے اس خیال سے کہ شاید جن لوگوں کا اس میں ذکر آیا ہو ان کے عزیزوں کو کوئی نزاکت ہو مگر اس داستان میں واحد حکیم کا صیغہ آکھون نے اپنے لیے استعمال کیا ہے

پر اتر آتا تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں انہیں اس حالت میں دیکھا تھا... اور
 میرے دل پر خوف کا نقش ابھی تک تازہ ہے، ان کی صورت ہو بہو میرے
 سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی پر خفا ہوئے تھے، غالباً اس
 وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولی تھی اور دھوکا دینے کی کوشش میں پکڑی گئی
 تھی۔ دو آدمی دادا کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے انہیں تھامے تھے، انہیں
 دیکھ کر میں مشکل سے کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے دادا ہیں، وہ سر سے پیر تک کپ
 رہے تھے، چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی، ان کی آنکھوں سے ہیبت
 ناک شعلے نکل رہے تھے، غصے سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔
 وہ چلا رہے تھے۔ ”اسے یہاں پکڑ لاؤ!“ اور ان کی آواز سے معلوم ہوتا
 تھا کہ کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہے... میری دادی چاہتی تھیں کہ ان کے
 پیروں پر گر کر مجرمہ کی طرف سے معافی مانگیں، لیکن ایک لمحے میں ان
 کے سر سے رومال لے اور ٹوپی غائب ہو گئی اور ستیپان میخائلوویچ نے اپنی
 چھوٹی موٹی بوڑھی اور ضعیف ارنیا وسیل یفینہ کے بال پکڑ کر انہیں جھنجھوڑ
 ڈالا۔ اس درمیان میں صرف مجرمہ ہی نہیں بلکہ اس کی اور سب بہنیں،
 بھائی اور بھادوچ مع اپنے بچے کے سب گھر سے نکل بھاگے اور ایک کونج
 لٹے پرائی روسی وضع کے مطابق بال بھی ستر میں شامل تھے اور عورتیں سر کو ہمیشہ ایک
 رومال سے ڈھکے رہتی تھیں جو ٹھنڈی کے نیچے گرہ دے کر قائم رکھا جاتا تھا۔ اس
 کے نیچے بعض عورتیں ایک تنگ ٹوپی بھی پہنتی تھیں۔
 کس اکا کوٹ کی دادی کا نام ہے۔

میں جو مکان کو چاروں طرف سے گھیرے تھا جا کر چھپ رہے، رات کو سب وہیں سوئے، صرف دادا کی نوجوان بہو اپنے بچے کو وہاں سے لے کر چلی آئیں اور اس اندیشے میں کہ کہیں بچے کو سردی نہ لگ جائے تو کروں کی ایک کوٹھری میں رات گزاری۔ میرے دادا میدان اور خالی مکان میں بہت دیر تک دھاڑتے گر جتے رہے، آخر کار وہ تنہا چپونک اور مارن کو ٹھوکتے ٹھوکتے اور رینا و سیل یفنہ کے جھونٹے نوچتے نوچتے تھک گئے، اپنے پلنگ پر بے ہوش گر پڑے اور دوسرے دن صبح تک گہری نیند سوتے رہے۔ سوکر اٹھے تو چہرہ صاف اور روشن تھا، بڑی خوشی کے لہجے میں اپنی اربیا (ارینا و سیل یفنہ) کو پکارا اور وہ پاس کے کمرے سے فوراً دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار ایسے نمایاں تھے کہ گویا کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پچھلے دن کے دیوانے نے سوکر اٹھتے ہی کہا ”چائے لاؤ، بچے کہاں ہیں اور الکسی اور میری بہو؟ لاؤ، سیر یوٹر کو لاؤ۔“ اور بہو پوتے کے سوا گھر بھر میں سب خوش اور مطمئن یکے بعد دیگرے سیپان میخانلوچ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی بہو بھی نازک مزاج اور ضدی تھی۔ اس کی لاکھ خوشامد کی گئی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی کہ جس شخص نے کل ہی ایک درندے کی خاصیتیں اختیار کر لی تھیں لہٰذا تو کروں کے نام۔

لہٰذا سیپان میخانلوچ کے بیٹے، اکا کوٹ کے باپ کا نام دراصل اسے تیمونے ہی ہونا چاہیے۔
 لہٰذا مصنف کی ماں۔ لہٰذا خود مصنف

اس سے آج میل کر لے... اس کی طبیعت کچھ واقعی ناساز معلوم ہوتی تھی، اس لیے اس نے کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں اور اپنے بچے کو بھی نہیں جانے دیا۔ سب پر خوف طاری ہو گیا، سب سمجھے کہ کل کا ساشتر پھر برپا ہو گا۔ لیکن کل کا درندہ سوکرا اٹھا تو آدمی تھا... چائے کے بعد... خسر خود بہو کے پاس گئے... اس کے پلنگ پر بیٹھ گئے، اسے گلے لگایا پیار کیا... پوتے کو بھی خوب پیار کیا اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ ”بہو کے بغیر تو زندگی بے مزہ ہو جائے گی“ آدھے گھنٹے کے بعد ان کی بہو، ایک پُر تکلف شہری وضع کا جوڑا پہنے... اور بچے کا ہاتھ پکڑے ان کے کمرے میں آئی۔ دادا اس سے مخاطب ہوئے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُنہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا ”دیکھو بہو نے اپنی بیماری کا خیال نہیں کیا، اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے پہن کر مجھ بوڑھے کا جی خوش کرنے آئی ہے“ مندوں نے ہونٹ چبا کر نظر سنجی کر لیں۔ انہیں سب کو اپنی بھانج سے بالکل محبت نہیں تھی۔ بہو نے احترام اور مسرت سے خسر کی شفقت کا جواب دیا، ادا اپنی بدخواہوں کو فخر اور فتح مندی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی...”

یہ سستیلائی سچا ملوچ کا برا دن تھا۔ معمولاً ان کے دن اچھے ہوتے تھے۔ اچھے دن کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

”دادا سوکرا اٹھے اور... سہری سے سر نکال کر تہقہہ لگایا، کیوں کہ مازان اور تنائی چونک ایک عجیب مضحک انداز سے زمین پر ہاتھ پیر

پھیلانے پٹے خڑائے لے رہے تھے؛ دادا نے کہا ”دیکھو یہ کتے کے پٹے کیسے خڑائے لے رہے ہیں!“ اور پھر مسکرائے۔ ان کی طبیعت بھی ایک معنہ تھی۔ ایسے سخت الفاظ استعمال کرنے کے بعد انھیں چاہیے تھا کہ سوتوں کی پسلیوں میں اپنا ڈنڈا جو ہمیشہ ان کے بلنگ کے پاس کھڑا رہتا تھا بھونک دیں یا ان کے ایک لات لگائیں یا ان پر کرسی دے ماریں لیکن وہ منہ نہ کر رہ گئے وہ ابھی طرح سے سوتے تھے اور ان کے مزاج میں دن بھر خوش رہنے کا سامان تھا... انھوں نے خاموشی سے اٹھ کر دو چار دفعہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اپنے بادامی رنگ کے سلیر سیر میں ڈالے اور موٹے سن کے کپڑے کی دیہاتی وضع کی قمیص پہنے (باریک بننا ہو ا کپڑا دادی انھیں قمیصوں کے لیے کبھی نہیں دیتی تھیں) جا کر برساتی میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں صبح کی تازگی اور طراوت نے نہایت دل پذیر طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ ارینا ویل نفیہ ستیان میخانلو وچ کو باریک کپڑا قمیصوں کے لیے نہیں دیتی تھیں اور ہر شخص اعتراض کر سکتا ہو کہ میاں بیوی کی طبیعتیں دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا... لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے، عورت کی فطرت اس معاملے میں بھی مرد پر فتیاب ہوئی! میری دادی نے موٹے کپڑے کے پیچھے کئی دفعہ مار کھائی مگر وہ قمیص موٹے کپڑے ہی کی بناتی رہیں اور آخر کار دادا کو اس کی عادت ہو گئی۔ ایک بار تو انھوں نے نہایت ہی موثر اور اپنے نزدیک انتہائی تدبیر اختیار کی؛ یعنی تمام موٹے سن کے

سوت کے بنے ہوئے کپڑے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر رکھے اور کھپاڑی سے کاٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ میری دادی روتی پٹتی رہیں، دادا سے التجا کرتی رہیں کہ ”مجھے مار لو مگر اپنی چیز نہ برباد کرو“ دادا نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی... مگر یہ تدبیر بھی ناکامیاب رہی پھر انھیں ویسے ہی موٹے کپڑے ملنے لگے اور آخر کار انھوں نے ہار مان لی... دادا کے ”اچھے دن“ کی داستان کا سلسلہ توڑنے کی معافی چاہتا ہوں... خیر اب آگے نسیں۔ دادا بغیر کسی کو بلائے خود ہی جا کر اپنا منہ کا سویٹر اسباب کی کوٹھری سے، جہاں وہ ہمیشہ رکھا رہتا تھا، لے آئے اسے برساتی کی پہلی سیڑھی پر بچھایا اور اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گئے کہ سورج کو نکلنے ہوئے دیکھیں۔ طلوع آفتاب کے وقت ویسے ہی انسان کا دل آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے اس کے علاوہ میرے دادا کو سویرے اٹھ کر اپنے گھر بار کی ہر چیز پر نظر ڈالنے میں لطف آتا تھا، اور ان کے یہاں اس زمانے کے لحاظ سے زندگی کی تمام ضروریات ہتیا تھیں... پھر دادا کا ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے کو دل چاہا اور انھوں نے اپنے خادموں کو جو بے ٹیکے طریقے سے سو رہے تھے جگایا۔ خادم دیوانہ کی طرح خوف سے اچک کر کھڑے ہو گئے، مگر سیتیان میٹا لو وچ کی خوش و خرم آواز نے پھر ان کی جان میں جان ڈال دی، ”مازان، منہ دھوئے کا پانی لاؤ! تنائی چوٹوک، اکیونکا اور بی بی کو جگاؤ!۔ اور چائے لاؤ!“

لے خامہ کا نام۔

ان حکموں کے دہرانے کی ضرورت نہ تھی بے ڈول مازان چشے سے پانی کے
یہ چمکتی ہوئی پیل کی چلمی لے کر سر پٹ بھاگا، پھر تیلے سنائی چوونک نے
یہ صورت، نوجوان اکیسویں لاکھ کو اٹھایا۔ وہ اپنے سر پر رومال ٹھیک کرتی
ہوئی گئی اور بوڑھی موٹی بی بی ارینا ویل یفتہ کو جگا آئی۔ چند منٹ میں
گھر بھر اٹھ کھڑا ہوا اور سب کو معلوم ہو گیا کہ بڑے میاں خوش خوش
اُٹھے ہیں۔ پندرہ منٹ کے اندر برساتی میں ایک میز بچھ گئی، اس پر
ایک سفید گھر میں بنے ہوئے کپڑے کی چادر لگا دی گئی۔ ایک بہت
بڑے پتیل کے چائے دان، ناساوا میں چائے اُبلنے لگی اور میز کے گرد
اکیسویں مختلف کاموں میں مشغول ہو گئی۔ بوڑھی بی بی ارینا ویل یفتہ
اور ستیان میخانلوچ نے ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کی۔ بوڑھی بی بی
کے بے اور دنوں کی طرح آج نہ آہیں بھرنا ضروری تھا نہ کانکھنا، انھوں
نے بلند آواز اور خوشی کے لہجے میں دادا کا مزاج پوچھا اور کہا، ”کیسے کیسی
نہند آئی، کیا کیا خواب دیکھے؟“ دادا نے بڑی شفقت سے اپنی بیوی کا
مزاج پوچھا اور پیار میں انھیں اریشا کہہ کر بکرا۔ وہ ان کے ہاتھ کبھی نہیں
چومتے تھے، بلکہ عنایتاً اپنا ہاتھ چومنے کے لیے دیتے تھے۔ ارینا ویل
یفتہ پھول کی طرح کھل گئیں، چہرے پر جوانی کا رنگ آ گیا، کہاں گیا
اب ان کا موٹا پا، ان کا بے ڈھنگا پن! وہ جلدی سے اسٹول لائیں اور
برساتی میں دادا کے پاس بیٹھ گئیں۔ اس کی انھیں کبھی ہمت نہ ہوتی اگر
دادا پیار سے نہ پیش آئے ہوتے دادا نے کہا ”آؤ اریشا، گرمی ہونے سے

پہلے چائے پی لیں۔ رات کو جس تو ہٹا مگر میں ایسی گہری نیند سویا کہ خواب تک نہیں دیکھا۔ ہاں اور تم؟ یہ سوال ایک غیر معمولی پیار کی نشانی تھی اور ارینا دلیل بے فائدہ نے جلدی سے جواب دیا کہ ”جس رات کو سیتیان میخانکو وچ اچھی طرح سوتے ہیں مجھے بھی خوب نیند آتی ہے، مگر تانیوشتاہ نے رات کچھ بے چینی سے گزاری۔“ تانیوشتاہ سب سے چھوٹی لڑکی تھی اور جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے، بوڑھے باپ کو وہ اور لڑکیوں سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ یہ خبر سن کر کچھ پریشان ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ جب تک لڑکی خود سے نہ اٹھے اسے کوئی نہ جگانے پائے۔ تیانہ سیتیانوفنہ اپنی بہنوں الکساندرا اور ایلی زادیتا سیتیانوفنہ کے ساتھ جگا دی گئی تھی اور کپڑے پہن کر تیار بھی ہو چکی تھی، مگر دادا سے یہ کہنے کی کسی کوشش نہ ہوئی۔ تانیوشتاہ پھرتی سے کپڑے اتار کر پھر بلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکیاں سب بند کرادیں۔ اُسے نیند تو نہیں آئی، مگر دو گھنٹے اندھیرے میں لیٹی رہی، دادا کو اطمینان ہو گیا کہ تانیوشتاہی بھر کر سولی ہے۔ دادا کا اکلوتا لڑکا جو کوئی نو سال کا تھا، کبھی سویرے جلدی نہیں جگایا جاتا تھا۔ بڑی لڑکیاں تھوڑی دیر بعد حاضر ہوتیں۔ سیتیان میخانکو وچ نے شفقت سے انھیں ہاتھ چومنے کو دیا۔ ایک کونز انکا کہہ کر بچارا، دوسری کو لکسانیا۔ دونوں بڑی ہوشیار تھیں۔ الکساندرا کی طبیعت میں

لہ تیانہ کا مخففت ۔

سہ ایلی زادیتا کا مخففت ۔

سہ الکساندرا کا مخففت ۔

چالاک کے ساتھ باپ کی تیزی اور تنک مزاجی تھی، مگر باپ کی اچھی صفیں اس میں نہیں تھیں، دادی بہت ہی سیدھی سادھی عورت تھیں اور ان کی لڑکیاں ان پر بالکل حاوی تھیں۔ گروہ ستیان میٹالوج سے چالاک کرنے کی بہت کوششیں تو محض لڑکیوں کے سکھانے سے اوسا پنی سادگی کی وجہ سے اکثر انھیں اس کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی۔ ستیان میٹالوج کو یہ بخوبی معلوم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب کبھی موقع ملا انھیں دھوکا دینے پر تیار ہو جاتی ہیں، جب ان کا مزاج ٹھیک ہوتا تو... صحت بکھیرے سے بچنے اور اپنا سکون قلب قائم رکھنے کے لیے وہ ایسی باتیں کرتے کہ لڑکیاں سمجھتیں کہ ان کو بوقوت بنا رہی ہیں، لیکن جہاں انھیں غصہ آتا وہ لڑکیوں کو بے تکلف خوب کھری کھری سناتے بلکہ کبھی مار بھی بیٹھتے تھے، مگر لڑکیاں پوری حوا کی بیٹیاں تھیں، وہ کبھی باز نہ آئیں، غصے کی گھڑی گزری اور دادا کی پیشانی کے بل دور ہوئے کہ وہ پھر دھوکا دینے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگیں جن میں وہ اکثر کامیاب بھی رہی تھیں۔

”چائے پی کر اور بیوی بیٹیوں سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے دادا کھیتوں کے معائنے کے لیے چل دیے... باوجود گرمی کے وہ دوپہر تک گاڑی پر چڑھے گاڑی کی جیسے ہی دادا کی گاڑی پہاڑی پر سے اترتی نظر آئی کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سارا خاندان ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا... کھانے پر سب بہت خوش تھے... سب بلند آواز میں باتیں کرتے، مذاق کھاتے، ہنستے رہے... کھانے کے بعد دادا فوراً سونے کے لیے

لیٹ گئے... اور بہت جلد ان کے خراٹوں کے شور وغل کو سن کر سب سمجھ گئے کہ صاحب خانہ سو رہاؤں کی نیند سو رہے ہیں سب اپنی اپنی جگہ پر آرام کرنے چلے گئے نماز ان اور تنائی چوٹک بھی... دادا کی خواب گاہ کے دروازے کے سامنے دروازہ ہو گئے... نیند اور گرمی سے ان کا گلا سوج گیا تھا ان کا جی چاہتا تھا اپنے آقا کی طرح بیر میں خوب ہرٹ ڈال کر پنیں اور حلق تر کر لیں۔ دیکھیے ان ڈھیٹھ چھ کروں نے کیسی ترکیب سوجی۔ دادا کی خواب گاہ کا دروازہ کچھ کھلا تھا، وہ کمرے میں جا کر ان کی ٹوپی اور چوٹے کے پاس نہی کر سی پر رکھا تھا۔ تنائی چوٹک آقا کے کپڑے پہن کر برساتی میں بیٹھ گیا... مازان جگے کر تہ خانے بھاگا ہوا گیا اور خادمہ کو جگا کر صاحب خانہ کے لیے ٹھنڈی بیر طلب کی، خادمہ نے جب شک ظاہر کیا کہ صاحب خانہ واقعی اُسٹے نہیں تو مازان نے تنائی چوٹک کی طرف اشارہ کر دیا، جو چوٹا اور ٹوپی پہنے برساتی میں بیٹھا تھا۔ بیر انڈیل دی گئی، اس میں ہرٹ ڈال دی گئی اور مازان مال غنیمت لے کر چلتا ہوا، دونوں لڑکوں نے ایک ہی جگہ سے پی کر ہم چوٹا اور ٹوپی چرائی جگہ پر رکھ دی... دادا اُسٹے لڑکے سے بھی زیادہ خوش و خرم تھے اور اُسٹے ہی ٹھنڈی بیر مانگی... نوکروں کے دھوکے کا لڑکاش ہو گیا، مازان اور تنائی چوٹک خوف سے لرزتے ہوئے آقا کے قدموں پر گر پڑے اور آپ کیا سمجھتے ہیں دادا نے کیا کیا؟... انھوں نے قہقہہ لگایا، اپنی بیوی اریشا اور لڑکیوں کو بلا بھیجا اور خوب زور سے ہنس ہنس کر

اپنے نوکروں کی چالاکی کا قصہ سنا یا...

”دادا اسہ پہر کو پانچ بجے اٹھے تھے اور ٹھنڈی ہیر کے بعد باوجود سخت گرمی کے انہیں چائے پینے کی خواہش ہوئی، اس خیال سے کہ گرمیوں میں گرم چیز پیتے سے طبیعت کا بھاری پن کم ہو جاتا ہے البتہ درمیان میں وہ جاکر لوگوں کو رُسلاں دیا کہ ٹھنڈے پانی میں ہنسا آتے، جو گھر کی کھڑکیوں کے نیچے سے بہتا تھا۔ واپسی پر ان کا سارا خاندان اسی سویرے والی چائے کی میز کے پاس ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چائے کی میز سائے میں رکھی تھی، اسی چائے دان نما سادار میں چائے اُبل رہی تھی اور وہی خادمہ اکیسویں تک موجود تھی۔ دادا نے اپنا مرغوب پسینہ لانے والا گرم پانی جی بھر کر پی لیا۔۔۔۔ اور تب سیر کے لیے بن چکی پر جانے کی تجویز پیش کی۔ ظاہر ہے سب بڑی خوشی سے راضی ہو گئے۔۔۔

”شام ہوئی تو ستپان میخانلو دُپچ نے کہا: ”اریشا، اب گھر واپس ہونے کا وقت آگیا، گھر پر غالباً مکھیا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

ستپان میخانلو دُپچ کا اندازہ غلط نہیں تھا: برساتی میں گانو کا مکھیا ان کا راستہ دیکھ رہا تھا اور صرف اکیلا نہیں بلکہ کئی کسانوں اور عورتوں کے ساتھ مکھیا دادا کو پہلے دیکھ چکا تھا، اس نے پہچان لیا کہ ان کی طبیعت خوش ہے اور کسانوں میں سے کسی کو یہ خبر سننا دی، بعضے جنھیں کوئی غیر معمولی درخواست کرنی تھی، اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے آہنچے اور سب کی خواہشیں اور حاجتیں پوری کر دی گئیں۔۔۔ صرف یہ

بلکہ سب کو ایک چاندی کے پیالے بھر... گھر کی بنی ہوئی زوردار شراب بھی ملی... رات اور دن کے کھانے میں بہت کم فرق تھا اور غالباً اس وقت سب نے اور زیادہ پیٹ بھر کر کھایا، اس وجہ سے کہ گرمی کم تھی۔ رات کا کھانا کھا کر ستیان میٹا لکھو وچ نے خاندان کو آرام کرنے کے لیے بیچ دیا اور خود حسب معمول فقط قیص پہنے برساتی میں جا کر رات کی خنکی کا لطف اٹھانے کے لیے بیٹھ گئے۔“

”خاندانی داستان“ میں ستیان میٹا لکھو وچ کے وطن سے ہجرت کر کے نئی بستی میں آباد ہونے اور ان کے اچھے اور بُرے دنوں کی سرگزشت سنانے کے بعد ان کی چھپری بہن اور ان کے اپنے لڑکے الکسی ستیانو وچ کی شادیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ستیان میٹا لکھو وچ کو اپنی چھپری بہن پراسکوویا اوانوفنہ بہت عزیز تھی اور چونکہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی نانی پر ستیان میٹا لکھو وچ کو زیادہ اعتبار نہ تھا اس لیے وہ پراسکوویا اوانوفنہ کو زیادہ تر اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے۔ ستیان میٹا لکھو وچ سے سب بہت ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود خاندان کی عورتوں نے ان کی مرضی کے خلاف پراسکوویا اوانوفنہ کی پندرہ برس کی عمر میں میٹا لکھو وچ کو رولے موٹ نامی ایک فوجی افسر سے شادی کرادی۔ پراسکوویا اوانوفنہ کو ورثے میں کئی گائوں ملنے والے تھے اور اس سے شادی کر لینا قرب و جوار کے تمام نوجوانوں میں بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس سے شادی کرنے کے بہت سے امیدوار تھے، صرف اس کی نوعمری

کی وجہ سے سب نے اس کی کوشش ملتوی کر رکھی تھی۔ اتفاق سے کوروک موت، جس کی پراسکو دیا کے ناہنال کے قریب کچھ زمین بھی تھی ملازمت سے چند مہینوں کی رخصت لے کر اپنے گاؤ آیا۔ پراسکو دیا کے ورثے کی خبر سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اس کی عمر کا لحاظ کیے بغیر اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ وہ آدمی بہت ہوشیار اور تجربہ کار تھا، دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اس نے پراسکو دیا کی نانی کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ وہ اس سے پراسکو دیا کا نکاح کرنے پر آمادہ ہو گئیں اور کورو دیوت کو ستیان میخانلو دپج اور ان کے خاندان سے رضامندی لینے لگے۔ بے ان کے گانو بھیجا۔ ستیان میخانلو دپج کی بیوی اور لڑکیوں کو کورو دیوت بہت پسند آیا، لیکن ستیان میخانلو دپج کو صدمہ دیکھتے ہی اس سے نفرت ہو گئی اور اس کا انھوں نے بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیا۔ ان کی بیوی اور لڑکیوں نے سمجھ لیا کہ وہ اسے اپنا بہنوئی بنانے پر کبھی راضی نہ ہوں گے، لیکن ان کی ضد میں اور کچھ اس لیے کہ کورو دیوت انھیں واقعی بہت معقول آدمی معلوم ہوتا تھا انھوں نے پراسکو دیا کی نانی سے مل کر سازش کی اور چند مہینے بعد جب ستیان میخانلو دپج کسی ضرورت سے ماسکو چلے گئے تو انھوں نے پراسکو دیا کا کورو دیوت سے نکاح کر دیا۔ پراسکو دیا بہت سیدھی ساری نیک دل لڑکی تھی اور پہلے پہل کورو دیوت کا اس کے ساتھ سلوک بھی اتنا اچھا تھا کہ اسے اس سے گہری محبت ہو گئی۔ مگر کچھ سال بعد کورو دیوت کا چال چلن بالکل بگڑ گیا، اس لیے پراسکو دیا

کے لیے اس نے ایک گائوں میں بہت عالی شان مکان بنا دیا جہاں وہ
بیچاری اکیلی پڑی رہتی تھی اور خود دوسرے گائوں میں عیاشی شراب خواری
میں مصروف رہتا تھا۔ رعایا اس کے ظلم سے تالاں تھی، جان پہچان کے
لوگ اس کی ساری بدکاریوں سے واقف تھے، مگر پراسکو و یا کو اس کی
طرف سے کچھ ایسا حسن ظن ہو گیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننا
گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کار اس کی نوبت آئی کہ اسے بھی شک ہو گیا اور
اپنے شوہر کو اطلاع دیے بغیر وہ اس گائوں میں پہنچ گئی جہاں وہ رہتا تھا
وہاں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں، وہ چاہتی تھی کہ کورنلیو
کو منظم کے عہدے سے معزول کر دے لیکن کورنلیو نے اسے ایک تہ خانے
میں بند کر دیا اور ستیان میخائلووچ اس حادثے کی خبر سن کر وقت پر پہنچ
ن گئے ہوتے تو غالباً وہ وہیں بھوکوں مر جاتی۔ ستیان میخائلووچ اسے
چھڑالائے اور چند دن کے بعد ہی خبر ملی کہ کورنلیو مر گیا۔

الکسی ستیانووچ کی شادی کا قصہ اس سے بہت زیادہ لمبی ہے
اور ستیان میخائلووچ کی شخصیت کا ایک پہلو دکھانا ہی جو حقیقت
حیرت انگیز ہے۔ الکسی ستیانووچ کچھ سال قوج میں ملازم رہنے کے
بعد شہر اوف میں وکالت کرنے لگا۔ یہاں وہ سوفیا نکولا ئفنے، تائب
گورنر صوبہ اورل برگ کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ اس کا عشق نہایت عرا
لہ اکسا کوف کے والد، جن کا شروع میں ذکر آیا تھا۔ ستیان میخائلووچ کی
بہو انھیں کی بیوی اور اکسا کوف کی ماں تھیں۔

قسم کا تھا، یہ ایک دل کی بیماری تھی، جس نے اسے دُبلّا اور کم زور اور زندگی سے بے پروا کر دیا۔ سوفیا نکو لائفنہ بہت ہی مہذب تعلیم یافتہ اور لائق تھی، روس کے اکثر ادبی مشاہیر سے اس کی واقفیت تھی اور سب اُس کا ادب کرتے تھے، خود شہزادوں میں کوئی خاتون حسن اور ذہانت اور سلیقے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کا اور الکسی ستیپا نوویچ کا، جو ایک معمولی زمیندار کا لڑکا تھا کوئی جوڑ نہ تھا اور اس کے علاوہ الکسی ستیپا نوویچ ایسا جھپو، بزدل اور کمزور طبیعت کا تھا کہ شادی کا پیغام دینے کی نوبت آنا بھی مشکل تھا۔ لیکن الکسی ستیپا نوویچ دل کے ہاتھوں ایسا مجبور ہوا کہ شادی کے سوا اسے جان بچانے کی کوئی اور صورت ہی نظر نہیں آئی، وہ پیغام دینے پر تُل گیا۔ اُس نے ایک خاتون کے ذریعہ سے جس سے اس کی کچھ غزیرہاری تھی سوفیا نکو لائفنہ کی رائے معلوم کی اور اس سے اُس کی اُمیدیں بہت بڑھ گئیں۔ سوفیا نکو لائفنہ مردم شناس تھی لگو الکسی ستیپا نوویچ سُرلا آدمی تھا اور اس میں یہ مادہ نہیں تھا کہ کسی مجمع پر رعب جمائے مگر وہ دل کا بڑا اچھا اور بہت مخلص تھا، اور سوفیا نکو لائفنہ نے اس کے یہ اوصاف پہچان لیے اور اس کی قدر کرنے لگی۔ دشواریاں بہت تھیں، لیکن سوفیا نکو لائفنہ کی رائے معلوم کرنے کے بعد الکسی میخائیلوویچ کو کچھ کچھ امیدیں دہی اور وہ اس مسئلے پر اپنے خاندان کی رائے لینے کو گھر آیا۔ گھر پر اس کی بہنوں نے سب حال دریافت کر لیا تھا۔ انھیں

سوفیا نکو لائفنہ سے لٹی بغض ہو گیا تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ حسین شائستہ اور ہوشیار تھی اور اسے دے کی ایسی مضبوطی تھی کہ اس کے سامنے کسی کی دال گلنا ممکن نہیں تھا۔ بہنیں اپنے بھائی پر قبضہ رکھنا چاہتی تھیں اور ستیاپان میخانکو وچ کے خیال میں بھی ایک معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے زمیندار اور ایک شائستہ شہری خاتون کا بٹا ہوا اس قدر دشوار تھا کہ انہوں نے بھی اپنے بیٹے کو یہ خیال چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ سب کی مخالفت کا بیچارے الکسی ستیاپان وچ پر ایسا اثر پڑا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑ گیا اور موت کے منہ سے بال بال بچا آخر کار جب وہ اچھا ہو کر شہر آؤں والی ہوئی تو اس کے خاندان کا خیال تھا کہ وہ سوفیا نکو لائفنہ کو بائبل بھول گیا ہو مگر وہاں پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی اس نے گھر والوں کو یہ دھمکی لکھ بھیجی کہ اگر سوفیا نکو لائفنہ سے شادی نہ ہوئی تو میں خود کشی کر لوں گلہ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کا بے اولاد مرنا گویا خاندان کا خاتمہ تھا، اس لیے ستیاپان میخانکو وچ نے مجبوراً سوفیا نکو لائفنہ کے نام پیغام بھیج دیا اور دونوں کی کچھ عرصہ بعد شادی ہو گئی۔

سوفیا نکو لائفنہ اور ستیاپان میخانکو وچ ”خاندانی دستان“ کے بہترین کیرکٹر ہیں اور وہ حصہ جہاں ان دونوں طبعیتوں کا خود بخود ملنا، ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا دکھایا گیا ہے کہ

انشاپردازی اور کیرکٹر کی مصوری کا کرشمہ ہو۔ ستیپان میناٹکو وچ نے اپنی وضع نہیں چھوڑی، سوفیا نکو لائفنے نے اپنی شائستگی سے ہاتھ نہیں دھویا، اس کی ماس اور نندیں شروع سے آخر تک اس سے نفرت کرتی رہیں اور الکسی ستیپانو وچ نے دنیا داری نہیں سیکھی، لیکن سوفیا نکو لائفنے کے سہیلے اور ستیپان میناٹکو وچ کی محبت سب برداشت کر لے گئی، خاندان میں امن قائم رہا اور ایک پوتے کی پیدائش نے بوڑھے دادا کی پڑانی آرزو پوری کر کے سوفیا نکو لائفنے سے ان کی محبت اور گہری کردی۔

وہ خاندانی داستان ”کافکے ستیپان میناٹکو وچ کے پوتے مرگے کی کی پیدائش پر ختم ہو جاتا ہے اور مصنف اپنے خاندان سے رخصت ہوتا ہے۔“
 ”الوداع میرے روشن اور تاریک پیکر، میرے اچھے اور بُرے لوگو!..... تم بڑے سوراہنیں تھے، نہ ایسی شخصیت کے مالک جس کی شہرت کا نقارہ بجتا ہو؛ خاموشی اور گم نامی میں تم نے اپنی زندگی بسر کی اور ایک زمانہ گزرا کہ تم دنیا سے سفر کر چکے ہو۔ لیکن تم انسان تھے۔ تمھاری جسمانی اور روحانی زندگی شاعری سے لبریز ہے، جو ہمارے لیے اتنی ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے جتنی ہماری ذات اور ہماری زندگی آئندہ نسلوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز ہوگی۔ اور انسانوں کی طرح تم بھی اس دنیا کے عظیم الشان میدانِ عمل میں اپنا کام کر گئے..... اس ڈراما میں تم نے بھی صدقِ دل سے اپنا پارٹ گایا اور تمھاری

یادگار بھی زندہ رکھے چلے کی مستحق ہو.... تمھاری اولاد ہمدردی سے
 تمھارا ذکر کرتی ہو تمھیں اپنے عزیز پر اپنے بزرگ سمجھتی ہو تمھارا زمانہ، طرز
 معاشرت اور لباس خواہ کچھ بھی رہا ہو خدا کرے تمھاری یادگار کی
 کبھی متعصبانہ رائے ایگستاخانہ الفاظ سے توہین نہ کی جائے۔“

تیسرا باب گرگور، دیچ، پچم سکی، گونچروفت

گوگول کی تصانیف نے روسی ناول نویسی کو ایک خاص ڈھڑے پر لگا دیا، اور گوہ خود ”یورپ دوست“ اور ”سلاو دوست“ فرقہ بندی سے علیحدہ تھا، اور اسے نہ روسی قوم کا نقاد کہہ سکتے ہیں نہ وکیل، لیکن اس سے بعد کے ناول نویس میں اس بنا پر امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ روسی قوم کے نقاد گرگور، دیچ، پچم سکی، گونچروفت، تورگنیف اور سال تکوف ہیں اور اس کے وکیل اکساکوف، دستہ نعت سکی، لسکوف اور تالستانی۔ دونوں طرز کے ناول نویسوں حقیقت نگار اور نکتہ چیں تھے، لیکن ”یورپ دوست“ ناول نویس اپنی قوم اور اس کے طرز معاشرت اور خیالات کی خامیاں اور برائیاں دکھا کر رہ جاتے ہیں، ”سلاو دوست“ اپنے مشاہدے سے نتیجے نکالتے ہیں، اپنی قوم کی تمام خامیوں کو تسلیم کر کے ان کی توجیہ کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ایک فلسفہ حیات تعمیر کریں، ایک قومی نصب العین قائم کریں جو روسی فطرت سے مناسبت رکھتا ہو وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ روسی قوم اپنی زندگی کی تشکیل اور اعلیٰ

اصولوں کی پیروی کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔

روسی قوم کے نقاد اس خیال پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ روسیوں نے یورپ کی تقلید صحیح طریقے پر نہیں کی ہو اور ان کی فلاح کی صورت یہی ہو کہ زندگی کے گریورپ سے سیکھیں۔ روسیوں کے وکیل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ روسی قوم نے یورپ کی تقلید کر کے اپنی عزت اور خود داری کھودی ہو اور اس کی ساری مصیبتیں اسی جرم کی سزا ہیں۔ وہ راہ راست پر اسی وقت آئے گی اور اپنی مصیبتوں سے اسی وقت نجات پائیں گی جب وہ اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جائے اور اپنی قوت اس مقصد عالی کے حاصل کرنے میں صرف کرے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہو دونوں طرز کے ناول نویسوں میں ٹوک جھونک ہوتی رہی اور چونکہ ادب کے سوا اور کوئی میدان نہ تھا جس میں مختلف عقائد کے لوگ اپنے دل کا بخار نکال سکیں، اس لیے ناول نویسوں میں نہیں تو ان کے پیرووں میں یہ مخالفت اکثر عداوت کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن ہمیں کسی فریق کی طرف داری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر خالص ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بحث ایسی ہو بھی نہیں جس میں طرف داری کی گنجائش ہو۔

دمیتری ویسیلی پوچ گرگیورویچ (۱۸۲۲-۱۹۰۰) مصور اور انشا پرداز تھا۔ اس نے اور دستہ نعت سنی نے ایک ہی انجینئرنگ کالج میں تعلیم پائی۔ یہ پہلا ناول نویس تھا جس نے تعلیم یافتہ روسیوں کو کسانوں کے حالات سے آگاہ کیا اور اس تحریک کو بہت تقویت پہنچائی جس کا

مقصد کسانوں کو آزاد کرنا تھا۔ اس کے سب سے پہلے ناول "ارگن وائے" میں پیٹر برگ کے غریبوں کی زندگی کی نہایت پُر درو تصویر تھی اور اس ناول سے گرگیو رووچ کی خاصی شہرت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ کچھ سال دیہات میں رہا اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک ہر دوسرے تیسرے سال ایک ناول شائع کرتا رہا۔ "گائو" (۱۸۴۶ء) ایک خاتون کا قصہ ہے جو کسانوں کی شادی کا مناشا دیکھنا چاہتی ہیں اور ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک کسان کی لڑکی ایک نوجوان سے بیاہ دی جاتی ہے، لڑکی اور لڑکا دونوں شادی پر راضی نہیں تھے، ان کے اپنے ارادے، اپنی آرزوئیں تھیں جنہیں اس جابرانہ حرکت نے خاک میں ملا دیا اور ان بیچاروں کی زندگی برباد ہو گئی۔ "بد نصیب آن تون" (۱۸۴۸ء) بھی اس قسم کے ظلم و جبر کا قصہ ہے اور اسی دل گداز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ "شمیدون کی دادی" (۱۸۵۰ء) "ماہی گیر" (۱۸۵۳ء) اور "نوآباد" میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کا ظلم اور فطرت اور آب و ہوا کی بے دردی، چلتی کے پاٹ بن کر بکس کسانوں اور انہیں جیسے غریب اور مظلوم مزدوروں اور ادنیٰ درجے کے پیشہ ورین کو کس طرح پریشان کرتے ہیں ۱۸۵۵ء کے بعد گرگیو رووچ نے صرف دو ناول اور ایک آپ بیتی لکھی اور باقی وقت مصوری میں صرف کیا۔ لیکن ۱۸۵۵ء

۱۸۶۱ء تک کسان زمیندار کی ملکیت تھے اور زمیندار کو ان پر ہر طرح کا اختیار تھا سوائے قتل۔ نئے یورپ میں بھیک مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ فقیر ایک بڑا ارگن باجا شڑک پر کھڑے ہو کر بجاتے ہیں اور پھر راہ گھروں سے اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

تک کی تصانیف سے اس کا اصلاحی مقصد پورا ہو گیا تھا اور اس نے روسی قوم کے ضمیر کو اس حد تک بیدار اور زود جس کر دیا تھا کہ کسانوں کو آزاد کرنے کی خواہش عام ہو گئی۔

کچھ نقاد ایسے ہیں جو گرگور ووج کو روس کے بہترین ناول نویسوں میں گنتے ہیں اور تالستائی اور تورگنیف کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس رائے میں بہت سی سیاسی اور معاشرتی اغراض شامل ہیں، جنہیں صحیح ذوق ادب سے کوئی واسطہ نہیں، گرگور ووج کے ناولوں میں جذبات پرستی بہت ہی، کسانوں اور مزدوروں کی سیرت کا اس نے جو نقشہ کھینچا ہو وہ صحیح نہیں اور جو جذبات اور جو صلے اس نے اپنے قتلوں کے اشخاص میں دکھائے ہیں وہ دیہاتی زندگی کی اصلیت سے دور ہیں۔ گرگور ووج کے قصوں کی ترتیب اور اس کا طرز بیان بھی کسی خاص تعریف کا مستحق نہیں، لیکن اس نے ناول نویسی کے ایک خاص میدان میں ہر اول کی خدمت انجام دی ہو اور ہر اولوں کی فنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنے میں ہمیشہ رعایت سے کام لینا چاہیے۔

گرگور ووج کے بعد عوام کی زندگی ناول نویسی کا ایک مستقل موضوع بن گئی اور حقیقت نگاری کی سب سے ہیبت ناک شکل انہیں ناول نویسوں کی تصانیف میں دکھائی دیتی ہو جنہوں نے عوام کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا، بی سم سکی، پومیا لوف سکی، رے شت نی کوف اور یوی توف الک سے فی نے او فی لاکتو وچ بی سم سکی (۱۸۸۱-۱۸۲۰) ایک

مفلوک احوال شریف خاندان کا آدمی تھا۔ وہ بہت ذہین تھا مگر بالکل بے اصول اور انشا پر داری اس نے پیٹ پانے کے لیے اختیار کی تھی۔ اس کے پہلے ناول کی اشاعت دفتر احتساب نے نامنتظر کی مگر اس کے بعد کافانہ ”ایک مہل آدمی“ (۱۸۵۵) بہت مقبول ہوا، ۱۸۵۸ میں اس کا ناول ”ہزار روہیں“ جو اس کا کارنامہ ہے، شائع ہوا۔ اس ناول میں روس کی قصبائی زندگی کا تاریک پہلو دکھا گیا ہے اور اس کا ہیرو ایک شخص ہے جو کامیابی کا پرستار ہے اور اس پر اپنی اور دوسروں کی عزت آبرو نہایت خوشی سے قربان کر دیتا ہے۔ یہ ایک غریب لڑکی فاسٹیا کو جو اس سے محبت کرتی ہے چھوڑ کر صوبے کے گدز کی مدخل سے روپے کے لالچ میں نکاح کر لیتا ہے اور اس کی ساری زندگی جھوٹ، فریب اور دغا بازی کا نفرت انگیز سلسلہ بن جاتی ہے۔ آخر میں اس کا ضمیر اسے کچھ ستاتا ہے اور وہ ناسیا سے شادی کر کے اپنا حرام کا مال نیک کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس کی زندگی اور اس ماحول کو جس میں ایسی زندگی ممکن ہے، دیکھ کر پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ روس بھلے مانسوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ ”ہزار روہیں“ کے بعد پی سم سکی روسی کسانوں کی زندگی کے متعلق افسانے لکھتا رہا اور ان سب میں بھی انسانی فطرت اور خصوصاً روسی سرشت کی طرف سے وہی تعصب ظاہر ہوتا ہے جو نہراہوں میں۔ اس قدر نمایاں ہے۔ پی سم سکی کے نزدیک انسان کے عمل کے صرف دو محرک ہیں، لالچ اور شہوت اور اس کے افسانے اور ناول سب اسی

دعوے کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ قابل اعتراض ضرور ہے، مگر اس کی وجہ سے بی سم سکی کی حقیقت نگاری پر کوئی حرج نہیں آتا، بلکہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کے کیرکٹر گرگیور و وچ کے مقابلے میں اہلیت سے زیادہ قریب ہیں اور وہ مصور بھی بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ بی سم سکی نے ایک ڈراما ”پھوٹی تغدیر“ بھی لکھا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محض اس قانون کی وجہ سے جو ایک انسان کو دوسروں پر ناجائز حقوق دے دیتا ہے اچھے خاصے نیک دل آدمی کیسے بد ہو جاتے ہیں اور ان کے اخلاق کس قدر بگڑ جاتے ہیں۔

بی سم سکی کے بعد اس رنگ کی حقیقت نگاری کا فرض پومیا لوف سکی

(۱۸۳۵-۱۸۶۳) رے شت نی کوف (۱۸۴۱-۱۸۷۱) اور

لے وی ٹوف (۱۸۴۲-۱۸۷۷) نے ادا کیا۔ یہ حقیقت نگاری فرض اس لحاظ سے تھی کہ روسی زندگی کے واقعی بہت سے تاریک پہلو تھے اور روشن خیال روسیوں پر لازم تھا کہ ان سے خود واقفیت حاصل کریں اور دوسروں کو آگاہ کریں۔ پومیا لوف سکی اور رے شت نی کوف دونوں دیہاتی پادریوں کے لڑکے تھے اور ان کی آواز سب سے پہلے ان تعلیم گاہوں اور مدرسوں کے خلاف بلند ہوئی جن میں پادریوں کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ ان تعلیم گاہوں کے مدرس عموماً کٹر باپ اور آوارہ مزاج ہوتے تھے، ان کی معلومات اس قدر محدود ہوتی تھیں کہ وہ

یعنی وہ قانون جس کے رو سے کسان زمیندار کی ملکیت بنا دیے گئے تھے۔

کسی طرح معلیٰ کے اہل نہیں تھے، ان کے نزدیک تعلیم کے معنی بس یہ تھے کہ چند کتابیں زبانی یاد کر لی جائیں۔ طالب علموں پر ہر قسم کی بیجا سمسیر کی جاتی تھیں، اور ذرا اور اسی بات پر ان کے کوڑے لگائے جاتے تھے۔ پادریوں کی تعلیم گاہوں کی ظالمانہ سزائیں برداشت کرنے کے ساتھ ہی ان دونوں ناول نویسوں نے افلاس، فاقہ کشی اور سردی کی سختیاں بھی بہت جھیلیں اور اپنی اور پرانی مصیبتیں ان دونوں کی اکثر تصانیف کا موضوع ہیں۔ پومیا کوٹ سکی کے مشہور ناول دو ہیں، ”دنیا داروں کا سکھ“ اور ”مولو کوٹ“ جن میں اس نے ان غریبوں کی ذہنیت دکھائی ہے جو معاشرتی نظام کی نا انصافی محسوس کرتے ہیں، اسے درہم برہم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، مگر ہمت ہار کر یا تو چین سے دن گزارنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں یا ایسے بیزار ہو جاتے ہیں کہ ایذا رسانی کے سوا انہیں اور کوئی شغل پسند نہیں آتا۔ مگر رے شت نی کوٹ کے کیرکٹر اس احساس سے بھی محروم ہیں۔ جس صوبہ میں رے شت نی کوٹ کی ولادت اور پرورش ہوئی وہ یورپی روس میں شامل تھا، مگر وہاں کے رہنے والے نیم وحشی تھے اور ہرگز اس لائن نہ تھے کہ انسان کہلائیں۔ رے شت نی کوٹ نے ”اہل پودلی پودا“ کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جس میں ان لوگوں کی معاشرت اور ذہنیت بیان کی ہے اور اس ناول کو پڑھ کر واقعی رونا آتا ہے۔ یہ لوگ تو بھر بھی نیم وحشی تھے۔ ”حفرات گلو موٹ“ جس میں کوہ اورال کی کانوں کے مزدوروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور بھی

زیادہ دردناک ہی اس میں وہ مصیبتیں جن کا ہر غریب کو جو روٹی کا محتاج ہو سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ظلم جو انسان اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار پا کر دوسروں پر کرتے ہیں اور بھی زیادہ بھیانک شکل میں نظر آتا ہے۔

”اجنبی لوگوں“ میں رے شت نی کوف نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے اور اس کی داستان بھی بے انتہا پروردہ ہے۔ پادریوں کے ہیکول میں اس نے ایک ہی دن میں دو دو بار کوڑے کھائے، اسکول چھوڑ کر بھاگ گیا، فاقہ کشی کی، ایسے رہبانوں کی صحبت میں رہا جو رات کو خافیا سے چھپ کر نکل جاتے تھے اور آوارہ عورتوں کے یہاں دن بھر کی عبادت کی تلاقی کرتے تھے۔ تعلیم ختم کرنے پر اسے نوکری ملی، مگر اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ پیٹ بھرنے اور تن بدن ڈھکنے کو بھی کافی نہ ہونی تھی۔ آخر عمر تک رے شت نی کوف کی حالت یہی رہی شہر کی زندگی بھی اسے دیہات سے کسی طرح بہتر نہ معلوم ہوئی اور اپنے دو آخری ناولوں میں اس نے شہر کے غریبوں کا حال سنایا ہے۔ رے شت نی کوف کی ”کھری بات“ ضرب المثل ہے اور یہ کھری بات وہ اپنے خاص انداز سے کہتا ہے۔ اس کے ناولوں میں ہیرو نہیں ہوتے، صرف انسانوں کے گروہ ہوتے ہیں جن میں سب لوگ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتے ہیں کسی کو کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں ہونا اور مختلف افراد کی صورتیں اور سیرتیں بہت مشکل سے اور رفتہ رفتہ پہچانی جاتی ہیں اسے انسان کی ذات سے زیادہ اس فنا سے سروکار ہے جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے ناولوں میں شروع سے آخر تک

درہل بھی فضا دھسپی کا مرکز ہوتی ہے۔ رے شت نی کوٹ کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ روس کے ذور افتادہ صوبوں، قصبوں اور شہروں میں یہ فضا لوگوں کی ہمت کس طرح پست کر دیتی ہے، وہ اپنی انسانیت محفوظ رکھنے کے لیے کیوں کر ہاتھ پیر مارتے ہیں اور آخر میں بھوک یا شراب انہیں کیسے تباہ کر دیتی ہے۔ رے شت نی کوٹ کی مصوری کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ آدمیوں کا بھوک سے ایڑیاں رگڑ کر مرنا دکھلاتا ہے یا ان کا شہر آخواری کی عادت میں اس طرح مبتلا ہو جاتا کہ ان کی قوت ارادہ بالکل معطل ہو جاتی ہے۔ لے دی توٹ، پولسیا لوٹ سکی اور رے شت نی کوٹ کی طرح پادریوں کے خاندان سے تو نہیں تھا، لیکن اس نے بھی غربت اور افلاس کی انتہائی مصیبتیں جھیلیں اور اس کی عمر کا زیادہ تر حصہ غریبوں کی صحبت میں گزرا۔ شہر کے غریبوں کے حالات اس نے اپنے دو آخری ناولوں میں بیان کیے ہیں، اور اس کے شہری غنڈوں کے کیرکٹر ایسے ہیں کہ ناول میں ان کا حال پڑھ کر بھی سہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر لے دی توٹ کا کارنامہ اس کا پہلا ناول ہے، جس میں اس نے اپنے وطن کے مناظر اور اپنی بچپن کی زندگی کا قلعہ سنایا ہے۔

حقیقت نگاری کا وہ طرز جو ان تینوں ناول نویسیوں نے اختیار کیا، روشن خیال روسیوں کے ضمیر کو سیدار کرنے کے لیے بہت ضروری تھا لیکن برج پوچیجیہ تو یہ ایک بزدلی تھی جس میں پہنچ کر باہر نکلتا دشوار ہو گیا ناول نویسی کا ایک مقصد یہ ضرور ہے کہ انسان کو عام زندگی سے واقف

اور وابستہ رکھے، کیوں کہ اس کے بغیر تہذیب میں اصلیت اور اخلاقی معیار میں صحت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر وہ ناول نویس جو اپنا مقصد صرف اصلی حالات بیان کر دینے تک محدود رکھے آرٹ کے اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا اور خواہ وہ انشا پر دازی میں کتنا ہی کمال دکھائے اس کی تصانیف کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو ایک سرکاری رپوٹ کی۔ پوسیا لوٹ سکی، رے رشت فی کوف اور لے وی توف کے ناول انشا پر دازی کے بہت اچھے نمونے ہیں، لیکن ناول نویسی میں ان کا رتبہ بلند نہیں، کیوں کہ وہ دکھاتے بہت کچھ ہیں، سمجھاتے کچھ بھی نہیں، ضمیر کو بے چین کر دیتے ہیں مگر نہ ذہن کو روشن کرتے ہیں نہ دل میں حوصلے پیدا کرتے ہیں عوام کی زندگی، جو روسی تہذیب کے ماتھے پر کلنگ کے ٹپکے سے کم نہ تھی، لے وی توف کی تصانیف کے بعد پھر صدی کے آخر میں میکیم گورکی کناو لوں میں نظر آتی ہے اس درمیان میں لوگوں کی توجہ دوسرے مسائل کی طرف منتقل ہو گئی تھی، ناول نویسوں نے خوش حال اور تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت، ان کی کوششوں اور کوششوں کے انجام کو اپنا موضوع بنالیا تھا۔

اوان الک سے پروج گو پخروف (۱۸۱۴-۱۸۹۱)

گو پخروف دولت مند زمینداروں کے گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کی ساری زندگی آسائش اور آرام سے گزری۔ انشا پر دازی کا سلسلہ اس نے ۱۸۴۷ء میں "ایک روزمرہ کی کہانی سے" شروع کیا۔ اس کے دوسرے سال ایک ناول "آوب لوموف" کے پہلے چند باب ایک اخبار

میں نکلے، مگر یہ ناول ختم دس سال کے بعد ہوا۔ اس عرصے میں گوپچر دت نے ایک جہاز پر دنیا کا سفر کیا اور اپنے سفر کے حالات جہاز ”پے لیس“ کے عثمان سے شائع کیے۔ اس کی بقیہ عمر کی ادبی کارگزاری کل دو تصانیف ہیں، ایک ناول ”دریا کے اونچے کنارے پر“ اور ایک اس کی مولا آپ بیتی۔

”روزمرہ کی کہانی“ ایک روسی نوجوان کا قصہ ہے۔ اس کے پیش نظر زندگی کے دو طریقے ہیں جن میں سے ایک اسے انتخاب کرنا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک غریب مگر نہایت زندہ دل، محبت کیش اور بلند حوصلہ لڑکی سے شادی کرے اور اس کی محبت اور فراقت کو اپنی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بنائے، دوسرا یہ کہ وہ ایک امیر مگر نکلی لڑکی کا شوہر بن کر عین سے زندگی گزارے۔ نوجوان امیر لڑکی کا انتخاب کرتا ہے۔ اس سے گوپچر دت کو یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اعلیٰ مقاصد کا ادنیٰ دنیاوی اغراض پر قربان ہونا، انسانیت کا حیوانی عیش و آرام کے بدلے فروخت ہونا روس میں ایک روزمرہ کی کہانی ہو۔ ”دریا کے اونچے کنارے پر“ تالستانی کے ناول ”جنگ اور امن“ کی طرح روسی زندگی کی تصویر بہت بڑے پیمانے پر کھینچنے کی کوشش ہے، مگر گوپچر دت اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا اور یہ ناول ناکامیاب رہا۔ اس کا اصل کارنامہ ادب لوسوف ہے اور اسی کی بنا پر وہ روس کے سب سے بڑے ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس ناول میں گوپجروف نے اپنے ہیرو اوب لوموف، ایک تپسیہ کے خوش حال زمیندار کی شکل میں جمود اور کاہلی کا ایک مجسمہ پیش کیا ہے جو روسی سرشت کیا نوع انسان کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اوب لوموف نہایت نیک، سیدھا ساد آدمی ہے جو کسی کی نسبت بڑے خیال بھی اپنے دل میں نہیں آنے دیتا، اس کی استعداد بہت اچھی ہے، موسیقی میں ستھرا مذاق رکھتا ہے، اسے انشا پر داری کا شوق ہے اور جب کبھی مجبور ہوتا ہے تو تقریر بھی بہت اچھی کر لیتا ہے، اس کی صورت اور طور طریق سے شرافت ٹپکتی ہے، دوسروں کا غم اسے بے چین کر دیتا ہے، اسے دل سے یہ رزد ہے کہ دنیا سے درد اور تکلیف کو سٹا دے اور اپنی انسانی ہمدردی ثابت کرنے کے لیے وہ بہت دنوں سے سوچ رہا ہے کہ اپنے کسانوں کو آزاد کر دے لیکن ان تمام خیروں کے ساتھ اس میں ایک عیب ہے جو ان سب پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ عیب اس کی کاہلی ہے جو اس کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہے کہ اس کی شخصیت کو کسی طرح ابھرنے نہیں دیتی اور وہ ذہنی اور اخلاقی سرمایہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں کام آسکتا تھا بڑے افوس ناک طریقے پر ضائع ہوتا ہے۔ اوب لوموف کا دل کچھ بھی کہتا ہو اور کچھ بھی چاہتا ہو، اس کی کاہلی نے اسے جو منطق سکھائی ہے وہ سب کچھ رد کر دیتی ہے اور جو مسئلہ درپیش ہو، خواہ ملنگ سے اٹھنا یا کسانوں کو آزاد کرنا، اوب لوموف اس کے ہر پہلو پر غور کرنے میں، اس کی اونچ نیچ سوچنے میں رہ جاتا ہے اور عمل تو ایک طرف ارادہ کرنا بھی اس کے بے

ایک ہم بن جاتی ہے جو کبھی سر نہیں ہوتی۔

ناول کے پہلے حصے میں گوپخرد نے اوب لوموف کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے اور اس کی زندگی کے ایک دن کی سرگزشت سنائی ہے۔ اوب لوموف کی صورت شکل اچھی ہے، مگر کوئی خاص بات نہیں جو قابل ذکر ہو۔ قلباً ہی جسم ذرا بھاری، آنکھوں سے نیکی ٹپکتی ہے جو قریب قریب معصومیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے میں نرمی ہے اور انتہائی سکون کی ایک کیفیت جو ہر وقت قائم رہتی ہے، کیوں کہ وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتا اور اس لیے نہ تھکتا ہے نہ اس کی طبیعت اُکتاتی ہے۔ اس کا ”شغل“ لٹے رہنا ہے۔ لٹے رہنا اوب لوموف کے لیے نہ تو ضروری تھا، جیسے مریض کے لیے، یا اس شخص کے لیے ہوتا ہے جو سونا چاہتا ہے، نہ اتفاق کی بات تھی، جیسے اس شخص کا لینا جو تھک گیا ہو، نہ لطف حاصل کرنے کا ذریعہ، جیسے کالوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا معمول ہی یہ تھا کہ لیٹا رہے۔ جس دن کا ذکر ہے ”وہ بہت سویرے جاگ اٹھا یعنی آٹھ بجے، یہ اس کی عادت کے خلاف تھا۔ کسی وجہ سے وہ بہت متفکر تھا، اس کے چہرے پر وقتاً فوقتاً ایک کیفیت ظاہر ہوتی تھی جو نہ بالکل خوف کی تھی اور نہ بالکل یاکو یا پریشانی کی، معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں ایک قسم کی جنگ جاری ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے عقل بھی موقع پر پہنچ نہیں پاتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کل اوب لوموف کے پاس اس کے گانو کے کھیا کا ایک

خط آیا تھا جس میں ناگوار خبریں تھیں۔ لکھیا جو ناگوار خبریں سنا سکتا ہو وہ ظاہر ہیں، فعل خراب ہوئی، کسان لگان ادا کرنے میں سستی کر رہے ہیں آمدنی کم ہوگی۔ اس خط کا ادب لوموت پر بہت اثر ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کرنا ناگزیر ہے۔ ”آنکھ کھلتے ہی اس نے ارادہ کیا کہ فوراً اٹھ بیٹھوں گا ہاتھ منہ دھو کر چائے پینے سے پہلے خوب غور کروں گا کوئی تدبیر سوچوں گا، لکھیا کو خط لکھ بھیجوں گا اور اس معاملے میں جیسی چاہیے سرگرمی دکھاؤں گا۔ مگر وہ آدھ گھنٹے تک پڑا رہا، اور اپنے اس ارادے کی وجہ سے پریشان ہوتا رہا، پھر اس نے طی کیا کہ چائے کے بعد بھی اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ اور چائے حسب معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے پی جاسکتی ہے اور لیٹے لیٹے غور کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں... ساڑھے نو بج گئے ادب لوموت چونکا۔ اس نے پریشان ہو کر زور سے کہا ”یہ میں آخر کیا کر رہا ہوں؟ آخر انسان میں کچھ غیرت بھی تو ہونی چاہیے۔ اب کام میں جُٹ جانے کا وقت آ گیا ہے! جہاں طبیعت کو ذرا ڈھیل دی اور پناہ... اس نے اپنے نوکر کو پکارا ”زخار!“ جب تک زخار پہنچے پہنچے ادب لوموت پھر خیالات میں ڈوب گیا اور زخار کے آنے کی اسے بہت دیر تک خبر ہی نہ ہوئی، زخار اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ آخر کار وہ کھانا لیا۔ ادب لوموت نے پوچھا ”کیا ہے؟“

”آپ ہی نے تو بلایا تھا۔“

ادب لوموت نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا:

”بلایا تھا؟ ہاں، آخر میں نے کس لیے بلایا تھا؟ کچھ یاد نہیں! آخر ابھی تو تم جاؤ، پھر شاید مجھے یاد آجائے“ زخار چلا گیا اور ادب لوموف لیٹا لیٹا اس کجخت خط کے بارے میں سوچتا رہا، یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ ادب لوموف کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی، وہ بار بار چونک اٹھتا ہی، زخار کو بلاتا ہی، کبھی خط کے لیے، کبھی رومال تلاش کرنے کو، کبھی اس سے کہتا ہی منہ دھونے کا سامان تیار کرو۔ مگر ہر دفعہ انجام ہی ہوتا ہی کہ ادب لوموف پلنگ پر پھر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہی۔ زخار اس سے کہتا ہی اور اس سے پہلے کئی مرتبہ کہ چکا ہی کہ مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہی اور اس خبر سے ادب لوموف کو بہت پریشانی ہوتی ہی، مگر یہ محرک بھی اسے حرکت میں لانے کے لیے کافی نہیں۔ زخار اسے سمجھاتا ہی کہ مالک مکان کو خط لکھ کر نوٹس واپس لے لینے پر آمادہ کرے، ادب لوموف لکھنے کا وعدہ کرتا ہی، مگر اس وقت نہیں پھر کبھی۔ اسی گفتگو کے دوران میں دروازے کی گھنٹی بجتی ہی، دول کوف، ایک نوجوان جس سے ادب لوموف کی جان پہچان ہی، اس سے ملنے آیا ہی۔ دول کوف ان لوگوں میں سے ہی جو ملنے جلنے اور ناچ گانے کے شوقین ہوتے ہیں اور سارا دن ایک کے یہاں سے دوسرے کے یہاں اور وہاں سے تیسرے کے یہاں جانے میں اور گپ شپ کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ ادب لوموف کو اپنا نیا سوٹ دکھاتا ہی، اپنی خوشگوار مصروفیتوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہی اور خوشی سے کہتا ہی

کہ مجھے دن بھر میں دس جگہ مہمان ہونا پڑتا ہے۔ ادب لوموت یہ سُن کر تعجب سے بوجھتا ہے کہ اس بے فائدہ دوڑ دھوپ سے تمھاری طبیعت کیوں نہیں گھبرا جاتی اور جب وہ چلا جاتا ہے تو ادب لوموت لیٹے لیٹے سوچتا ہے:

”ایک دن میں دس جگہ، کیا بد قسمت آدمی ہے! اور اسی کا نام ہے زندگی!... پھر انسانیت آخر کیا شے ہے؟ یہ شخص خدا جانے کیوں اپنی ہستی کو پاش پاش کر کے بکھیر رہا ہے؟ کبھی کبھی ٹھٹھڑ میں جھانک لینے، کسی خوبصورت لید یا پر عاشق ہو جانے میں تو کوئی حرج نہیں... مگر ایک دن میں دس جگہ جانا! کیا بد قسمت آدمی ہے!“ ادب لوموت نے یہ کہہ کر کروٹ بدلی، پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور اس پر خوش ہوا کہ وہ ایسے فضول مشاغل اور خیالات نہیں رکھتا، دوڑ دھوپ نہیں کرتا، اطمینان سے لیٹا ہے اور نہ اس نے اپنا انسانی وقار کھو یا ہے اور نہ سکونِ قلب۔

دل کو ف کے بعد اور لوگ ادب لوموت سے ملنے آتے ہیں اور ہر شخص اسے اپنے اپنے طرز پر زندگی اور زندگی کی جدوجہد سے دلچسپی دلانا چاہتا ہے۔ ادب لوموت باتیں کرتا رہتا ہے، جہ سے پُر آواز ہوا اسے اپنی دونوں مصیبتوں کا حال سُنا تا ہے، یعنی کھیا کے خط کا اور مالک مکان کے نوٹس کا۔ مگر سب کچھ لیٹے لیٹے۔ لوگ آئے اور

لے اکثر لڑکیوں کا نام ہوتا ہے۔

چلے گئے اور وہ اسی طرح لیٹا ہوا۔ اس وقت تک اس نے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ زخار نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ادب لوموف کو کوچ پر سر کے نیچے ہاتھ رکھ لیٹا پایا۔ اس کے سامنے کتاب رکھی تھی۔ زخار نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے پوچھا ”یہ آپ پھر کیسے لیٹ گئے؟“ ادب لوموف نے ایک سانس میں جلدی سے کہا ”کام میں حرج نہ کرو۔ دیکھتے نہیں ہو میں پڑھ رہا ہوں۔“

زخار سے سمجھا چھڑانا مشکل تھا، اس نے جواب دیا ”اب منہ دھوئے اور خط لکھنے کا وقت آگیا ہے“ ادب لوموف نے کچھ چمکتا ہو کر کہا ”ہاں“ واقعی وقت آگیا ہے۔ اچھا ابھی تم ٹیڑھ میں ذرا غور کر رہا ہو۔ زخار کے اصرار کے باوجود ادب لوموف نے کتاب کا غمخ چھوڑا۔ پڑے پڑے زرد ہونے لگا تھا اس جگہ سے جہاں پچھلے ہینے میں چھوڑا تھا۔ آخر تک پڑھ لیا، پھر کتاب کو اس کے خاص مقام پر رکھ دیا، جما لیا اور اپنی دونوں مصیبتوں کے خیال میں جو اسے بہت تنگ کر رہی تھیں محو ہو گیا، لیکن اصل معاملے پر غور کرنے کے بجائے وہ اپنی طبیعت کو رنگین اور دل ربا خواب دکھا کر بہلانے لگا۔ یہ خواب کبھی ایک عائشہ مکان اور خوبصورت بارغ کے تھے، کبھی ایسی شاعرانہ دیہاتی زندگی کے جس کی رونق ایک حسین محبت کیش اور وفادار بیوی کی ذات سے بھی رہا پنج منٹ اونڈھالے لیٹنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کروٹ لے کر پھر پیٹھ کے بل لیٹ گیا، اس کا چہرہ ایک نازک دل کش جذبے سے چمک اٹھا،

وہ خوش اور مطمئن تھا مگر گھر کے پاس کسی کے چلا نے سے وہ پھر چونک پڑا۔ اٹھنے، انگڑائی لینے، جماہی لینے اور جوتا پہننے کے تمام مرحلے طے کر کے اس نے ناشتہ کیا، امور خاں داری، حساب، کتاب پر زخار سے کچھ بحث کی اور مالک مکان کو خط لکھنے بیٹھا۔ آدھا لکھ چکا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو جملوں میں ”جو“ اور ”کہ“ دوبار آگیا ہے، اس پر وہ ایسا شرمندہ اور پریشان ہوا کہ اس نے خط پھاڑ کر پھینک دیا، اتنے میں ڈاکٹر آیا اور اس نے ادب لوموف کی شکایتیں سن کر اسے مشورہ دیا کہ فوراً جرمنی یا فرانس کی کسی صحت گاہ کو چلے جاؤ، ورنہ دل پر چربی چھا جائے گی۔ ادب لوموف کی معصیتوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ مگر موت کا خوف بھی اس میں حسرتی نہ پیدا کر سکا، بلکہ اس نے چین سے لیٹے رہنے کی آرزو کو اور قوی کر دیا۔ زخار نے صلاح دی کہ سیر کیجیے، لوگوں سے ملے جلیے، ٹھنڈے میں جاتیے۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور جب مکان بدلنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے زخار کی زبان سے نکل گیا کہ ”اور سب“ بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں، تو ادب لوموف آپسے سے باہر ہو گیا۔

دو تیس ”اور سب“ کی طرح ٹھیرا! کیا میں روزی کی بنگلہ میں پھرتا ہوں؟ مزدوری کرتا ہوں؟ کیا میرے پاس کھانے کو کم ہے؟ کیا میں ایسا بلبلا ہوتا ہوں کہ ہڈی بلبلی کے سوا کچھ نہ ہو اور جو دیکھے اسے ترس آجائے؟ کیا میرے

پاس کسی چیز کی کمی ہو؛ میں ہمیشہ تو یہی سمجھتا رہا کہ میرے پاس کام کرنے کو لوگ موجود ہیں، جو چاہوں وہ لے آئیں گے، جو کہوں وہ کر دیں گے۔ میں نے خدا کے فضل سے جب سے ہوش سنبھالا اب تک اپنے ہاتھ سے موزے نہیں پہنے، میں بھلا کیوں کسی طرح کی تکلیف اٹھاؤں؟ تمہیں سب معلوم ہے، تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میں کس دلار سے پلا ہوں، میں نے نہ کبھی یہ جانا کہ سردی کیا بلا ہے نہ یہ کہ بھوک کسے کہتے ہیں، کوئی حاجت نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو، آج تک اپنی روزی نہیں کمائی، کبھی ایسا کام نہیں کیا کہ ہاتھ پریلے ہوں۔ تو پھر تم میرا اور سب سے کیوں مقابلہ کرتے ہو؟ کیا میری صحت ایسی ہے جیسے ان "اور سب" لوگوں کی ہوا کرتی ہے؟ کیا میں یہ ساری قیمت برداشت کر سکوں گا؟

پھر ادب و مروت اس شخص کی طرح جس کی کافی قدر نہ کی گئی ہو، شکایت آمیز لہجے میں کہتا ہے، مگر اس کے باوجود میں دن رات فکر میں رہتا ہوں، محنت کرتا ہوں، کبھی کبھی سر میں آگ سی جلتی لگتی ہے، دل معلوم ہوتا ہے بیٹھا جاتا ہے، رات کو نیند نہیں آتی، کروٹیں بدلتا رہتا ہوں ہر وقت اس فکر میں رہتا ہوں کہ کون سی صورت بہتر ہوگی۔ اور یہ سب کس کے لیے؟ اپنے کسانوں کے لیے، گویا تمہارے لیے، تم مجھے سر پہ

کبل پیٹے لیٹا دیکھ کر سمجھتے ہو گے کہ میں آرام سے پڑا سو رہا ہوں نہیں اس وقت میں نیند میں نہیں ہوتا ہوں، بلکہ اس گہری فکر میں ہوتا ہوں کہ اپنے متعلقین کے لیے ہر ضرورت کی چیز کیسے مہیا کروں کہ وہ دوسروں پر حسد نہ کریں، خدا کی بارگاہ میں میری شکایت نہ کریں، بلکہ شکر ادا کریں اور میرے لیے بھی دعا میں مانگیں... مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی بدسلوکی محسوس کر لی ہے اور اب آئندہ کبھی اپنے آقا کا "اور سیبھوں" سے مقابلہ نہ کرو گے۔ اپنی بدسلوکی کا کفارہ تم اس طرح سے دو کہ مالک مکان کو سمجھا بھیجا کر راضی کر لو اور مجھے مکان بدلنے کی تکلیف سے بچاؤ۔ تم بھی اپنے آقا کو کیا خوب چین سے رکھتے ہو! مجھے بالکل بدحواس کر دیا، ممکن ہے کسی نے مفید خیال کو میرے ذہن میں آنے سے روک دیا ہو اور اس میں نقصان کس کا ہے؟ تمہارا اپنا۔ میں نے تمہیں لوگوں کے واسطے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ تمہارے فائدے کے لیے ملازمت سے دست بردار ہوا، تمہارے ہی خاطر قید میں پڑا رہتا ہوں۔ خیر... دیکھو اب تین بج رہے ہیں! کھانے کے وقت میں صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں اور دو گھنٹے میں بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ خاک بھی نہیں، اور کام کا انبار ہے اس لیے میں خط اگلی ڈاک سے بھیجوں گا اور گاؤں کے انتظام کی تجویز پر کل غور کروں گا۔ اچھا اب میں تنک گیا ہوں، ذرا دیر لیٹتا ہوں... ممکن ہے گھڑی بھر سو بھی لوں۔ تم مجھے سارٹھے چار بجے جگا دینا "اس سرشت اور ذہنیت کا آدمی دنیا میں جو کچھ کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ممکن ہے اب لوموف کی ساری عمر

اسی طرح کٹ جاتی جیسے یہ دن جس کا حال بیان ہوا ہے۔ اتفاق سے اس کا بچپن کا دوست شوٹلٹر اس وقت پیتربرگ آیا اور اس کی زبردستی سے ادب لوموف نے کچھ دن کے بے جود اور کاہلی کی مصروفیتوں کو خیر یاد کر کر دنیا کو منہ دکھایا۔ اسی سلسلے میں ادب لوموف کی آخری آزمائش ہوئی اور اسے اپنا طرز زندگی اور فلسفہ حیات بدلنے کا آخری موقع ملا۔ مگر وہ بہت ہار گیا اور جود کے پھندے سے نہ نکل سکا۔ یہ سرگزشت ناول کے دوسرے حصے میں سنائی گئی ہے۔

شوٹلٹر کے توسط سے ادب لوموف کا تعارف اولگا نامی ایک لڑکی سے ہو گیا۔ اولگا شوٹلٹر کی زبانی ادب لوموف کا سارا حال سن چکی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے گا ادب لوموف کو راہ راست پر لاؤں گی اور اس کے سوتے ہوئے دل کو جگاؤں گی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ہر وقت پرستش کی نہیں تو کم سے کم قدر دانی اور تعریف کی منتظر رہتی ہیں، وہ سوسائٹی کے اس بیہودہ رواج کی بھی پابند نہ تھی جو ایک طرف تو لڑکیوں کو سکھاتا ہے کہ مردوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں پیش قدمی نہ کریں اور دوسری طرف انہیں مجبور کرتا ہے کہ جس صورت سے بھی ہو سکے مردوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ سوسائٹی میں اولگا نامی کامیاب سمجھی جاتی تھی، اس کی سادگی اور خلوص، سنجیدگی اور شرافت کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اور اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس کی صحبت اور دوستی میں وہ اپنے بچے اور گہرے شوالی جذبات کو ظاہر

جو نود اور ظہور کے لیے بے تاب تھے۔ ادب لوموت کی طبیعت بھی بناوٹ
 اور اوجھے پن سے پاک تھی، اسے ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی
 جن میں نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنا سارا وقت صرف کرتے ہیں اور سمجھتے
 ہیں کہ بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ اس کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ
 ملاقات کے پہلے دنوں میں جب سٹوڈنٹز نے اولگ سے کچھ گانا سنانے کی
 فرمائش کی اور اولگ نے ادب لوموت سے پوچھا کہ آپ کی کیا خواہش ہے تو
 ادب لوموت نے بلا تامل کہہ دیا کہ میں گانا سنانے کی فرمائش میں شریک
 نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کیا گاتی ہیں اور میں جھوٹی
 تعریف کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب اولگ نے گانا سنایا اور آخر میں ایک
 نہایت پروردگیت گایا جو اسے خاص طور سے پسند تھا تو اس نے دیکھا
 کہ ادب لوموت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس واقعہ کا اولگ
 کے دل پر بہت اثر ہوا، یوں بھی اسے ادب لوموت میں بہت سی
 ایسی صفات نظر آئیں جو واقعی قابلِ قدر تھیں اور اس نے نہایت بے
 تکلفی سے ادب لوموت کو اپنے گھر پر بلانا، اسے چھیڑ چھاڑ کر مختلف مسئلوں
 پر بحث کرنا اور زندگی سے دلچسپی لینے پر مجبور کرنا شروع کر دیا، رفتہ رفتہ
 اس نے ادب لوموت کی جھمک دور کر دی، اس کی عادتیں کچھ درست
 کر دیں، کابل کی کچھ کم کردی دونوں یہ محسوس کرنے لگے کہ ان میں ایسی گہری
 دوستی قائم ہو گئی ہے جس کے سامنے اس جذبے کی کوئی حقیقت نہیں
 جسے عشق کہتے ہیں اور جس کا دعویٰ ہر کس و ناکس کیا کرتا ہو۔ لیکن جب

تعلقات اس حد تک پہنچ گئے اور ادب لوموف نے دیکھا کہ سب کا خیال
ہے کہ وہ اولگا سے شادی کرے گا اور خود اولگا بھی یہی چاہتی ہے تو وہ
بہت گھبرایا۔ چند روز کے لیے اولگا جیسی لڑکی کی خاطر اس نے اپنے فلسفہ
حیات کو معطل کر دیا تھا اور سبیت پر جبر کر کے اپنا پڑا ناپرز زندگی بدل
دیا تھا، لیکن اولگا سے شادی کرنے کے معنی یہ تھے کہ اسے اولگا کی وجہ
سے اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے انقلاب پیدا کرنا پڑے گا اور وہ پرانی
عادتیں جن میں اس نے پرورش پائی تھی اور جنہیں وہ انسانیت کا جوہر
سمجھتا آیا تھا سب ترک کرنی ہوں گی۔ اولگا کی محبت اس اعلیٰ زندگی
کی تصویر جو اولگا کی شخصیت اور حوصلے اس کا دل لہانے کے لیے اس
کے سامنے پیش کر رہے تھے، یعنی وہی محرکات جو کسی دوسرے شخص
کو اولگا کی طرف اور زیادہ مائل کرنے، ادب لوموف کو وحشت دلانے
لگے۔ آخر میں اولگا کو بھی یقین ہو گیا کہ ادب لوموف کے جہود اور کاہلی
سے لڑنے کی اس میں طاقت نہیں اور یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ اپنی
محبت اور زندہ دلی سے اس خاک کے تودے میں زندگی اور حرکت
پیدا کر سکے گی۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے اس نے دوستی کی بنیاد
ڈالی تھی، اسی طرح اس نے اسے کھود کر بھینک دیا۔ اس نے ادب
لوموف سے کہہ دیا کہ ”میں سمجھتی تھی تم میں جان ڈال سکوں گی، تمہاری
زندگی دلیسی ہی ہوگی جیسی میرا دل چاہتا ہے۔ مگر تم تو زمانہ ہوا امر چکے۔
میں نے اپنی غلطی پہلے سے نہیں محسوس کی، منتظر رہی،... امید کرتی

رہی اور اب دیکھو کیا انجام ہوا! محبت میں مایوس ہونے، اسیدوں کے سرسبز درخت کو مر جھانے ہوئے دیکھنے سے بڑا سخت صدمہ پہنچتا ہے اس آخری ملاقات کے بعد ادب لوموف اور اولگا دونوں بیمار پڑ گئے، بیماری کے بعد ادب لوموف پر اس کا جہود پھر پورے طور سے حاوی ہو گیا اولگاہ نے شولٹز سے شادی کر لی اور ادب لوموف کی دوستی کی یاد ان حسرتوں میں شامل ہو گئی جو پوری نہ ہونے پر بھی دل کو غریزہ رہتی ہیں۔

گو پخروف نے ادب لوموف کی سیرت میں زیادہ تر اپنی اور روس کے خوش حال زمینداروں کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ اپنی ”آپ بیتی“ میں اس نے اپنے بچپن کا جو حال سنا یا اس سے معلوم ہوتا ہے زمینداروں کے بچوں کی تربیت عموماً ایسی ہوتی تھی کہ بڑے ہو کر سب ادب لوموف کے سے ہو جائیں اور غالباً گو پخروف اپنے ہیرے کے جہود کی تصویر کھینچنے میں اس قدر کامیاب اسی سبب سے ہوا کہ وہ ادب لوموف کی اکثر خصوصیات اور رجحانات اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا۔ روسی آب و ہوا بھی انسان کو جہودی فلسفہ حیات کی طرف مائل کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک جہود کا ایک عنصر طبیعت میں شامل نہ ہو انسان کے لیے روس کے سخت جاڑے، جو ہر قسم کی نقل و حرکت مشکل کر دیتے ہیں اور مکانات میں بند رہنے پر مجبور کرتے ہیں، برداشت کرنا ناممکن ہو جائے۔ جب گو پخروف کا ناول شایع ہوا، تو تمام روشن خیال روسیوں نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ سب کے سب ایک حد تک ادب لوموف سے

مشابہ اور اسی کی طرح جمود کے مرض میں مبتلا ہیں، اوب لو مو ف روس کی قومی خصوصیات کا مجسمہ قرار دیا جانے لگا اور لوگوں کو ”اوبلو مو فی رنگ“ روسی تاریخ، روسی طرزِ معاشرت اور روسی فلسفہ حیات کے ہر پہلو میں نظر آنے لگا۔ جمود اور کاہلی، آرزوؤں اور امنگوں کی پستی، یہ خوف کہ کہیں جدوجہد، جفاکشی اور دل کے حوصلے پورے کرنے کی فکر میں چین آرام ہاتھ سے نہ جاتا رہے، غرض وہ رنگ جو اوب لو مو ف کی طبیعت میں اس قدر نمایاں ہے اور ”اوبلو مو فی“ رنگ کہلاتا ہے روس میں واقعی بہت عام ہے۔ لیکن روس کے باہر بھی اس کی کمی نہیں۔ دنیا میں کون سا ملک ہے جہاں ایسے لوگ نہ ملیں گے جو آرام و اطمینان سے رہنا کامیابی کا صحیح معیار قرار دیتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی آرزوؤں کو خیر باد کہنے پر تیار ہو جاتے ہیں، اگر اس کے بدلے انہیں چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے؟ ان کے دلوں میں حوصلے موتے ہیں انہیں پورا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور ان کے پورا ہونے سے قوم اور ملک کو جو فائدہ ہو سکتا ہے اس کا احساس بھی ہوتا ہے، مگر محض اس خیال سے کہ اس کام کے لیے محنت اور کوشش درکار ہے یہ لوگ ہانچ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، شکایت کرتے ہیں، انوس کرتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہیں کرتے۔ حوصلہ تو خیر بڑی چیز ہے اور جس قدر گراں مال ہے اتنا ہی کیسا بھاری، دنیا اور خصوصاً ہمارے ہندوستان جنت نشان میں لاکھوں ایسے لوگ ملیں گے جو صرف محنت، مشقت، فکر اور پریشانی سے بچنے کے لیے انتہائی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور

اپنی پتی میں اس خیال سے تسلی حاصل کرتے ہیں کہ زندگی چلے جس طرح گزرتی
چین سے بیٹھنا تو نصیب ہی اور اُن لوگوں کو حیرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں
جن کی نظر سے زندگی کا یہ بھید چھپا رہا، جو سکون اور اطمینان کی قدر نہ کر سکے
اور ساری عمر ”ہوس“ اور کوشش میں سرگرداں رہے۔ جب ادب لوموف پر نگاہ
مازم تھا اور اسے صبح سے شام تک سرکاری کام میں مصروف رہنا پڑتا تھا، تو
وہ اکثر تعجب سے پوچھا کرتا تھا کہ اگر مشاغل کی یہی کثرت رہی تو ”پتی زندگی
بسر کرنے“ کے لیے کس طرح وقت نکل سکے گا اور اسی ”زندگی بسر کرنے“ کے
اعلیٰ مقصد کی خاطر اس نے بیماری کا بہانہ کر کے ملازمت سے استعفا دے
دیا۔ یہ اعلیٰ مقصد جو دار کا ہلی کی پشت پناہ ہے۔ ادب لوموف کو جب کسی
بات کی فکر ہوتی، کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوتا تو وہ یہ کہہ کر اپنی طبیعت کو الٹا
دے لیتا تھا کہ ”شاید، ممکن ہے، کسی نہ کسی طرح“، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
دوسرے لوگوں کے طریقے اور ہیں، دوسری زبانوں کی اصطلاحات جہاں ہیں
لیکن کسی بے سرو پا امید پر بھروسہ کر کے کوشش اور فکر کو بیکار سمجھنا انسانی
سیرت کی ایک صفت ہے جس کے لیے ملک و نسل کی کوئی قید نہیں۔

گو بنجروف نے ادب لوموف کے مقابلے میں اس کے دوست ٹمولٹز
کا کیرکٹر دکھایا ہے۔ اس لیے اکثر روسی نقادوں نے یہ فرعن کر لیا کہ ٹمولٹز اس
کمال اور کامیاب شخصیت کا نمونہ ہے جس کا خاکہ کچھنے کی کوشش اس دور کے
ناول نویس کیا کرتے تھے اور چونکہ ٹمولٹز کی شخصیت ایک معمولی جرمن تاجر
کی سی تھی، اس لیے گنجیمزوف کی تعریف کا یہ پہلو بہت کمزور قرار دیا گیا،

لیکن دراصل ٹیولٹز ایک پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس کی طبیعت اور طرز زندگی کے تقابل سے ادب لوموف کی خصوصیات زیادہ واضح، اس کی سرگزشت اور زیادہ عبرت انگیز اور دردناک ہو جاتی ہے۔ ناول میں ٹیولٹز کا اس کے سوا اور کوئی مصروف نہیں اور اس کا نظریے اس کا کیرکٹر بہت صفائی اور کامیابی سے دکھایا گیا ہے۔ البتہ اولگا کی شخصیت اپنا خاص مقصد رکھتی ہے۔ جو حصہ وہ ادب لوموف کی زندگی میں لیتی ہے اس سے قطع نظر کہ اس کی اپنی ذات بھی ادب لوموف کی طرح مثالی اہمیت رکھتی ہے۔ گو پھر وہ نے اسے اس حوصلہ مندی اور بے چینی، جفا طلبی اور جفا کشی کا مجسمہ بنایا ہے جو زندگی کی اصل زینت اور انسانیت کا جوہر ہے۔ اولگا کی شخصیت میں وہ کشش، اس کی محبت میں وہ جادو ہے جو جواں مردوں کو اعلیٰ اخلاقی مقاصد کا شیدائی بنا دیتا ہے اور انہیں دائمی جستجو میں محور رکھتا ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسی عورتیں ملتی ہیں جن میں ان صفات کا پرتو بھی ہوتا ہے اور گو پھر وہ اگر نمونے کے بے اولگا سے ملتی جلتی کوئی لڑکی تلاش کرتا تو اسے غالباً ناکامیابی ہوتی، لیکن اس کے باوجود اولگا کے جسمانی اور روحانی سراپے میں ایک نقش بھی نہیں جس پر تصنع یا مبالغے کا شبہ ہو۔ اولگا اور ادب لوموف کا ملنا اور مایوس ہو کر جدا ہو جانا ایک بہت معمولی داستان ہے۔ لیکن وہ ایک عاشق کی کہانی بھی ہے، جو اپنے عشق میں فنا ہونے سے ڈرتا ہے، ایک کم مہمت انسان جو انسانیت کے شرف اور عظمت کو انتہائی درجہ بائشکل میں دیکھ کر

بھی اپنے آپ کو اس کی صحبت سے محروم رکھتا ہے اور انسانیت کی ذمہ داریوں
 سے گریز کر کے نباتات کے سے جمود میں پناہ لیتا ہے، اس سے زیادہ
 پُروردہ اور کونسی کہانی ہو سکتی ہے۔ مگر افسوس کہانی بہت عام ہے اور ہماری
 زندگی میں روزمرہ کی بات ہے۔

چوتھا باب

اوان سرگے یوچ تو رگنیف (۱۸۱۸-۱۸۸۳)

تو رگنیف روس کے ایک بہت مشہور رئیس خاندان سے تھا۔ اس کے باپ نے آبائی جائیداد گنوا دی تھی، مگر اُس کی ماں کے پاس اس قدر سرمایہ تھا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکے اور تو رگنیف نے زندگی خاصی آسودگی سے بسر کی۔ ۱۸۳۴ء میں تو رگنیف ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا، وہاں تعلیم ختم کرنے کے بعد، خوش حال روسی طالب علموں کی رسم کے مطابق جرمنی گیا اور تین سال تک برلن کے دارالعلوم میں لکچر سنتا رہا۔ جرمنی سے واپسی پر وہ سرکاری ملازم ہو گیا، مگر طبیعت کی نامناسبیت نے اسے ملازمت ترک کرنے پر مجبور کر دیا اور ۱۸۴۳ء میں اس نے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنی زندگی انتشار دازی کے لیے وقف کر دی۔ اسے شاعری کا شوق تھا، طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نے بائرن اور دوسرے یورپی شاعروں کے ترجمے کیے تھے جو کسی قدر مقبول ہوئے ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک نظم ”پراشا“

لکھی جس کی مشہور نقاد بے لن سکی نے بہت تعریف کی۔ مگر اس فن میں اسے
 خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اور اس نے شاعری تقریباً چھوڑ دی۔
 ۱۸۴۵ء میں اس کی پہلی نثر کی تصنیف ”شکاری کے مشاہدات“ شائع ہوئی
 جس نے اس کی ساری خوبیاں روس کی ادبی دنیا پر روشن کر دیں۔ مگر
 ”شکاری کے مشاہدات“ کی کامیابی بھی تو رگینف کو روسی ماحول سے
 رضاء مند نہ رکھ سکی اور ۱۸۴۷ء میں وہ وطن کو خیر باد کہہ کر فرانس چلا گیا
 اور پیرس میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۲ء میں وہ تھوڑے عرصے کے لیے گوگول کی تعزیت
 کے سلسلے میں روس واپس ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے چند روز جیل
 خانے میں گزارنے پڑے۔ جیل خانے سے رہائی پر وہ پھر یورپ چلا گیا
 سیر دیاحت کرتا رہا اور مدام وی آرڈوت کاریا، ایک مشہور گانے
 والی کی نیاز مندانہ خدمات میں مصروف رہا۔ ۱۸۴۸ء میں اسے ایک مرض
 ہو گیا جس کی نوعیت پہلے پہل ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آئی اور جو آخر وقت
 میں معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا سرطان ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی
 اور تو رگینف کی عمر کے آخری دو سال پلنگ پر پڑے پڑے گزرے۔
 ”شکاری کے مشاہدات“ کے بعد تو رگینف بے اور مختصر افسانے لکھتا
 رہا، جس میں ”گوشہ عافیت“، ”خطوط“، ”یاکوف پاسن کوف“ اور ”آسیا“
 سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں اس کا پہلا ناول ”سروین“
 شائع ہوا اور ناول نویس کی حیثیت سے بھی تو رگینف کو بہت اعلیٰ رتبہ
 حاصل ہو گیا۔ ”رئیسوں کا اڈا“ (۱۸۵۸ء) اور ”صبح امید“ (۱۸۵۹ء) نے

تورگینف کی شہرت اور ہر دل غریزی کو عروج پر پہنچا دیا، مگر ”باپ بیٹے“ (۱۸۶۱) نے اس کے اور اس کے شیداؤں میں غلط فہمی پیدا کر دی جسے رفع کرنے کے لیے اس نے اس موضوع پر ایک لمبا ناول لکھنے کا ارادہ کیا، مگر پورا نہ کر سکا۔ ”دھواں“ (۱۸۶۷) باوجود اپنے بے شمار اوصاف کے غلط فہمی کو اور بڑھانے کا باعث ہوا، اور جب تورگینف نے ”اچھوتی زمین“ (۱۸۷۶) لکھا تو وہ روس کے حالات سے اس قدر گہری واقفیت نہیں رکھتا تھا کہ ناول کو مفاہمت کا ذریعہ بنا سکے۔ ”اچھوتی زمین“ تورگینف کا آخری ناول تھا۔ اس کے بعد اس نے صرف چند انوکھے خیالی قصے لکھے اور عین علالت کے دوران میں ”نثر میں نظمیں“ یا ”بڑھاپے کے تصورات“

تورگینف کی تصانیف اور اس کے خیالات کا سلسلہ روس کے معاصر حالات سے بہت وابستہ ہی اور اس کا اپنا قول بھی ہو کہ اس کی تصانیف پوری طرح سمجھنے کے لیے اٹھیں سلسلے وار پڑھنا اور اس تاریخی اور معاشرتی ماحول کو جس کی فضا اور تاثیر ان میں دکھائی گئی ہے، ہمیشہ پس منظر کے طور پر رکھنا چاہیے۔ تورگینف نے اپنے پہلے افسانوں میں اس زمانے کا عکس اتارا جب زمیندار خداوندی کے نقشے میں چور تھے اور کاشتکار غلامی کے مرض میں مبتلا لیکن روسی ذہنیت میں تغیر ہو رہا تھا۔ تعلیم اور تعلیم سے زیادہ انشا پردازوں نے خوش حال اور بڑھے لکھے روسیوں کے ضمیر کو بتدریج اس قدر ذمی حس اور بیدار کر دیا کہ کسانوں کی غلامی اور ذہنی پستی سے ان کے دل دھکنے لگے، اور کسانوں کو آزاد کرنا ہر روشن خیال روسی کی آرزو ہو گئی۔

کسانوں کو آزاد کرانے کے ساتھ یہ لازمی تھا کہ زمیندار اپنا طرزِ معاشرت اور فلسفہٴ حیات بدل لیں، دوسروں کی محنت پر سیر کرنے کے بجائے اپنے ذریعہٴ معاش کی خود فکر کریں۔ ان لوگوں کے لیے جو ہمیشہ سے بیکاری کے عادی تھے اس نئی زندگی کا بیڑا اٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اور لوگوں کی ہمت اور حوصلوں کا چڑھاؤ اتار، ان کی امیدیں، اندیشے، ناکامیاں خود بخود انتشار پر دانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں۔ ۱۸۶۰ تک زیادہ تر یہی کیفیتیں تو رنگینف کا موضوع رہیں۔ اس کی اپنی طبیعتِ حزن و یاس کی طرف مائل تھی اور اس کی تصانیف کا رنگ بھی ایسا ہی ہے۔ مگر اس کی مایوسی بجا نہیں تھی اور اگر اس کی تصانیف سے یہ ظاہر ہوا کہ خوش حال روسی اس نئی زندگی کے قاعدے برتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اس میں حقیقت کے خلاف کوئی بات نہ تھی۔ واقعات نے دکھا دیا کہ وہ نسل جس نے کسانوں کو آزاد کرایا آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی، کیونکہ اس کی ذہنیت اور اس فضا نے جس میں اس نے تربیت پائی تھی اسے قومی زندگی کی تعمیر کے لیے بالکل ناموزوں بنا دیا تھا۔ تعمیر کا حوصلہ اس کے بعد کی نسل میں نظر آتا ہے اور ”باپ بیٹے“ میں تو رنگینف نے نئی نسل کے ایک مثالی نمونے کا پچھلی نسل کے لوگوں

لے زمینداروں کو ۱۸۶۱ سے پہلے اپنے کاشتکاروں سے بلا اجرت ہر قسم کا کام لینے کا پورا حق تھا۔ کاشتکاروں کی آزادی کے بعد انہیں لگان تو ملتا رہا، مگر چونکہ سیر پر کام کرانے کی اجرت دینا پڑتی تھی اس لیے ان کی آمدنی میں بہت کمی ہو گئی۔

سے مقابلہ کیا ہے۔ نئی نسل کا نمائندہ منکر تھا اور تورگینف نے اس کے چال چلن اور خیالات میں ”منکریت“ کی ایک تصویر کھینچی۔ اس کی نقاشی میں کوئی کسر نہیں تھی، اس کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی، دل میں کھوٹ نہیں تھا، اپنے ”منکر“ ہیرو سے اس کو نہ کوئی عداوت تھی اور نہ ناول میں عداوت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن عام طور سے ناظرین اور نقادوں کو بدگمانی ہو گئی کہ وہ نئی اور پرانی نسلوں کا مضحکہ اڑا رہا ہے اور اس بدگمانی نے تورگینف کے نام میں تہ لگا دیا۔ قومی حوصلوں سے وہ ہمدردی، قومی سیرت سے گہری واقفیت رکھنے کا وہ اعتبار جو اس کی پچھلی تصانیف نے قائم کیا تھا بالکل جاتا رہا اور تورگینف کے دل کو ایسی سخت چوٹ لگی جس کے درد سے اسے تمام عمر تکلیف رہی۔

”باپ بیٹے“ کے بعد چھ سال تک تورگینف بالکل خاموش رہا اور پھر ”دھویں“ میں قومی مسائل اور مشکلوں کا پس منظر ایسے رنگ میں دکھایا جس سے مایوسی پکٹی ہے۔ ”دھویں“ کے بعد پھر نو سال تک تورگینف نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ ”اچھوتی زمین“ (۱۸۷۶ء) کی تصنیف کے وقت تک اس نے قوم کی ناقدر دانی اور کج فہمی معاف کر دی تھی، اور اس کے علاوہ قوم میں بلند حوصلگی اور ایثار کی ایسی علامتیں نظر آنے لگی تھیں کہ اس کی ڈھارس بندھ گئی اور وہ بھر تعمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ ترقی کی علامتیں

تھیں ”منکروں“ کی تحریک کا پھیلتا، مضبوط ہونا اور اپنی قربانیوں سے قوم میں عزت اور وقار حاصل کرنا، اس کے ساتھ ہی ایک اور تحریک کا آغاز ہے اچھوت سیوا سمجھنا چاہیے، جس کے پیرو دنیا اور دنیاوی حوصلے چھوڑ کر قوم کے سب سے پچلے اور پست طبقوں میں جا ملے تھے اور ان کی خدمت اور تعلیم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ سب سے زیادہ ہمت افزا بات یہ تھی کہ ان دونوں تحریکوں میں عورتیں اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں شریک تھیں اور دنیا کی تاریخ میں شاید ہی عورتوں کی کسی جماعت کی ایسی مثال ملے گی جو ان لڑکیوں اور عورتوں کی صداقت، خلوص، جانفشانی اور اعلیٰ اخلاق کا مقابلہ کر سکے۔ تورگینف ایک مدت سے روس نہیں گیا تھا، اسے سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے ”اچھوتی زمین“ کو سرسبز کرنے والوں کی داستان اپنے وجدانی علم پر بھروسہ کر کے لکھی۔ اس کی تصنیف نے ان خاص لوگوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا جن کی زندگی اور جدوجہد اس کا موضوع تھی، پھر بھی اگر ہم ناول پڑھ کر اصلی تاریخی حالات اور واقعات پر غور کریں تو تورگینف کی حقیقت بینی اور نکتہ رسی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

وہ زمانہ جس کے ظاہر اور باطن سے تورگینف واقف تھا نظر سے اوجھل اور یاد سے محو ہو گیا تھا، وہ لوگ جن کی سیرت اور مزاج اور فلسفہ حیات کو وہ جانتا اور سمجھتا تھا مر چکے تھے اور نئی نسل کے مستقبل

کی نسبت پشین گوئیاں کرنا، نئی دنگی کی پہلیاں بوجھنا اس کی قدرت سے باہر تھا۔ تورگنیف کے اس دور کے افسانے اس کی پہلی کہانیوں سے بہت مختلف ہیں۔ گولگول کی طرح اس پر بھی بڑھاپے میں ایک مذہبی کیفیت طاری ہو گئی جس نے اس کے حقیقت کے معیار کو بالکل ہلٹ دیا اور اس کے افسانوں میں مافوق الفطری قوتوں کو بہت دخل ہونے لگا۔ لیکن ان افسانوں سے بہت زیادہ اہم اور گراں قدر اس کی ”نثر میں نظمیں“ ہیں۔ ان میں دو چار افسانے بھی ہیں، ایک دو جگہ سیاسی اور دیگر مسائل پر رائے ظاہر کی گئی ہے، مگر ان میں زیادہ تر بڑھاپے کے تصورات ہیں، ایک ایسے شخص کے جو روسی کہاوت کے مطابق ”اپنی زندگی بھر جی جھکا تھا“ اور دنیا سے رخصت ہونے کو تیار بیٹھا تھا۔

”شکاری کے مشاہدات“ میں تورگنیف نے قوم کو کسانوں کی اصلی حالت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا۔ اس موضوع پر بہت سے ناول اور افسانے لکھے جا چکے تھے اور روسی کسانوں کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں تھا جو انشا پردازوں کی نظر سے چھپا رہا، مگر تورگنیف کا اپنا الگ انداز ہے جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس کا نقطہ نظر کسانوں کے ہمدردیاحامی کا نہیں، زمینداروں کی زیادتیاں بھی بغا ہر اس کے دل کو نہیں دکھاتی ہیں اسے حق اور انصاف اور راست بازی کے اعلیٰ معیار سے بھی کوئی سروکار نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی جتنا اثر روشن خیال لوگوں پر اس کے ”شکاری کے مشاہدات“ کا ہوا اس کا مقابلہ کوئی اور تصنیف نہیں کر سکتی۔ ”مشاہدات“

کی کامیابی کا راز یہ ہو کہ تو رگنیف کی طرح کیر کٹر کا خاکہ اُتارنا اور زندگی کی کیفیتیں بیان کرنا کسی کو نصب نہیں ہوا۔ اپنے کیر کٹروں سے ظاہری بے تعلقی دکھا کر وہ اپنے بیان میں ایک خاص تاثیر پیدا کر دیتا ہے اور اس کا اثر دل میں اور زیادہ چھتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی تو رگنیف مناظر قدرت کا شیعائی تھا، روسی سرزمین اور آب و ہوا، پرند اور چالور، بھاڑ جنگل اور پھول پتیاں اسے اس قدر عزیز تھیں کہ وہ ان کے ہر رنگ اور کیفیت کو سمجھتا تھا اور اس کی شدید محبت نے اس کے قلم میں ہر چیز اور ہر حالت کا نقش اُتارنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ انسان اور انسانی قانون کا جو رسوم و علاموں اور علامی کے دردناک منظر ”مشاہدات“ کے ناظرین کو اس وجہ سے اور بھی زیادہ نفرت انگیز معلوم ہوتے کہ ان کا پس منظر بہت ہی دلکش تھا، انسانی زندگی کی کہانی فطرت کی کتاب میں لکھی گئی تھی، مگر وہ ایک خوش مناسبتے میں ایک بھدھی عبارت تھی۔

یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ناظرین کے سامنے روسی کسانوں اور ان بیچاروں کی زیادہ مثالیں پیش کی جائیں جو آقا کے کھیت جوتے کے بجائے اس کے گھر کا کام کرتے تھے۔ تو رگنیف نے کسان اور خاگی غلاموں کے بہت سے خاکے اُتارے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی اس عبرت انگیز اور سبق آموز ہجو۔ وہ کسان جس کی ہستی قانوناً تسلیم نہیں کی جاسکتی اس وجہ سے کہ بھلی مردم شناری میں اس کا نام لکھنا نہ گیا تھا، یا وہ جسے دنیا

میں ایک کُتے کے سوا کسی زندہ چیز سے محبت نہیں اور جس سے محبت کرنے والا بھی اس کُتے کے سوا کوئی نہیں، تو رگینف کی مصوری کے ایسے نمونے ہیں جہاں اس نے قلم کی ذرا سی جنبش سے پورے پورے نقشے بنا دیے اور چند الفاظ میں ایک دردناک داستانِ سادی جس کا اخقار اس کے اثر کو دو گونہ کر دیتا ہے۔ کسانوں کی بستی کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو جہاں یہی ایجاز بھر اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔

”سیتپ کے بادشاہ لی سر“ میں ایک مجسٹریٹ کسانوں کو باضابطہ اطلاع دیتا ہے کہ ان کا مالک بدل گیا ہے اور محض رسوا پوچھتا ہے۔
 ”تم میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں کرتا ہے؟“
 موت کی سی خاموشی۔

”کیوں شیطان کے بچو، کیا تم جواب نہیں دو گے؟“
 آخر کار ایک بڑھا جو سپاہی رہ چکا تھا آگے بڑھ کر بولا:
 ”جی نہیں حضور، ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

اس کے ساتھیوں نے حیرت سے بڑھے کی طرف دیکھا، ایک حیرت جس میں مجسٹریٹ بھی شامل تھا، اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہنے لگے
 ”دیکھو بہادر آدمی ایسے ہوتے ہیں!“

”شکاری کے مشاہدات“ کے بعد بھی تو رگینف اکثر دیہاتی زندگی اور خانگی غلاموں کی داستانیں سنا رہا۔ اس سلسلے میں ”پون اور بابور“ کا افسانہ جو اس نے ۱۸۷۴ء میں ”اچھوتی زمین“ کے قبل ہی لکھا خاص طور پر

قابل توجہ ہے۔ گو وہ کسانوں کے قانوناً آزاد ہونے کے تیرہ سال بعد تصنیف ہوا، اس کا قصہ غلامی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، اس کا ہیرو بابورن ایک غریب آدمی ہے جس کا نوکری کے سوا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں، لیکن اس ذلیل پیشے کے باوجود وہ ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر عمل کرتا ہے جو اسے اس کے دل نے سکھائے ہیں یا ان اخلاقی تصانیف نے جن کا وہ مطالعہ کرتا رہا ہے۔ چونکہ اس کے اصول غلامی اور آقائی کے ماحول میں نہیں کھپ سکتے، اس کا کہیں گزر نہیں ہوتا اور اسے ہر قسم کی مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں لیکن وہ اپنے ارادے کا ایسا پکا ہے کہ اپنی ساری تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے اور اس کی ہمت اور انسانی ہمدردی دوسروں کا سہارا بن جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ ایک غریب آدمی کا فرض ہے کہ دوسرے غریب آدمی کی مدد کرے، وہ اپنے دوست پونن کی پرورش اپنے ذمہ لیتا ہے اور پونن مرتے دم تک اسی کے بھر دے پر بسر کرتا ہے۔ اسی طرح بابورن ایک لڑکی موزا کو جو کسی زمیندار کی ناجائز اولاد ہے، اپنی حمایت میں لے لیتا ہے، اسے بھلاتا پلاتا ہے اور باوجودیکہ وہ ایک نوجوان زمیندار کے ساتھ فزا ہو جاتی ہے اور ایک عرصہ تک اس کی غیر منکوحہ بیوی بن کر رہتی ہے، بابورن اس کی خطا معاف کر دیتا ہے اور جب نوجوان رئیس اسے نکال باہر کرتا ہے تو خود اس سے نشادی کر لیتا ہے۔ آخر میں بابورن کسی سازش کے سلسلے میں گرفتار ہو کر سائی بیریا کے ایک دور افتادہ مقام پر بھیج دیا جاتا ہے، وہاں وہ ایک اسکول قائم کر کے بچوں کی تعلیم میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کام

میں موزا بھی بڑے اہناک سے شریک ہو جاتی ہے۔ ۱۸۶۱ میں کسانوں کے قانوناً آزاد کر دیے جانے کی خوشی میں وہ ننگے سر بارش میں دوستوں کو خبر سنانے کے لیے شہر بھر میں گھومتا پھرتا ہے، اس بے احتیاطی کی وجہ سے اسے زکام اور بخار ہو جاتا ہے اور اسی میں اس کی جان جاتی ہے۔ موزا اس کے کام کو جاری رکھنا اپنا عین فرض سمجھتی ہے اور بڑے استقلال سے اس میں لگی رہتی ہے۔

بابورن دراصل غلام نہیں ہے، مگر وہ رئیسوں اور زمینداروں کے طبقے کا بھی نہیں اور اس کا قوم کی ہیودا دوا علی اخلاقی اور معاشرتی اصول کا شیدائی ہونا روس کی ذہنی بیداری کی ایک روشن دلیل ہے۔ تورگینف نے اس افسانے میں قوم کے اس طبقے کی خیر خواہی کا آخری حق ادا کر دیا جس کی حمایت میں اس نے پہلے پہل قلم اٹھایا تھا۔ یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ تورگینف تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے بہت مایوس تھا، اس کے وہ تمام ہیر و جو تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں آخر میں نا کامیاب ہوتے ہیں اور سب کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہیں، مگر بابورن کامیاب رہا، موزا جیسی لڑکی کو جو اس سے شروع میں نفرت کرتی تھی اپنی شخصیت کا قائل اور اپنے اصولوں کا معتقد بنا لیا اور جہاں گیا وہاں خود بخود اپنے خاص طبقے کا رہبر اور رہنما بن گیا۔ تورگینف نے اپنا کمال انہی کیرکٹروں کا خاکہ اتارنے میں دکھایا ہے جو مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اگر کوئی اتشنا ہے تو بابورن۔ اس کا کیرکٹر تورگینف کے کارناموں میں

سے ہو اور اس کی شخصیت روسی سیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ -

”مشاہدات“ کے بعد دس سال تک تورگینف پر مایوسی کا غلبہ رہا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب زار نکولائی کا جبرانتہا کو پہنچ گیا تھا، تقریر اور تحریر کی آزادی اس قدر محدود ہو گئی تھی کہ سارا ملک ایک قید خانہ سا بن گیا تھا اور آزاد خیال لوگوں کے بے چین سے زندگی بسر کرنا محال ہو گیا تھا۔ اس پسینی کا الزام بڑی حد تک ریاست پر رکھا جاسکتا تھا، لیکن تورگینف کے مشاہدے نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ خود روسی قوم اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور خوش حال روسی بھی اس افسوس ناک حالت کے ذمہ دار ہیں۔ مگر نہ مافیت ”خطوط“ یا کوفت پاسن کوفت ”آسیا“ اور ان کے ملاوہ متعدد مخفرفانے تورگینف کے اس خیال کو نہایت شاعرانہ طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض افسانوں میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن پر خداوندی کا زعم بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا اور وہ کسی ظلم یا بداخلاقی کو اپنے لیے ناجائز نہیں سمجھتے۔ لیر منتوف کے ہیرو پچورین کی طرح اپنی اور دوسروں کی زندگی سے بیزار ہیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگی بگاڑنے کے سوا انھیں اور کوئی شغل اپنے شتابان شان نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن زیادہ تر تورگینف کا موضوع روس کے مفعول ”لوگ ہیں، جو من چلے ہیں اور بلند آرزوئیں رکھتے ہیں، مگر دل کے کمزور ہیں اور ہمت کے لپست۔ ان کا ایک مثالی نمونہ ”مفعول آدمی کے روزنامے“ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس شخص کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی مصروف کا نہیں پاتا

اسے اپنی زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا اور دوسرے اسے اس لالین ہی نہیں سمجھتے کہ اس سے کوئی توقع رکھیں۔ یوں اس کی عمر اپنے آپ سے بھی پوچھتے گزر جاتی ہے کہ میں آخر پیدا کیوں ہوا۔ ”فضول آدمی کے روزنامے“ کا مصنف تو ایک غیر معمولی قسم کا بیکار اور حقیر وجود ہے، تو گنیف کے بہت سے کیرکٹر ہیں جو کم و بیش اسی کے سے روحانی مرض میں مبتلا ہیں اگرچہ وہ اسے محسوس نہیں کرتے اور اپنا دکھڑا نہیں روئے پھرتے ہیں۔ تو گنیف کا ”فضول“ آدمی محض ایک اشارہ ہے ان بے شمار لوگوں کی طرف جو کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھتے کہ ہم دنیا میں آخر کیا کر رہے ہیں اور اپنے وجود سے کسی کو فائدہ پہنچا رہے ہیں یا نہیں۔ ان کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے کوئی صدمہ بھی کافی نہیں، کوئی حوصلہ کوئی تئنا ان کے دلوں میں نہیں پیدا ہوتی جو ان کے نباتات کے سے سکون میں غلط ڈال سکے۔ تو گنیف کو اپنے لوگ روس میں بڑی کثرت سے نظر آئے، لیکن روس کے باہر بھی وہ اسی افراط سے طبع گئے اور دیکھنے والا انہیں ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ ”فضول“ آدمیوں سے بہت ملتے جلتے تو گنیف کے من چلے کیرکٹر ہیں، اومان کے ایک خالص نمونے کا بھی اس نے ایک افسانے میں عکس انا رہا جس کا عنوان ”من چلا“ ہے۔ ”فضول“ اور ”من چلے“ آدمی میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ”من چلے“ میں سکون نہیں، اور چین سے رہنا اس کے لیے فطرتاً ناممکن ہے۔ وہ نہ جم کر کوئی کام کر سکتا ہے نہ کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے، اور

اس میں اپنی اہمیت یا وقت کا اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ اپنی بھلائی کی فکر کرے، اپنی حرکتوں کے انجام پر غور کرے، یا اپنے کسی نقصان پر افسوس کرے۔ ”فضول“ آدمی کے قویٰ کو فضول اور بے مصرف ہونے کا خیال زائل کر دیتا ہے، ”من چلے“ کو یہی خیال دیوانہ کر دیتا ہے اور اسے کسی چیز کی پروا نہیں رہتی سب سے کم اپنی ذاتی بھلائی کی۔ ”من چلے“ کا چچا اس سے کہتا ہے: ”تیری یہ سب باتیں اور تیری مایوسی بھی بیکاری کا نتیجہ ہے“ من چلا جواب دیتا ہے: ”مگر چچا جان مجھ میں کچھ کرنے کی، کسی کام میں لگ جانے کی صلاحیت نہیں! کہیے تو اپنی جان جواری کی طرح ایک پتے پر لگا دوں!... یہ تو مجھ سے ہو سکتا ہے! آپ مجھے بتائیے کہ کیا کروں۔ کس مقصد کے لیے اپنی جان جو کھم میں ڈال دوں۔ میں اسی وقت تیار ہو جاؤں گا!...“

”مگر تم سلامتی سے کیوں نہیں رہ سکتے؟... جان جو کھم میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا! آپ فرماتے ہیں تم سمجھ سے کام نہیں لیتے... مگر میں اور کیا کروں کیا؟... سوچنا شروع کروں تو خدا کی پناہ! کیا کیا خیالات دماغ میں نہیں پہنچ جاتے! سوچنا تو صرف جرموں کے بس کی بات ہے۔“

من چلے میں بہت، نیکی، میناسی، انسانی ہمدردی کی کوئی کمی

نہیں، لیکن اس میں استقلال مطلق نہیں، عقل سلیم سے وہ بالکل محروم ہو، اعلیٰ حوصلے رکھنے کا وہ اپنے کو اہل نہیں سمجھتا اور یہ کمزوریاں اس کی تمام خوبیوں کو مٹی میں ملا دیتی ہیں۔ جو ذرا سادہ صر نے کا امکان ہی بھی وہ شرب خواری کی لت باقی نہیں چھوڑتی اور من جلا دوسروں کی توجہ اور امداد کے باوجود آپ اپنے ہاتھوں تباہ ہوتا ہی۔

”فضول“ اور ”من چلے“ آدمی روس کی مستقل خصوصیات ہیں اور ان کا پتہ دینا تورگنیف کی حقیقت بینی کی ایک بڑی دلیل ہے، مگر شروع میں تورگنیف کی توجہ روسیوں کے ایک اور گروہ کی طرف تھی جس کی اہمیت فضول اور من چلے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا اخلاقی معیار بلند تھا، آرزوئیں گرم تھیں، مگر جو ہمت اور عملی استعداد سے بالکل محروم تھے۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۵ء تک، جب ریاست کا جبرانتہا کو پہنچ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی خانہ سازی کا بہت غوغا تھا، اس قسم کے لوگوں کی خوبیاں اور خامیاں بہت صاف اور مشوخ رنگوں میں نظر آئے لگیں۔ تورگنیف کا ان سے بہت سابقہ پڑتا تھا، کیونکہ یہ لوگ عموماً اس کی طرح خوش حال، تعلیم یافتہ جہاں دیدہ ہوا کرتے تھے، یورپ کے حالات سے بخوبی واقف، یورپی ذہنی تحریکوں سے آشنا تھے، اور خوب جانتے تھے کہ یورپ میں کون سے طریقے قومی اصلاح کے لیے اختیار کیے گئے۔ لیکن اس تمام ساز و سامان کے باوجود ان میں ہمت کی اتنی کمی تھی، اور جہود

یا جہولیت کی طرٹ اتنا قومی میلان کہ وہ کوشش اور محنت کو فضول قرار دے کر
 اپنی کامیابی کی جڑ خود ہی کاٹ دیتے تھے۔ تو گریف نے اس طبیعت
 اور ذہنیت کے نمونے ہر جگہ دیکھے، روس کے دور افتادہ گائوؤں میں،
 ماسکو اور پیتر برگ میں، یورپ کے بڑے اور مشہور شہروں میں اور ہر
 جگہ اسے وہ ایک ہی بیماری میں مبتلا نظر آئے اور ایک ہی انجام ان
 کی قسمت میں لکھا ہوا معلوم ہوا۔ ”آسیا“ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ کے
 ایک روسی عاشق کا قصہ ہے جس میں ہر دل لبھانے والی صفت تھی، ایک
 زندگی کا جسے سنوارنے کے لیے ہر سامان موجود تھا اور ایک لڑکی کا جو
 زندگی سنوارنے اور اسے فائدہ مند اور کامیاب بنانے کی اہل تھی،
 لیکن یہ امکانات ایک سرب بن کر رہ گئے، ایک جھلک دکھلا کر
 غائب ہو گئے، اس لیے کہ وہ ذرا سی ہمت اور کوشش جو انھیں صلیت
 کا رنگ روپ دینے کے لیے درکار تھی میسر نہ ہو سکی۔ ”خطوط“ روس
 کی ان لڑکیوں کا گلا ہے جنھیں آسیا کے ہیرو جیسے نوجوان امیدوں کے
 نئے سے مست کر دیتے تھے اور پھر مایوسی کے زہر سے اس نئے کو اتارتے
 تھے۔ معصوم اور نا تجربہ کار لڑکی اس کی منتظر رہتی کہ وہ شخص جس کے لیے
 اس کی روح تڑپ رہی تھی نظر آئے، آخر کار وہ نمودار نہ ہوتا ہے۔۔۔۔
 لڑکی کے دل میں مسرت، محبت، خیالات کے چٹے پہنے لگتے ہیں تو اس
 کی بے چینی جاتی رہتی ہے، شک دور ہو جاتے ہیں، اسے اپنے دوست
 کی ہر بات حق کی گفتار معلوم ہوتی ہے، وہ اپنے دوست کی پریش کرتی ہے

اپنی خوشی کو حد سے گزرتے دیکھ کر اسے شرم آتی ہے، وہ دوست سے ہر بات
 سیکھتی ہے، دوست کی ہر بات سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔۔۔ اگر اس کا
 دوست واقعی ہمت اور حوصلے والا ہو تو وہ اس میں بے انتہا جوش پیدا
 کر سکتا ہے، اسے ایثار کی راہ رسم سے واقف کر سکتا ہے اور پھر کوئی ایسا
 نہ ہوگا جو اس لڑکی پر گراں گزرے! لیکن آج کل ہمت اور حوصلے والے
 جواں مرد ہوتے ہی نہیں، وہ ماگ جس کا اٹھان اس شان سے ہوتا ہے
 بہت بے میل سرول پر ختم ہوتا ہے۔ اس خط کی معصفت آگے چل کر بیان
 کرتی ہے ”میں نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اغراض اور
 ذلیل سے ذلیل سلامت روی کے اصول انتہائی جوش کے پہلو بہ پہلو
 پائے جاتے ہیں۔“ یوں ان دوستوں کی جدائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور
 خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو محسوس کرے کہ داستان یہاں پر ختم ہو گئی ہے اور
 جودل کو بہلانے کے لیے بھی اس کے جاری رکھنے کی امید نہ رکھے!
 ”روڈن“ میں تھد گنیف نے شکایت کا یہی سلسلہ جاری رکھا ہے، مگر بڑے
 پیانے پر اور دوسرے انداز میں۔ دیمتری نکولایچ روڈن ایک ہنر مند
 وسیع معلومات کا، ذہین اور حوصلے مند آدمی ہے۔ اس کے اخلاق اور
 آداب اتنے خوشگوار ہیں، گفتگو اور بحث کے فن میں وہ ایسا ماہر اور مشاق
 ہے کہ اس کی ہر گھڑائی میں بہت خوشی اور شوق سے آؤ بھگت کی جاتی
 ہے، وہ سوسائٹی کا ایک لاڈلا بیٹا بن جاتا ہے اور بغیر اسے محسوس کیے کہ
 اس کی حیثیت کیا ہو گئی ہے وہ نہ اپنی روزی کی فکر کرتا ہے نہ اپنے نیلے

کوئی مناسب شغل نکالتا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک معترض کہتا ہے، ”وہ کوئی بڑا عالم نہیں، اپنی پرورش کا بار دوسروں پر ڈالنا بڑا آدمی بننا اسے خاص طور سے پسند ہے... جی ہاں، اس کا دل برف کی طرح سرد ہے، وہ اسے جانتا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے دل میں آگ ہی آگ ہے۔ بُرائی کی بات یہ ہے کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ اس کی ذات کو اس بات سے تو کوئی خطرہ نہیں، یہ تو ظاہر ہے، کیوں کہ وہ کسی داؤں پر اپنی ایک کافی کوڑی یا ٹوٹا بال تک نہیں لگاتا، مگر اور لوگ اس کے کمال پر اعتبار کر کے اپنی روح تک ایک داؤں پر لگا سکتے ہیں... ایک اور بُرائی کی بات یہ ہے کہ وہ کافی دیانت دار بھی نہیں، وہ ذہین آدمی ہے، اسے چاہیے کہ اپنے قول کی اہمیت محسوس کرے، ہر بات یہ سمجھ کر کرے کہ اس کی کچھ قیمت ہے... نوجوانوں کا جوشِ تقریریں کرنا معاف کیا جاسکتا ہے، مگر وہ دن کے سن میں کسی کا آپ اپنی تقریروں کا شور مچا کر طعنے اُٹھانا اور خواہ مخواہ بڑا آدمی بننا تو شرم کی بات ہے“۔ روڈن کی یہ تمام کمزوریاں ناول کی مختصر داستان میں واضح ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک رئیس خاتون کے یہاں جا کر مہمان ہوتا ہے اور اسے خاندان کی صحبت میں پانچ منٹ نہیں گزرتے کہ اس کا رعب سب پر ہو جاتا ہے اور سب اس کی حاضر جوابی، ذہانت، علم، شخصیت، اور خیالات کے قایل ہو جاتے ہیں اور جو نہیں ہوتے وہ اسے مجمع پر حاوی دیکھ کر خود ہی کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس مجمع میں صاحب خانہ کی

سترہ برس کی لڑکی نتاشا بھی شامل ہے۔ وہ روڈن کی شخصیت سے اور
 کی نسبت بہت زیادہ مرعوب ہوتی ہے، روڈن اسے کمالات کا مجسمہ
 معلوم ہوتا ہے اور وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیتی ہے کہ روڈن ہی وہ
 شخص ہے جو دنیا میں اس کی رہبری کر سکتا ہے اور اس کے قدموں پر
 اسے اپنی جاں نثار کر دینا چاہیے۔ روڈن خود بھی اتنا مردم شناس ہے
 کہ نتاشا کا جو ہر فوراً پہچان لیتا ہے اور اسے ظاہر کرنے میں مطلق تکلف
 نہیں کرتا، گو وہ نتاشا کا کسی طرح گرویدہ نہیں اور دوستی کے سوا اور
 کوئی تعلق نہ قائم کرنا چاہتا ہے نہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نتاشا
 کے نوجوان دل میں روڈن کی محبت عجیب عجیب کیفیتیں اور ہزاروں راز
 پیدا کر دیتی ہے، اور وہ ہنسی کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو دل و جان سے اس
 کے حوالے کر دوں گی۔ ایک مرتبہ جب دونوں شام کو چھپ کر ملے ہیں
 تو نتاشا کی ماں کا ایک اور مہمان انھیں دیکھ لیتا ہے اور صاحب خانہ کو
 سارے معاملات کی خبر ہو جاتی ہے۔ نتاشا کی ماں، جو روڈن کی بہت
 ہی معتقد تھی، یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بالکل مغفل ہے اور اسے کسی حال میں
 یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی لڑکی ایک غریب آدمی سے شادی کرے۔ یہی
 اس نے نتاشا کو دوسرے روز بلا کر سمجھا بھی دیا۔ مگر نتاشا یوں
 سر تسلیم خم کرنے پر راضی نہیں تھی اور اس امید میں کہ روڈن اسے
 خاندان کے پنجے سے رہا کرنے کی کوئی صورت نکالے گا اس نے ایک
 اور خفیہ ملاقات کے لیے وقت اور جگہ مقرر کی۔ ملاقات ہوئی تو اس نے

رودن کو سارا ماجرا سنا کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ رودن جانتا تھا کہ نتاشا کو اس سے بہت گہری محبت ہے، اسے اس کا بھی اندازہ تھا کہ نتاشا جیسی لڑکیوں کا جذبہ محبت کس قدر قوی ہوتا ہے اور اگر کوئی بہت اور ایثار کا قدردان مل جائے تو کوئی ایسا کرشمہ نہیں جو یہ جذبہ دکھا نہ سکے گا۔ رودن کا اپنا دل بھی نتاشا کی طرف بہت مائل تھا، لیکن وہ اپنی کمزوریوں سے واقف تھا، انتہائی غربت اسے کئی مرتبہ اپنی ڈراؤنی شکل دکھا چکی تھی اور اس وقت بھی اس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا سوا ایک حقیر سی جائیداد کے جس سے روپے کے بجائے مقدمے اور مفت کے جھگڑے وصول ہوتے تھے۔ وہ ہر صورت کوئی ایسی تدبیر نہیں کر سکا جسے نتاشا اور اس کے خاندان اور جان پہچان والے پسند کر سکتے تھے اور نتاشا کو مارا مارا پھرانا اسے کسی طرح منظور نہ تھا۔ اس لیے آخری ملاقات کے وقت وہ نتاشا کو بس یہ مشورہ دے سکا کہ اسے اپنی مان کی اطاعت کرنا چاہیے، اگرچہ اس کے معنی یہ تھے کہ نتاشا کو ان آرزوؤں کو خیر باد کہنا چاہیے جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ نتاشا نے مجبوراً یہی کیا۔ رودن بھی دل میں درد لیے ہوئے رخصت ہو گیا اور اس کے بعد کئی سال تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسے کہیں قدم جاکر ٹھہرنا، کسی مفید کام میں مصروف ہو جانا نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ ہر وقت اسی فکر میں پریشان رہتا تھا، اس کی عمر بالکل بے کار ضایع ہوئی۔ اگر کچھ شان تھی تو اس کی موت میں، کیونکہ ۱۸۴۸ میں

جب نیولین سوم نے فرانس میں جمہوریت کے بجائے اپنا ذاتی راج قائم کیا تو رودن اس کے خلاف بغاوت میں شریک ہوا اور سرخ جھنڈا ہاتھ میں لیے جمہوریت کے فدائیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے پیرس کی ایک سڑک پر مارا گیا۔ رودن کی سیرت پر مجموعی رائے قائم کرتے ہوئے روسی نقادوں نے اس بات کو سچا اہمیت دی ہے کہ وہ نتاشا کی محبت کا اہل ثابت نہیں ہوا اور اس کے جذبے کو اپنی اور قومی زندگی کی تعمیر کے کام میں نہیں لاسکا۔ لیکن نتاشا کی محبت ایک شخص کی آخری آزمائش تھی جس کی قسمت کا بہت پہلے فیصلہ ہو چکا تھا اور ناول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تو رگنیف رودن کو اس معاملے میں اتنا قابل خدمت نہیں سمجھتا جتنا ناول کے نقاد اور آخر میں حب رودن کا سارا بھرم کھل جاتا ہے، وہ اسی معترض کی زبانی جس کی رائے اوپر دی جا چکی ہے، رودن کی تعریف میں کہتا ہے، ”اس میں جوش اور امنگیں ہیں اور میری بات مانئے، میں تو کافی بلغمی آدمی ہوں، ہمارے زمانے میں یہ سب سے زیادہ قابل قدر صفت ہے۔ ہماری رب کی معقولیت، سرد مہری اور سستی اب حد سے گزر گئی ہے۔ ہم سوتے سوتے سردی کھا گئے ہیں، اور وہ شخص ہمارا محسن ہے جو ہمیں دم بھر کے لیے بھی جگا دے، ہمارے بدن میں گرمی پیدا کر دے... رودن خود کچھ نہیں کرتا ہے، کیونکہ اس میں جان نہیں ہے، خون نہیں ہے، لیکن یہ کہنے کا کس کو حق ہے کہ اس نے فائدہ نہیں پہنچایا ہے، اور اس کی تقریروں نے بہت سے بھلائی

کے بیچ ایسے نوجوانوں کے دلوں میں نہیں یو دیے ہیں جنہیں قدرت نے عملی استعداد اور اپنے امدادے پورے کرنے کی قوت سے محروم نہیں رکھا ہے؟“

رودن کی تصنیف کے تین سال بعد ریڈیوں کا اڈا شایع ہوا۔ یہ ناول بالکل اور ہی رنگ کا ہے۔ اس میں قومی مسائل پر بحث نہیں کی گئی ہے، اس کے قصے کا وہ پس منظر نہیں رکھا گیا ہے جو ”رودن“ یا ”صبح امید“ کا۔ اس کی دلچسپی کامرکز اس کی داستان ہے، اس کے کیرکٹر، اس کا پُر درد انجام فنی اعتبار سے تو رگینف کے کل جوہر اس ناول میں نظر آتے ہیں اور اگر قومی اور معاشرتی مسائل سے بے تعلق ہونا ایک خامی بھی سمجھی جائے تو اس میں بے شمار خوبیاں ہیں جو اس کی تلافی کر سکتی ہیں۔ اس کا ہیرو لاف ریڈز کی ان ریڈیوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جن کی تربیت اور تعلیم نے انہیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ کوئی صحیح مسلک اختیار کریں اور اپنی زندگی کو مفید یا کامیاب بنائیں۔ لاف ریڈز کی کا باپ اسے بچپن میں اسکاستان کے پہاڑیوں کا لباس جس میں گھنٹے کھلے رہتے ہیں، پہنا یا کرتا تھا، اس خیال سے کہ بچہ مضبوط ہو جائے گا۔ نوجوانی میں اسے عورتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنا سکھایا گیا، کہ آگے چل کر وہ اپنا مردانہ وقار قائم رکھ سکے۔ لاف ریڈز کی بعد کو یونیورسٹی میں داخل ہوا، اسے مطالعہ کا شوق تھا، اور اس نے کتب بینی کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ مگر سیرت میں

جو عیب غلط اور بے اصول تربیت پیدا کر دیتی ہو وہ محض کتب بینی اور مطالعہ کا شوق نہیں دور کر سکتا۔ لاف ریٹز کی نے شروع ہی میں ایک ایسی فحاشی کی جس نے اس کی زندگی چوہٹ کر دی اور ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے کے سوا اسے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ باپ کی تعلیم نے اسے عورتوں سے الگ رکھا تھا اور یوں اسے وہ تجربہ حاصل نہ ہو سکا جس کے بغیر ازدواجی زندگی کی بنیاد بہت کمزور رہتی ہے، بلکہ اکثر قایم ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ بیوی کے انتخاب میں جو غلطی ہوتی ہے اس کی تلافی کے لیے بعد کو کوئی صورت نکالنا محال ہو جاتا ہے۔ لاف ریٹز کی کے ساتھ یہی پیش آیا۔ اس نے ماسکو کے ٹیٹر میں ایک لڑکی دیکھی، اس پر عاشق ہو گیا اور بغیر اس کی سیرت پر غور کیے جلدی سے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کی بیوی وارورا پافوفنا، نہایت اوجھی، عیار اور فضول خرچ لڑکی تھی، جس کا دنیا میں بس یہ حوصلہ تھا کہ اپنے گرد بہت سے مرد جمع کرے، ان کی زبان سے اپنی تعریف سنتی رہے اور لباس اور اداؤں کے حق سے ان کو اپنا گردیدہ بنائے۔ شادی کے چند سال بعد تک لاف ریٹز کی پیرس میں رہا اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پیرس کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا، اُس کی بیوی بھی ساتھ تھی، مگر وہ اس کے معاملہ میں مطلق دخل نہیں دیتا تھا۔ اتفاق سے اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی کی ایک فرانسسیسی سے آشنائی ہے، اور یہ آشنائی اتنی گہری ہو گئی ہے کہ اب کسی حُسنِ ظن کی گنجائش بھی نہیں۔ اس واقعہ سے لاف ریٹز کی

کے دل پر سخت چوٹ لگی، وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اٹالیہ چلا گیا اور چار سال تک وہاں کسی گائو میں پڑا رہا، اس کے بعد وہ وطن واپس آیا اور اپنے گائو میں جو شہر او... کے قریب تھا، جانے سے پہلے وہ اپنی ایک دور کی رشتہ دار ماریا دمیتروفا سے، جس کا مکان شہر میں تھا کھلے گیا یہاں اس کی ماریا دمیتروفا کی بڑی لڑکی لیزا سے ملاقات ہوئی اور چند روز کے اندر ہی اسے لیزا سے بہت محبت ہو گئی۔ اس دوران میں لاف ریٹز کی کے پاس ایک اخبار آیا جس میں اس کی بیوی کے مرنے کی خبر تھی۔ لاف ریٹز کی نے اپنے آپ کو آزاد پا کر لیزا کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کیا اور اس نے اپنے منگیتر کو جو اسے ناپسند نہیں تھا جواب دے دیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب ایک روز اچانک لاف ریٹز کی کی بیوی پہنچ گئی اور اس کی ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔ لیزا سے شادی کرنے کی اب کوئی صورت نہ تھی، لاف ریٹز کی نے بیوی کے رہنے کے لیے ایک گائو میں انتظام کر دیا اور خود کچھ دنوں آوارہ گردی کرنے کے بعد زراعت میں مشغول ہو گیا۔ لیزا سے جدا ہو کر اسے نہ چین کی امید تھی نہ چین ملا۔ اسے زندگی بالکل دو بھر ہو گئی، مگر اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ اپنے دن کسی نہ کسی طرح گزار دے اس کی بیوی کچھ دن گائو میں ہی پھر پتیر برگ چلی گئی اور آخر میں پیرس جا کر وہیں ٹھہر گئی۔ ایک زمانے میں روسی رہیں اپنے اڈے یوں ہی بنایا کرتے تھے۔

ناول کی ہیروئن لیزا ان معمولی ہستیوں میں سے جو جن میں کوئی کیف

کے قلم نے بغیر کسی مبالغے یا کسی نادخصوصیت بر بھر دسہ کے ایک عیب
 دل کشی پیدا کر دی اور اس کی شخصیت بہت ہی پیاری بنا دی ہے۔ لیرا
 نہ خوب صورت ہے نہ ذہین نہ شوخ۔ چند سوانہی صفتوں کے سوا اس میں
 کچھ بھی نہیں جو دل یا نظر پر خاص اثر ڈال سکے، اور یہ صفتیں بھی ایسی نہیں
 ہیں جو فوراً محسوس ہوں۔ لیکن ناول پڑھنے والے کو شروع ہی سے لیرا
 سے ایک لگاؤ ہو جاتا ہے جو کسی انوکھی یا نمایاں خصوصیت کا اثر نہیں ہوتا
 بلکہ محض ایک جذبہ ہے جو ایک انسان کو دوسرے کی طرف کھینچتا ہے ایک
 دل کو دوسرے سے ملا دیتا ہے، اور ہم خود نہیں سمجھ سکتے کیوں۔ یہ تو
 روسی حقیقت نگاری کی عام صفت ہے کہ وہ معمولی انسانوں، معمولی دھڑتوں
 کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ وہ دل چسپ اور نرے معلوم ہونے لگتے ہیں،
 لیکن تورگینف کے قلم نے جس معجز نگاری سے کیرکٹروں کی تصویر دکھائی
 ہے، جس انداز سے وہ رفتہ رفتہ ہمیں ان کی شخصیت اور زندگی کی طرف
 متوجہ کر کے ہمارے دلوں کو محبت اور ہمدردی سے لبریز کرتا ہے، وہ
 کچھ اور ہی چیز ہے اور تورگینف کے کمال کی لیرا سے بڑھ کر کوئی مثال
 نہیں۔ لیرا کی داستان بھی بہت دردناک ہے۔ اس کے دنیاوی حوصلے
 بہت کم تھے، اپنی نسبت اسے کوئی ایسا مغالطہ نہیں تھا جس کی بنا پر
 وہ تقدیر سے کسی خاص رعایت کا تقاضا کرتی یا دنیا میں کسی خاص
 قدر دانی یا کامیابی کی امید کرتی۔ وہ نیک، خدا ترس اور اطاعت گزار
 تھی، جیسے روس میں سادہ لوح اور شریف طبیعت کی لڑکیاں عموماً ہوتی

کرتی تھیں، پابندی سے گر جا جایا کرتی تھی اور ہر مصیبت کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتی تھی۔ اسے نہ یہ خواہش تھی نہ اس کی امید کہ اس کا شوہر کوئی غیر معمولی شخص ہوگا، اس کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت کو محبت کیش اور وفادار ہونا چاہیے اور اس کی شادی کسی سے بھی ہوتی، وہ یہ اصول پر تنے کو تیار تھی۔ لاف ریٹز کی نے اسے یہ سکھایا کہ اس شخص سے شادی کرنا غلط ہے جس سے کوئی خاص نگاؤ نہ ہو، اور جس کی محبت سے یہ توقع نہ کی جاسکے کہ وہ زمانے کے ساتھ بڑھتی اور گہری ہوتی جائے گی۔ نیز اس اصول کی بالکل قایل تو نہیں ہوئی، لیکن اس تعلیم کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے منگیتر کو جواب دے دیا۔ لاف ریٹز کی سے اس کو محبت پہلے سے تھی، منگیتر کو جواب دینے کے بعد جب لاف ریٹز کی سے شادی ہونا طے پا گیا تو اس کی محبت اور بڑھ گئی۔ مگر جب عین وقت پر لاف ریٹز کی کی بیوی نے آکر ساری تدبیریں الٹ دیں تو نیز نے اس کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھا اور دنیا کو خیر باد کہہ کر عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی۔

قصہ ختم کرتے ہوئے تو ریٹف لکھتا ہے: ”کہتے ہیں ایک بار لاف ریٹز کی اس دور افتادہ خانقاہ میں بھی گیا جہاں نیز روپوش ہوئی تھی اور اسے دیکھا بھی۔ مگر جہاں ایک حصے سے دوسرے کی طرف جاتے ہوئے وہ بالکل اس کے پاس سے گزری، مگر لاف ریٹز کی کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا... اس وقت ان دونوں کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی؟ یہ کون معلوم کر سکتا ہے، کون بیان کر سکتا ہے؟ زندگی میں ایسے لمحے ایسی

کیفیتیں ہوتی ہیں... ہم ان کی طرف گزرتے ہوئے اشارہ کر سکتے ہیں اور پس۔
 ”صبح امید کی ہیر و من یے لینا نیزا کے مقابلے میں بالکل ہی اور سیرت
 اور خیالات رکھتی ہے۔ اس نے اپنے روز نامے میں ایک موقع پر لکھا ہے:
 مد کا سن کہ مجھ سے کوئی یہ کہنے والا ہوتا کہ دیکھ، تجھے یہ کرنا چاہیے، طبیعت
 کا اچھا ہونا کوئی خاص خوبی کی بات نہیں، بھلائی کرنا... ہاں زندگی
 میں اصل چیز یہی ہے جس ماحول میں وہ رہتی ہے اس میں اس کی آرزوئیاں
 پوری ہونے کی مطلق کوئی صورت نہیں۔ اس کا باپ جو فلسفی کہلاتا ہے اور
 فلسفی کہلانا بہت پسند کرتا ہے، اپنی بیوی کی صحبت سے اکتا گیا ہے اور
 زیادہ تر وقت ایک بد چلن بیوہ کے یہاں گزارتا ہے جس سے اس کی آشنائی
 ہے۔ یے لینا کی ماں ایک نازک مزاج کمزور اعصاب کی اور بے مغز عورت
 ہے جس کا اپنی بیمار داری کے سوا دنیا میں اور کوئی شغل نہیں۔ بزرگوں
 میں ایک حضرت افکارِ ادا نو وچ، یے لینا کے دور کے رشتہ دار بھی ہیں
 جو ہر وقت کرسی پر ڈٹے رہتے ہیں اور ہر شخص سے ڈانٹ کر کہا کرتے
 ہیں کہ ہمیں مت چھڑو۔ یے لینا کے مکان میں ایک نوجوان باؤل یا کوف
 لے وچ شوہن بھی رہتا ہے جو اس کی ماں کا ایک عزیز ہے اور وہی اس کو
 خرچ دیتی ہے۔ ایک اور نوجوان، آذرے نی پترو وچ بر سینٹ یونیورسٹی
 کا طالب علم، جسے بہت گہرا علمی ذوق ہے اور جو پروفیسر بننے کی تیاری کر رہا
 ہے اکثر یے لینا سے ملنے آتا ہے، ان دونوں کے سوا یے لینا کو اور کوئی صحبت
 نہیں ملتی اور یہ دونوں بھی کچھ ایسے ویسے ہی ہیں۔ شوہن ہر وقت مسخرے پن

کی باتیں کیا کرتا ہی برسیف کو صرف اپنی کتابوں سے دیکھی ہے۔ یہ ماحول
یہ لینا کے لیے بہت تنگ ہے اور وہ ایسے شخص کی امیدیں رہتی ہیں جو اس
کی قدر کرے، جس کے اعلیٰ حوصلے ہوں اور جو انہیں پورا کرنے کے لیے
اس کی مدد مانگے۔ شو بن یہ لینا کی نسبت برسیف سے کہتا ہے معکسی دیکھی
کی وہ منتظر تو ہر صورت سے ہے۔۔۔ تم سمجھ ان الفاظ کا پورا مطلب: وہ
منتظر ہے!“ آخر کار وہ شخص جس کی یہ لینا منتظر تھی، نظر آیا۔ وہ ایک
بلغاریہ۔ وطن پرست، دمیتری ان سروف ہے، جس نے اپنی زندگی اپنی
قوم کی خدمت اور اپنے وطن کو ترکوں سے آزاد کرنے کے لیے وقف
کر دی ہے۔ چند ملاقاتوں کے بعد ہی ان سروف اور یہ لینا میں گہری
دوستی ہو گئی۔ یہ لینا نے تہیہ کر لیا کہ ان سروف کی شریک کار ہو کر اس
کی خدمت اور مدد کروں گی اور ہر مصیبت میں اس کا ساتھ دوں گی،
اس نیت سے اس نے ان سروف سے شادی کر لی، اور گھر، عزیز و
اقارب اور وطن چھوڑ کر اس کے ساتھ بلغاریہ کے لیے روانہ ہو گئی۔

میدانِ عمل میں قدم رکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ان سروف کو موت
نے آگھیرا، مگر یہ لینا اپنے ارادے پر قائم رہی اور اس جنگ میں جو
بلغاریوں اور ترکوں میں چھڑ گئی تھی، بلغاریہ سپاہیوں کی تیمارداری
میں مشغول ہو گئی۔ ان سروف کا انتقال شہر وے نس میں ہوا تھا یہیں
سے یہ لینا نے اپنے والدین کو اپنے ارادے سے مطلع کیا اور بعد کو
اس کی نسبت صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ زخمی سپاہیوں کی تیمارداری

کرتی رہی۔ پھر کیا ہوا یہ کوئی بتا نہ سکا۔

یہ لینا کی ہمت اور جوش ایثار ہی وہ مردہ ہر جس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے تورگنیف نے اپنے ناول کا عنوان ”صبح امید“ رکھا ہے، اس کے سوا ناول کا جو علمی اور تبلیغی رنگ ہے وہ بہت کچا ہے اور جلد اڑ جانے والا۔ ان سرف کے سیرت اور شخصیت میں نہ اصلیت ہے نہ جان اور محض یہ بات کہ وہ روسی نہیں بلغاری ہے اس کی دلیل ہے کہ تورگنیف اس کی سیرت کی تصویر کھینچنے میں زیادہ کامیابی کی امید نہیں رکھتا تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان سرف کا کیرکٹر تورگنیف کی اپنی ایجاد نہیں، بلکہ سلاف دوستی کی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے ایک صاحب کی فرمائش پر تیار کیا گیا۔ فرمائش کے ساتھ ہی تورگنیف کو وہ اوصاف بھی بتا دیے گئے تھے جن سے اس کے خیالی ہیرو کو آراستہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بجز اس کے کہ ان سرف کا کیرکٹر مصنوعی ہے اور اپنے ماحول میں بالکل نہیں بکھپتا ”صبح امید“ میں کوئی اور نقص نہیں اور فنی اعتبار سے وہ ناول نویسی کے کرشموں میں سے ہے۔ ہر کیرکٹر ہر منظر، ہر گفتگو تورگنیف کی نکتہ رسی، حقیقت بینی اور معجز نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے، وہ خاص فضا جس کی تنگی اور گرائی تورگنیف اس قدر محسوس کرتا تھا ناول میں اپنی کل کیفیت کے ساتھ پیدا کر دی گئی ہے، وہ لوگ جن سے تورگنیف کو ایسی محبت اور اتنی شکایتیں تھیں وہ یہ نظر آتے ہیں، اور پڑھنے والے کے سامنے ان کی زندگی

کی داستان اس طرح پیش کر دی جاتی ہے کہ دیکھے ہوئے اور سنے ہوئے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ دیکھے اور فارادانود چ، جن کا جمود لیے لینا کی سیاسی کیفیت کا پورا جواب ہے، خود مع اپنے فلسفہ حیات اور طرز زندگی کے کس کمال کے ساتھ چند جملوں میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

شوبن نے ان سے ایک بات کہی ہے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”افرادانود چ نے کانکھ کر کہا ”تم سے کہتے ہیں ہم کو

مت چھڑو...“ شوبن نے فقہ لگایا اور بھاگ گیا۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ چلائے ”ارے او۔ وہی...“

دود کا گلاس۔“ لڑکا کشتی میں دود کا اور اس کے

ساتھ کھانے کے لیے سوکھی مچھلی لایا۔ افرادانود چ

نے آہستہ سے کشتی میں سے گلاس لیا اور دیر تک بڑی

توجہ سے اس کی طرف دیکھتے رہے، گویا ان کی سمجھ

میں نہیں آیا کہ ان کے ہاتھ میں کیا چیز ہے۔ پھر انھوں

نے لڑکے کی طرف دیکھا اور پوچھا ”تیرا نام داسکا ہے نا؟“

اس کے بعد انھوں نے غمگین صورت بنا کر دود کا پیالہ کچھ

مچھلی کھائی اور حیب سے رومال نکالنے کے لیے ہاتھ

بڑھایا۔ خادم نے کشتی اور دود کا کی صراحی لے جا کر

اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دی، جو مچھلی باقی بچی تھی وہ

کھالی اور اپنے آقا کا نباؤہ اوڑھ کر سو بھی گیا، مسگر

اوفار ادا نوچ اسی طرح استعلیٰ پرناک کے سامنے رومال
رکھے بیٹھے رہے اور کبھی کھڑکی کے باہر کبھی زمین، کبھی
دیواروں کو دیکھتے رہے۔“

ناول کے آخر میں تورگنیف انھیں بزرگ کے ذریعہ سے اپنی
مایوسی اور اپنا درد ظاہر کرتا ہے، ایسی طرح کہ ہر روشن ضمیر روسی کے
دل پر سخت چوٹ لگے۔

”شوہن نے کچھ دن ہوئے اوفار ادا نوچ کو لکھا تھا: ”آپ کو
یاد ہے میں نے اس وقت آپ سے پوچھا تھا، ”کیا ہم میں بھی کبھی مرد آدمی
پیدا ہوں گے“ اور آپ نے جواب دیا تھا، ”ہاں ہوں گے“... اور اب
میں اس دور کے مقام سے... پھر پوچھتا ہوں، ”بتائیے، اوفار ادا
نوچ، ہم میں بھی کبھی مرد آدمی پیدا ہوں گے؟“
اوفار ادا نوچ نے انگلیاں بچائیں اور سامنے آسمان کی طرف
دیکھنے لگے۔“

جن مردوں کی نسبت شوہن نے دریافت کیا اور اوفار ادا
نوچ نے جواب میں انگلیاں بچائیں وہ تو کبھی پیدا نہیں ہوئے،
لیکن روسی زندگی میں ایک اور منظر نمودار ہوا۔ یہ ایک خاص بدبختی
کے لوگ تھے جن کا وجود انشا پر دازوں میں سب سے پہلے تورگنیف
نے محسوس کیا اور جن کی سیرت اور فلسفہ حیات کو سب سے پہلے اس نے
لے جب بے لینا کی ان سرفت سے شادی ہوئی تھی۔

بیان کیا۔ یہ لوگ ”منکر“ تھے اور ان کے عقیدے ”منکرت“ کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے ناول ”باپ بیٹوں“ میں، تو رگینٹ نے بازاروف کی شکل میں منکروں کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا اور اس کی سرگزشت میں منکرت کے اصولوں کی عملی صورت دکھلائی۔ بازاروف یونیورسٹی میں طبیعیات کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، طبیعیات کے علاوہ کیمیا، نباتیات، حیاتیات تشریح اور طب میں بھی اس کی معلومات خاصی تھیں اور طالب علموں کے حلقوں میں علم اور ذہانت کی بنا پر اس کا بہت ادب کیا جاتا تھا۔ تو رگینٹ اپنی داستان یوں شروع کرتا ہے کہ بازاروف اپنے ایک معتقد اور دوست آرکا دی کرسانوف کے یہاں چھٹیاں گزارنے کو جاتا ہے اور وہاں اس کی آرکا دی کے باپ اور چچا سے ملاقات ہوتی ہے۔ آرکا دی کا باپ تو ایک سیدھا سادہ پودا اور کمزور آدمی، یا بقول بازاروف ”اللہ میاں کی گاتے“ ہے اور اپنے بیٹے اور اس کے دوست کے خیالات اور فلسفہ حیات معلوم کر کے فرض کر لیتا ہے کہ جو وہ دونوں کہتے ہیں ٹھیک ہوگا اور گو اس کی عمر چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہے ان نوجوانوں کا رنگ دیکھ کر وہ خود ہی اقرار کر لیتا ہے کہ میں بڑھا گیا ہوں اور نئے خیالات اور حالات پر رائے دینے کے لائق نہیں رہا۔ لیکن پاول کرسانوف، آرکا دی کا چچا، جو جوانی میں بہت حسین اور رنگیلا آدمی تھا، فوج میں افسر رہ چکا تھا اور رئیسانہ آداب اور اخلاق سے صرف واقف نہیں ہے بلکہ ان کے برتنے پر اصرار کرتا ہے، فوراً آرکا دی اور اس کے

استاد بازاروف کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تینوں میں بحثیں ہوتی ہیں اور ان کے ذریعے سے تو رنگینف منکروں کی ذہنیت اور ان کا فلسفہ حیات بیان کرتا ہے۔ بازاروف کہتا ہے: ”پہلے ہم شکایت کرنے تھے کہ ہمارے یہاں ریاست کے ملازم رشوت لیتے ہیں، ہمارے یہاں سڑکیں نہیں، تجارت نہیں، عدالت میں انصاف نہیں کیا جاتا... اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ محض بکو اس کرنا... نفیول ہے... ہم نے دیکھ لیا کہ وہ لوگ جو لایق اور عقلمند کہلاتے ہیں... کسی مصرفت کے نہیں، ہم لغویات میں پھنسے ہیں؟ ایک چیز ہے آرٹ کہتے ہیں اس پر تعمیر اور تشکیل زندگی کی خلقی ہنگاموں پر، پارلیمنٹ اور وکلاء کے معاملات اور خدا جانے اور کن کن مسائل پر بائیں کیا کرتے ہیں، جب اصل دشواری پیٹ پائنا ہے، جب وحشیانہ ادب پرستی ہمارے ذہن کا گلا گھونٹے دیتی ہے، جب ہماری تجارتی کمپنیاں محض اس وجہ سے بیٹھ جاتی ہیں کہ ایماندار آدمی ڈھونڈے نہیں ملے، جب خود اس آزادی کا جس کے لیے ریاست اتنی کوشش کر رہی ہے مفید ہونا اتنا مشتبہ ہے، کیونکہ ہمارا کسان خوشی سے اپنی جیب کرنے پر تیار ہے کہ مہ خانے میں جا کر شراب پیے اور بے ہوش ہو جائے۔“ اس بنا پر بازاروف ہر چیز پر جو صرف نچا فائدہ مند نہیں ہے اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، وہ اپنے آپ کو ”منکر“ کہتا ہے، اور انکار کے معنے ہیں ”کسی بات کو تسلیم نہ کرنا“ یا جیسا کہ اس کے مخالف پاول کرسانوف کا قول ہے: ”کسی چیز کا احترام نہ کرنا“ عموماً وہ لوگ جو مذہبی عقیدوں کو

فضول اور مہل سمجھے ہیں، سائنس سے بہت مرعوب ہوتے ہیں، لیکن سائنس کے متعلق بھی بازاروں کے خیالات منکریت سے بالکل بری نہیں۔ وہ ایک موقع پر کہتا ہے ”میں نے عرض کر دیا ہے کہ میں کسی چیز کا معتقد نہیں ہوں، اور سائنس ہی کیا چیز؟ مختلف علوم تو ہیں، جیسے مختلف پیٹے اور معاش کے ذریعے، لیکن سائنس کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں“ ظاہر ہے آرٹ اور ادب اور صن کو وہ کن نگاہوں سے دیکھتا ہو گا۔ آرٹ اس کے نزدیک ”یا روپیہ کمانے کا طریقہ ہے یا ایک بیماری ہے، اور کچھ نہیں“ مناظرِ فطرت میں اسے کوئی حق نظر نہیں آتا، فطرت کوئی دیر یا حرم نہیں بلکہ کارخانہ ہے اور انسان اس کارخانے کا ایک مزدور ہے۔ بازاروں فلسفے کو ”صریحی رومانیت“ یعنی جذبات پرستی قرار دیتا ہے اور تاریخ کو بالکل بیکار بتاتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر بھی وہی بھوکا ہوتا منہ میں روٹی ڈال سکتا ہے۔ وہ رسمیں جن کا انسان وحشت اور جاہلیت کے زمانے سے پابند رہا ہے، زندگی کے وہ طریقے، اخلاق کے وہ اصول جو تجربے اور غور و فکر اور مذہب نے سکھائے ہیں بازاروں کے ”انکار“ سے محفوظ نہیں رہتے۔ جب اس کا جیلا یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اس کے باپ کو اس لڑکی سے جسے اس نے اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے نکاح کر لینا چاہیے تو بازاروں کو بہت حیرت ہوتی ہے۔ ”تم بھی نکاح کی رسم کو اہمیت دیتے ہو! مجھے یہ توقع نہ تھی کہ تمہارے خیالات ایسے ہوں گے“ اپنے ماں باپ کا نہ بازاروں کا ظکر تا ہے نہ ادب،

نہ کسی بات سے یہ ظاہر ہونے دیتا ہے کہ اس کو ان سے ذرا بھی محبت ہے،
 کیوں کہ وہ خاندان اور عزیز داری اور ان جذبات کو جو اسے قائم رکھتے
 ہیں کیساں لغو اور فضول سمجھتا ہے؟ ”گوشت کی بوٹی کیسا وی نقطہ نظر
 سے بھی روٹی کے ٹکڑے سے بہتر ہے“ اور اس بنا پر بازار و ف آسائش
 اور آرام کو نفس کشی پر ترجیح دیتا ہے، روسی کسانوں کی مظلومیت اور
 بے کسی دیکھ کر اس کا دل درد سے بھر نہیں آتا، بلکہ وہ ہر موقع پر کسان کی
 جالاکا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے پر تاؤ میں کوئی ہمدردی یا محبت نظر نہیں آتی۔
 ”باپ بیٹے“ کی داستان بازار و ف کی سیرت اور اس کے عقیدوں
 کے مضبوط اور کمزور، غلط اور صحیح پہلو دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی
 اس میں پُرانا فلسفہ حیات اور پُرانے طرز کے لوگ بھی بڑی خوبی سے
 بطور پس منظر کے رکھے گئے ہیں۔ کرسانوف کے خاندان میں منکریت کا
 نشتر کسی قدر جہانی اور ذہنی اصلاح کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ وہ امر من
 جو امیری اور بے فکری نے پیدا کیے ہیں آخر کار بازار و ف کے اثر پر
 غالب آجاتے ہیں اور بازار و ف کا خاص چیلہ آر کاوی کرسانوف بھی
 اسے بعد کو اس طرح بھولتا ہے کہ یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بازار و ف
 اپنے ماں باپ کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہ اس کے عقیدوں کے اعتبار
 سے صحیح ہے، مگر ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے، ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بہت
 کٹر آدمی ہے اور اس کی طبیعت اور خیالات میں لوچ بہت کم ہے۔
 سب سے زیادہ دل چسپ بازار و ف کا جنسی فلسفہ ہے۔ وہ عشق کو

ڈھکوسلا سمجھتا ہے، کسی اخلاقی قاعدے اور اصول کو صحیح اور قابلِ تقلید تسلیم نہیں کرتا اور جب وہ کسی خوب صورت عورت کو دیکھتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے محل میں لے جا کر اس کی چیر بھاڑ کرے۔ لیکن ایسے خیالات اور ایسا مذاق رکھتے ہوئے بھی جب وہ آتنا الگ سے یغنا اوون ٹسوف سے ملتا ہے اور اپنے چیلے آرکا دی کے ساتھ جا کر چند روز اس کے یہاں مہمان رہتا ہے تو اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو ایک عاشق زار کی، اپنے ارادے کی پوری قوت عمل میں لا کر بھی وہ بڑی مشکل سے اپنی طبیعت پر قابو پاتا ہے اور اس کے عشق کی جو کیفیت تھی وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مرنے وقت اس کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آتنا الگ سے یغنا کو کسی طرح آخری بار دیکھ لوں۔

تورگینف نے اس ناول کی اشاعت کے بعد ایک خط میں لکھا تھا: ”آرٹ کے سوا ہر مسئلے میں مجھے بازاروف کے خیالات سے اتفاق ہے“ اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اپنے ہیرو کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا ہے اور اس کی سرگزشت بہت ہمدردی کے ساتھ سنائی ہے۔ پی سارف، جو اس زمانے میں انتہا پسند گروہ کا رہنما تھا اور روس کا بہترین نقاد، اپنے مضامین میں ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ بازاروف منکروں اور منکریت کا سچا نمونہ ہے اور تورگینف نے اسے بہت صحیح اور اچھے طریقے سے پیش کیا ہے مگر وہ طوفان جو ناول کی اشاعت کے وقت برپا ہوا کسی طرح نہ ختم سکا۔ قدامت پسند

لوگ تورگنیف سے اس بات پر خفا ہوئے کہ اس نے بلاوجہ پُرانے طرز کے لوگوں اور ان کے خیالات کا مذاق اڑایا ہے، انتہا پسند لوجوانوں کا فرقہ یہ سمجھ کر خفا ہو گیا کہ تورگنیف نے روسی زندگی کے نئے منظر، یعنی منکرت کی توہین کی ہے۔ اصل میں دونوں غلطی پر تھے، لیکن تورگنیف اپنا مطلب سمجھا نہ سکا اور دونوں گروہوں میں اس کی ساکھ جاتی رہی۔

تورگنیف کی مایوسی اور ناظرین کی غلط فہمی سے اس کے دل پر جو چوٹ لگی تھی وہ اس کے ناول ”دھوئیں“ میں بہت عاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ”دھوئیں“ ایک عشقیہ داستان ہے، اس میں قومی مسائل کا ذکر آتا ہے تو محض ضمناً اور ایسے طنزیہ انداز میں کہ بس بے کار لوگوں کی بک بھک معلوم ہوتا ہے۔ ناول کا ہیرو لتوی نوٹ ایک شریعتاً طبیعت کا، تعلیم یافتہ اور کسی قدر حوصلہ مند آدمی ہے، روسی زمیندار کا ایک اچھا نمونہ، مگر انھیں کی طرح عملی استعداد سے بالکل محروم، ناول کی ہیروئن ایرینا پافلوفنا ایک حسین، ذہین، جذیلی اور چالاک عورت ہے جس کی روسی طبیعت پر یورپی تہذیب کا اثر کچھ مفید نہیں ثابت ہوا ہے۔ ایرینا خاندان کی بہت اچھی مگر مفلس لڑکی تھی، لتوی نوٹ اس کی غربت کے زمانے میں اس سے ملا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ ایرینا کے ماں باپ ان کی شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئے اور چند سال کے بعد جب لتوی نوٹ کی ایرینا سے پھر ملاقات ہوئی تو وہ بالکل ہی اور رنگ میں نظر آئی۔ جن نے اسے غربت کی

پابندیوں اور مجبوریوں سے چھڑا دیا تھا اور سوسائٹی میں وہ ایسی کامیاب ہوئی تھی کہ خبرل رات میروٹ نے، جو ایک بڑے عہدے پر مسمور تھا، اس سے شادی بھی کر لی۔ ازدواجی زندگی اور امیرانہ رہن سہن نے ایرینا کی آزادی میں فرق نہیں ڈالا، اس کے مکان پر ہر قسم کے لوگ، امیر اور غریب، بانکے چھیلے اور پھٹے حال جمع ہوتے تھے اور وہ سب سے یکساں بے تکلفی سے پیش آتی۔ لتوی ٹوٹ کے عشق کی ساری کیفیت اسے معلوم تھی اور جرمنی کے شہر بادن میں جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایرینا نے لتوی ٹوٹ کو اپنے شیدائیوں کے زمرے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی۔ تھوڑے عرصے تک تو وہ کامیاب رہی اور لتوی ٹوٹ کو خود داری اور عشق کی کشاکش نے بہت حیران کیا۔ مگر آخر میں اس کی خود داری کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ایرینا سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ ایرینا کو بھی لتوی ٹوٹ سے محبت تھی، لیکن دولت کی ہوس اور مردوں کے دل بھانے کا شوق اس کی طبیعت پر ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وفا شعار می کے لیے گنجائش ہی نہیں رہی۔ لتوی ٹوٹ سے جدا ہونے کے بعد وہ روسی دارالسلطنت کی سوسائٹی پر راج کرتی رہی، اس کا حق ہر ایک سے تعریف کا خراج وصول کرتا رہا۔ مگر سب اس کی تیزی اور تنگ مزاجی سے ڈرتے بھی تھے اور جو حقوق بہت لگاؤ پیدا ہوتا اسے یہ خوف زائل کر دیتا۔

تورگینف کی اپنی عمر کا ایک خاصا حصہ ایک خاتون کی خدمت گزاری میں صرف ہوا جن کی سیرت اور شخصیت ایرینا سے بہت متاثر تھی، اور لتوی نوف کی سرگزشت تورگینف کی آپ بیتی سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن ”دھویں“ کے ہیرو اور ہیروئن روسی سوسائیٹ کے کوئی غیر معمولی منظر نہیں۔ ایرینا کی سیرت میں جو خود غرضی، امارت، عیش پسندی اور اعلیٰ اخلاق کی طرف سے بے پروائی ہے، امیر روسی عورتوں میں عام طور سے پائی جاتی تھی اور عموماً ایرینا کی بہ نسبت زیادہ شوخ اور ناگوار شکلوں میں۔ تورگینف نے ایرینا کی سیرت میں طبیعت کی آزادی، مساوات پسندی اور جذبہ جلیے پن کی جو آمیزش کی ہے وہ ایرینا کی ہستی کو بہت نرالی اور دل فریب بنا دیتی ہے۔ وہ ہرگز ان نسوانی کیرکٹروں میں سے نہیں ہے جنہیں تورگینف نے قومی زندگی میں رونق اور وطن پرستوں کے دلوں میں ولولے پیدا کرنے کے لیے خالگی زندگی کے تنگ حلقے سے نکال کر ادبی دنیا میں جلوہ افروز کیا مگر تورگینف کا کوئی کیرکٹر اس خوبی اور ادائیت سے نہیں بیان کیا گیا ہے جیسے ایرینا کا۔ اس سے محبت ہونا مشکل ہے لیکن اس کے حسن اور ذہانت کے رعب کا دل سے نقش مٹانا بھی دشوار ہو جاتا ہے اور اگرچہ اسے زندگی میں کوئی ایسے صدمہ نہیں پہنچے کہ ہم اس سے ہمدردی کریں، لیکن اس کی حسرتیں اور آرزوئیاں، اس کے اعلیٰ جذبول کا ادنیٰ اغراض پر نثار ہونا دل میں درد ضرور

پیدا کرتا ہے۔

”دھویں“ کی تصنیف کے بعد تورگینف کی توجہ پھر قومی مسائل کی طرف منتقل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے جس کے آغاز کی تاب پٹیوں میں قوم کو خبر دی گئی تھی اور اسی ذہنیت کے لوگ نے جن کا مثالی نمونہ تورگینف نے بازارِ دون کی شکل میں پیش کیا تھا روس کی سیاسی زندگی پر حاوی ہو گئے۔ ان لوگوں کی ہمت اور ان کے ایثار نے جس طرح سے ریاست کے جبر کا منہ چڑھایا، جس ہمت سے اُنھوں نے اپنی سڑکیاں بھگتیں، جس استقلال سے اپنے عقیدوں پر قائم اور اپنے کام میں محو رہے اس سے تورگینف بہت مرعوب ہوا اور گوان لوگوں کے طرزِ عمل سے اسے پورا اتفاق نہیں تھا، قوم کی بیداری نے اس کے دل میں بھی امیدیں پیدا کر دیں۔ ”اچھوتی زمین“ تورگینف کا آخری ناول جو اس تحریک کے اثر میں لکھا گیا، ایک لحاظ سے کسی قدر بعد از وقت ہے۔ جب وہ تصنیف کیا گیا تو یہ تحریک ترقی کر چکی تھی اور اس نے بالکل دوسری اور بہت زیادہ مکمل صورت اختیار کر لی تھی، مگر تورگینف نے اسے شروع ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ وہ ان شخصیتوں کا خاکہ نہیں اُتار سکا جو ناول کی تصنیف کے زمانے میں اس تحریک کی رہبری کر رہی تھیں اور جن کی ذات ہی دراصل ایسی تحریکوں کو حقیقت کا رنگ روپ دے سکتی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تورگینف کا مقصد محض ایک خاص تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانا تھا تو

”اچھوتی زمین“ کوئی خاص وقت نہیں رکھتی۔ مگر تورگنیف نے اپنا مقصد محدود نہیں رکھا، روس کے معاصر واقعات صرف ایک محرک تھے جنہوں نے اسے روسی تحریک کے ایک نئے پہلو کی طرف متوجہ کیا، اسے ایک نئے جذبے، ایک نئی اُمنگ کا پتہ دیا جس کے وجود کا اسے پہلے علم نہ تھا اور اس بنیاد پر اس نے ایک عمارت بنائی جو اس وقت کے خاص حال کا اور اس زمانے کی سیاسی تحریکوں سے زیادہ پائدار نکلی اور جس کا مشاہدہ انسان کے بہت ہی گہرے اور موثر جذبات بیدار کرتا ہے۔

تورگنیف نے ناول کا عنوان ”اچھوتی زمین“ اس لیے رکھا تھا کہ روس کی نئی سیاسی تحریک نے اور ان لوگوں نے جن کا ناول میں فی کرہ ہر قوم کے اس طبقے کو اپنا میدانِ عمل بنایا جس کی اس وقت تک کسی نے پروا نہیں کی تھی، جس کی معنی قوت اظہار اور استقلال سے نا آشنا تھی، جیسے نئی زمین جس پر کبھی ہل نہ چلا ہو۔ اس نئی زمین کو زرخیز بنانے کے لیے کئی قسم کے حوصلہ مند لکھتے ہیں، لیکن تورگنیف کی نظر خاص طور سے دو پر جمی ہے، نثر و نثر اور سولہ من۔ نثر و نثر کو اس کی طبیعت اس نئے اور مشکل کام کا میٹر اٹھانے پر مجبور کرتی ہے اور اس کی طبیعت ہی اس کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتی ہے۔ ”جالیات سے متوق رکھنے والے کے لیے عملی زندگی سے واسطہ رکھنا بہت مشکل ہے“ نثر و نثر شاعرانہ مزاج کا آدمی ہے اور گو وہ اپنی شعر کہنے کی استعداد ان حوصلوں پر نشانہ کرنے کو آمادہ ہے جو اس کے دل کو زیادہ عزیز ہیں، پھر بھی وہ

محسوس کرتا ہے کہ شعر و شاعری نے اس کے مزاج میں ایک نفاست اور نزاکت پیدا کر دی ہے جو اس کے کام میں بہت حارج ہوتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ عوام میں گھل مل کر اپنے خیالات کا پرچار کرے، کسانوں کو آزادی کا شیدائی بنائے اور انھیں آزادی حاصل کرنے کا شوق دلا۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میں بہت خوش بیان مانا جاتا ہے، لیکن کسانوں سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ اسے معلوم ہے کہ جو وود کا نہیں پیتا اسے عوام میں گھل مل جانے کا حوصلہ نہ کرنا چاہیے، مگر کوشش کے باوجود بھی وہ وود کا نہیں پی سکتا اور پیتا ہے تو فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ عوام میں انقلابی خیالات کے پرچار کرنے کی پہلی کوشش کا حال وہ خود یوں سناتا ہے:

”اول تو مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ عوام کا سا بھیس بنا کر ان میں شامل ہو جانا بے حد آسان کام ہے: مجھ پر کسی نے ذرا بھی شبہ نہیں کیا۔ بس ایک گلاس وود کا منگا کر اپنے مخاطب کے سامنے رکھ دو اور جوجی چاہے، جھوٹ پرچ بک ڈالو۔۔۔ دوم یہ کہ جتنے لوگوں سے میں نے باتیں کیں سب کے سب غیر مطمئن ہیں، لیکن آسودگی حاصل کرنے کے ذریعوں کا ذکر بھی سننے پر راضی نہیں ہیں! مگر میں تبلیغ کے لیے بہت کمزور نکلا۔ دوسرے آنکھ بچا کر ہوٹل کے کمروں میں ڈال آیا، ایک کسی گاڑی میں چھپا دیا، چار آدمیوں کے سامنے رسالے پیش کیے۔ ایک نے پوچھا ”کیا یہ مذہبی کتاب ہے“ اور لینے سے

انکار کیا، دوسرے نے کہا کہ ان پڑھ ہوں، مگر اس نے اپنے بچوں کے واسطے ایک رسالہ لے لیا، کیوں کہ اس کے سرورق پر تصویر تھی، قیصر پہلے ہاں میں ہاں ملاتا رہا... پھر مجھے اچانک گالیاں دینے لگا اور رسالہ نہیں لیا، چوتھے نے آخر کار رسالہ لیا اور میرا شکریہ بڑی دیر تک ادا کرتا رہا، لیکن میں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی معلوم ہوتا ہر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ ایک کتے نے میرے پیروں میں کاٹ کھایا، ایک عورت نے جو اپنے جھونپڑے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی مجھے سیخ دکھا کر دھمکایا... ایک سپاہی میرے پیچھے چلاتا رہا "مٹھیرو جی ٹھیرو، ہم تمہیں بھی جلا وطن کر کے چھوڑیں گے" اور پھر میرے ہی داموں سے شراب پی کر مست ہو گیا... اب میں بھوکا ہوں اور دودھ کا سے سر چکر کھا رہا ہوں "طبیعت کی ناموزونیت رفتہ رفتہ نزہتوں کے عقیدے کو کمزور کر دیتی ہے اور آخر کار وہ خود کشی کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس سولومن، اچھوتی زمین کا دوسرا کاشتکار، بہت زیادہ مضبوط امدادے اور مستقل مزاج کا آدمی ہے، طبیعت کی روشنی اس کے لیے بلا نہیں ہو گئی ہے، وہ کسی خطبہ میں نہیں مبتلا ہوتا اور صدمے نہیں اٹھاتا۔ عوام کو بیدار کرنا اور ان کی بیداری کو قومی زندگی کی تعمیر کا ذریعہ بنانا... اس کے دل میں ایک شاعرانہ اُمنگ نہیں ہے، وہ روسی عوام کو خوب سمجھتا ہے، اپنے کام کے خطروں اور دشواریوں سے بخوبی واقف ہے اور بہت احتیاط سے اور چھونک

بچونک کر قدم رکھتا ہے۔ اس میں صبر اور سلامت روی کا اتنا مادہ ہے کہ اسے نہ اپنی امیدیں دھوکا دے سکتی ہیں نہ دوسروں کا جوش اور وہ اپنی زندگی اور اپنے قومی کام کو ویسے ہی باضابطہ کرتا ہے جیسے اس کا رخانے کا انتظام جس کا وہ مہتمم اور کارپرداز ہے۔ روس میں اس قسم کے لوگ ایک بالکل نیا منظر تھے، اور تورگنیف سولومن کی شخصیت کو اس خوبی اور نکتہ بینی سے نہیں بیان کر سکا جیسے نژد لوف کی سیرت کو، لیکن روس کی انقلابی تحریکوں کی داستان یہ ضرور ثابت کر دیتی ہے کہ تورگنیف کے وجدان نے اسے دغا نہیں دی۔ نژد لوف کی طبیعت اور ذہنیت کے لوگ شہر و رع سے آخر تک نا کامیاب رہے، کیوں کہ ان کے تعمیری حوصلے محض ایک دلفریب مگر ناقابل اعتبار ذہنی جوش اور مہیجان کا نتیجہ تھے، جس کی شدت نے ان کی عملی استعداد کو بالکل برباد کر دیا۔ سولومن برخلاف اس کے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو تورگنیف کے وقت تک میدان میں نہیں آئے تھے، لیکن عرصے سے روس کی انقلابی تحریک کی روح رواں رہے تھے اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے روسی زندگی کی عمارت اپنے کندھوں پر سنبھلے ہوئے۔ سولومن کے کیرئیر میں جو خامیاں رہ گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کی شخصیت کی تاثیر بہت کم ہو جاتی ہے ”اچھوتی زمین“ کی ہیر و من ماری آتما میں نہیں نظر آتیں۔ تورگنیف نے ماری آتنا کو جوش اور جانفشانی اور قوم پرستی کا مجسمہ بناتے ہوئے بھی حقیقت کا اتنا

محافظ رکھا ہے اور نفس انسانی کا ایسا گہرا اور سچا علم دکھایا ہے کہ ماری آتنا کی صورت اور سیرت اور سرگزشت پر کہیں ذرا بھی مبالغے یا جذبات پرستی کا گمان نہیں ہوتا۔ سولومن ایک موقع پر کہتا ہے ”آپ سب“ آپ روسی عورتیں اس وقت بھی ہم سے زیادہ کام کی ہیں، ہم سے زیادہ کام کرنی بھی ہیں اور آپ کا مرتبہ ہم مردوں سے بہت زیادہ بلند ہے“ اور ناول سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سولومن کی رائے صحیح ہے۔ ماری آتنا نے اپنے ماموں سیب یاگن کے یہاں پرورش پائی ہے۔ وہ بہت رئیس آدمی ہے اور اس کی بیوی کوشش کرتی ہے کہ ماری آتنا ایک بہت خوش حال زمیندار سے جو قریب ہی رہتا ہے شادی کر لے لیکن ماری آتنا کے دل میں سرفروشی کی تہا ہے، وہ اس شادی پر راضی نہیں ہوتی اور جب نفرونوف سیب یاگن کے یہاں بطور استاد کے ملازم ہو کر آتا ہے اور ماری آتنا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کن خیالات اور کیسے حوصلوں کا آدمی ہے تو وہ بغیر کسی جھجھک یا گھبراہٹ کے ماموں کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ ہولینڈی ہے اور قوم کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دیتی ہے۔ وہ صرف دلیر نہیں ہے بلکہ گھر سے یہ امید لے کر نکلی ہے کہ اسے قوم پر اپنی جان نثار کرنے کا فخر حاصل ہوگا اور اگر وہ اس عزت سے محروم بھی رہی تو کم از کم وہ غریبوں میں رہ کر غریبوں کی زندگی تو ضرور بسر کر سکے گی، جو کچھ اسے آتا ہے دوسروں کو سکھائے گی اور قوم کی سیوا میں وہ مسرت اور روحانی تسکین حاصل کرے گی جو اس کے

معیار کے مطابق زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسے نثر و نوت سے محبت ہے، لیکن نثر و نوت کی ذات سے زیادہ اس کے حوصلوں سے اور جب آخر میں نثر و نوت خود کشی کر لیتا ہے تو وہ اس کا ماتم نہیں کرتی، بلکہ سولو میں کے ساتھ شادی کر کے اس کے کام میں مدد دینے لگتی ہے، کیوں کہ اسے محبت اپنے نصب العین سے اور اپنی قوم سے ہے کسی ایک شخص کی ذات سے نہیں۔

تورگنیف کا آخری ادبی کارنامہ ”نثر میں نظمیں“ ہیں۔ ان میں اس نے مختلف موضوعوں پر مختصر معنائیں لکھے ہیں اور زبان اور خیالات کے رو سے اس کے یہ معنائیں دنیا کی بہترین شاعری کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایک ”نظم“ میں اسی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ میں شرک پر دایا تھا، مجھے ایک فقیر نے روکا اور عجیب کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر ہمیں تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا ہوں، نہ روپیہ نہ گھڑی، نہ رومال۔ میں نے محبت سے فقیر کا ہاتھ پکڑا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا اور معافی مانگی۔ فقیر نے کہا: کوئی پروا نہیں بھائی... یہ سلوک بھی ایک احسان ہوا ایک اور ”نظم“ میں جس کا عنوان ”آستان“ ہے، تورگنیف نے یہ دکھایا ہے کہ اس وقت کی روسی لڑکیاں کس حد تک دل اور ہمت اور بے غرضی سے اپنے آپ کو قوم پر نثار کر رہی تھیں۔ ”کیسے خوبصورت، کیسے شاداب سے گلہاب کے پھول“ ایک نظم ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے چند منظر دکھائے ہیں جن کی یاد اس کے

دل پر نقش ہو گئی ہے اور اب بڑھاپے کے ساتھ تازہ ہوتی جاتی ہے
نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو:

وہ قندیل کی روشنی دھبی پڑ گئی ہے، بجھ رہی ہے... یہ کون
تھا جو ابھی اس طرح کھانا چلے اس کا گلا پڑ گیا ہے اور
سینے میں دم نہیں؟ میرے پیروں پر میرا بوڑھا کتا
گھٹری بنا پڑا ہے، سکر رہا ہے اور کانپ رہا ہے۔ اس کے
سودا میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ مجھے
سردی لگے ہی ہے... ٹھٹھرا جاتا ہوں... اور وہ سب
مر گئے... مر گئے...

”وہ کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول“

”نثر میں نظمیں“، قطعی طور پر یہ ظاہر کر دیتی ہیں کہ تو رگینف سے
بہتر روسی زبان نہ کسی نے لکھی ہے نہ کوئی لکھ سکتا ہے اور اس لحاظ سے
اس کے ناولوں اور افسانوں کی اہمیت اور شان میں اس وقت
تک کوئی فرق نہیں آسکتا جب تک روسی زبان بولی اور لکھی جاتی
ہے۔ فصاحت اور بلاغت تو رگینف کی تمام تصانیف میں یکساں پائی
جاتی ہیں اور اسے محل اور موقع کا اس قدر خیال رہتا ہے، اس میں
اس قدر متانت اور ضبط ہے کہ اس پر زبان کی خوبیوں سے موضوع
یا تصورات کی جامیاں پوری کرنے کا الزام کبھی نہیں لگایا جاسکتا۔
اپنی زبان اور الفاظ کی دولت وہ اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ

کہیں بھی ایک زائد حرف یا جملہ نظر نہیں آتا اور محض اختصار اور ایجاز کے نقطہ نظر سے اس کی تصانیف اسلوب بیان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ لیکن تورگنیف زبان اور مضمون میں اتنی مناسبت اور ہم آہنگی اس درجہ سے پیدا کر سکا کہ وہ اپنے فن میں کامل تھا، اور قبل اس کے کہ وہ زبان کے زیور سے آراستہ کیے جاتیں اس کے پلاٹ اور کیرکٹر ایسی شکل اختیار کر لیتے تھے کہ یہ زیوران کے عیبوں کے چھپانے کا کام نہ دے بلکہ ان کے حسن کو ابھارنے کا۔ تورگنیف کی زبان کی تو وہی قدر کر سکتے ہیں جو روسی جانتے ہوں، پلاٹ کی ساخت اور ناول کو شکل و صورت دینے میں تورگنیف ہر جگہ استاد مانا جاتا ہے اور حقیقت میں تاستائی کے سوا دنیا میں کوئی ناول نویس نہیں گزرا ہے جو اس فن میں اس کے لگ بھگ بھی ہو۔ اس کے ناول سب مختصر ہیں مگر ہنایت مکمل، اس کے پلاٹ بہت صاف اور سلجھے ہوئے ہیں، ان میں جزو اور کل کا ایسا تناسب ہے جو یونانی مورتوں اور منمل بادشاہوں کی عمارتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہی کمال تورگنیف نے اپنے ناولوں کے کیرکٹر اور سراپے بیان کرنے میں دکھایا ہے۔ اس کے قلم کی ذرا سی جنبش ہماری نظر کے سامنے ایک جیتی جاگتی صورت کھڑی کر دیتی ہے اور ہم حیرت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایجاز میں موضوع کو روشن کرنے کی ایک صفت ہے جو وضاحت اور تفصیل کو شرمندہ کرتی ہے۔

زبان اور فن کے علاوہ تورگنیف میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا

موضوع ہمیشہ بلند رہتا ہے اور اس کی تصانیف اشتعال انگیزی اور ہوس پرستی سے بالکل پاک ہیں۔ انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کی حقیقت میں نگاہ سے چھپا نہیں رہتا اور اس کی طبیعت میں وہ جھوٹی پارسائی نہیں جو اس طرف نظر ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے۔ اس کے مخافت افسانوں اور ناولوں میں ایسے لوگ ہیں جن کی بد اخلاقی کی نسبت وہ کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتا لیکن عام اور خصوصاً فرانسیسی ناول نویسوں کی طرح وہ اشتعال انگیزی کو ہر دل عزیزی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا، اور اگر اس کی نظر بستی کی طرف رخ بھی کرتی ہے تو صرف اس غرض سے کہ بلندی پر واپس پہنچنے کا شوق دوبالا ہو جائے۔ اس شوق کی شدت اس کے قومی ناولوں میں خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ تورگنیف کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس نے حقیقت کو حسن پرست کی نظر سے دیکھا، حسن اور جمالیات کو اخلاقی امنگوں اور حوصلوں کا محرک بنایا اور یوں حقیقت، جمالیات اور احلی اخلاقی معیار کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم کر دیا جس سے تینوں زلزلہ کی بصیرت افزائی، مسرت اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ آتا تو ضرور ہے کہ تورگنیف کی مایوسی اس کی امیدوں کے نشہ پر کاٹتی رہتی ہے اور اس کی روشن سے روشن فضا پر بادل کی طرح چھائی رہتی ہے۔ لیکن تورگنیف یا اس مشرب نہیں تھا، اس کی مایوسی کا عقیدے اور فلسفہ جیتا سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کی تصانیف کو پڑھ کر کوئی مایوس اور روسی قوم یا نوع انسان کی طرف سے ناامید نہیں ہو سکتا۔

پانچواں باب

فیوڈر میچائلو وچ دستہ لف سکی

دستہ لف سکی کی شخصیت اور تصانیف کے خاص انداز کو نظر میں رکھئے تو یہ واقعہ بھی معنی خیز ہے کہ وہ ایک ہسپتال میں پیدا ہوا اور ایسے خاندان میں جس کی آمدنی اور خرچ کا تناسب کسی صورت سے اطمینان بخش نہیں تھا۔ اُس کے باپ کو، جو ہسپتال میں ایک معمولی عہدے پر نوکری تھا، اپنے انزاس کا بہت شدید احساس تھا اور اسے آئندہ کے بارے میں اتنے اندیشے تھے کہ وہ ہمیشہ مایوس اور غموم رہتا اور ایک لمحے کی خوشی اور بے فکری بھی اپنے اوپر حرام سمجھتا۔ بچوں کی تربیت اسی رنگ میں ہوئی اور یہ بات شروع سے اُن کے ذہن نشین کر دی گئی کہ زندگی کھیل نہیں ہے اور اُنہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا سنبھالنے اور دنیا کی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ماں کی زندہ دلی اور خوش مزاجی اس فضا کی افسردگی اور غمگینی کو جو باپ کے فلسفہ زندگی نے پیدا کی تھی کم نہ کر سکی

اور بچپن ہی سے دستہ نعت سکی کے مزاج کے توازن میں کچھ خلل پڑ گیا۔ ممکن ہو اگر اسے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کا موقع ملتا تو اس کے باپ کی تعلیم کا اثر کسی قدر زائل ہو جاتا اور اس کی نشو و نما میں کوئی خاص رکاوٹ نہ ہوتی مگر وہ اس نعمت سے بالکل محروم رہا۔ سو ان چند دنوں کے جب ساما خاندان ماسکو کے قریب ایک گاؤں میں چلا جاتا تھا، دستہ نعت سکی کا سارا بچپن مکان کے چند کمروں میں گزرا۔ جب اسکول جانے کے دن آئے تب بھی اُسے قید سے رہائی نہیں ملی۔ وہ اپنے بھائی میخائیل کے ہمراہ اسکول جاتا، اُسی کے ساتھ واپس آتا اور اُسے دوسرے لڑکوں کی صحبت سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید کرتی۔ باپ نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا لیکن اس تربیت نے دستہ نعت سکی کے مزاج اور طبیعت میں ایسی خامیاں پیدا کر دیں جنہیں وہ آگے چل کر بھی دور نہیں کر سکا۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد دستہ نعت سکی پیتر برگ کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا اور ۱۹۱۷ء میں اس کو اسی محکمہ میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ملازمت سے اس کی طبیعت بہت جلد گھبرا گئی۔ اسے انشا پردازی کی مطلق مشق نہیں تھی اُس کی تعلیم سائنس اور ریاضیات میں ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس نے انشا پردازی کو کسب معاش کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا اور ناول لکھنے لگا۔ اس کی پہلی کوشش بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے پہلے ناول ”غریب آدمی“ (۱۹۱۷ء) کا ادبی حلقوں میں بہت چرچا ہوا۔ دستہ نعت سکی نے اس کامیابی کی بنا پر جو اُمیدیں

باندھیں وہ غلط ثابت ہوئیں اور ”غریب آدمی“ کے بعد اس نے جو دو چار افسانے شائع کیے وہ عام طور سے اُس کے ملاحوں کو بھی پسند نہیں آئے۔ اسی زمانے میں وہ پتر اشف سکی کے حلقے کا کرن بن گیا جس میں اشتراکیت کی تعلیم پر بحث ہوا کرتی تھی اور جس کے اراکین زیادہ تر اشتراکی تھے۔ ۱۸۸۹ء میں کسی جرم کی بنا پر جس سے امارے کے نوجوان اراکین خود بھی واقف نہیں تھے، سب کو موت کی سزا کا حکم دیا گیا۔ آخر وقت میں جب ان بیچاروں کو گولی مارنے کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں انھیں اطلاع دی گئی کہ سزا کی عنایت سے ان کے لیے موت کے بجائے سائی بیریاں جلا وطنی اور قید بامسقت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ ایک دو روز میں دستہ لف سکی اور ”مجرموں“ کے ساتھ سائی بیریاں روانہ کر دیا گیا۔ یہاں وہ چار سال قید خانے میں رہا اور اس کے بعد جبری فوج میں بھرتی کر دیا گیا۔ پیربرگ آنے کی اجازت اسے ۱۸۹۷ء کے آخر میں ملی۔ دستہ لف سکی کو بچپن میں جیب خرچ کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا تھا اور جب وہ اسکول میں داخل ہوا تب بھی اس کی جیبیں ہمیشہ خالی رہیں۔ اس وجہ سے اسے خرچ کرنے کا ڈھنگ بالکل نہیں آیا۔ وہ اپنی آمدنی نہایت بے تکلف طریقے سے اڑا دیتا تھا اور زیادہ تر اسی سبب سے بہت تکلیفیں اٹھاتا رہا۔ قید اور جلا وطنی نے اس کے افلاس کو اور بھی بڑھا دیا۔ جب وہ سائی بی ریا سے واپس ہوا تو اس پر بہت قرضہ ہو گیا تھا اور کتابیں لکھنے کے سوا قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ۱۸۹۷ء کے دوران میں اس نے اپنا ماول

”بے کس اور مظلوم“ لکھا اور ۱۸۶۱ء میں اپنے بھائی میخائیل کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ ”زمانہ“ جاری کیا۔ اس رسالے میں اس نے اپنی قید کے حالات ”مردوں کے گھر“ کے عنوان سے بواقساط شایع کیے۔ اس وقت تک وہ خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ ”زمانہ“ بہت جلد ہر دل عزیز ہو گیا اور دستہ لُفٹ سکی کو اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ اپنے قرض کا کچھ حصہ ادا کرے مگر ۱۸۶۳ء میں ریاست کے حکم سے رسالہ بند کر دیا گیا۔ دستہ لُفٹ سکی ایک نیا رسالہ جاری کرنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہو گیا اور علاوہ اس قسط کے جو وہ چھوڑ گیا تھا اس کے بیوی بچوں کی پرورش بھی دستہ لُفٹ سکی کے سر پر گئی۔ اس کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں کی کوئی انتہا نہیں تھی، مگر اس نے کسی نہ کسی طرح سے رسالے کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور ۱۸۶۴ء میں ”دور“ کے نام سے اسے جاری کر دیا۔ یہ رسالہ بھی ریاست نے ایک سال کے اندر بند کر دیا، اور دستہ لُفٹ سکی پر اس قدر قرضہ ہو گیا کہ قید خانے سے بچنے کے لیے وہ روس سے فرار ہو گیا۔ ۱۸۶۵ء کی گرمیوں میں وہ جرمی کے شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر افلاس نے وہاں رہنا بھی دشوار کر دیا اور وہ اسی سال پھر روس واپس آگیا۔ ”جرم اور سزا“ (۱۸۶۶ء) لکھ کر اس نے اپنے قرضے کا بوجھ کچھ ہلکا کیا، مگر قرض داروں کے تقاضوں نے اسے ایسا تنگ کیا کہ اگلے سال وہ پھر یورپ چلا گیا۔ اگر وہ کفایت شعاری سے رہتا تو ممکن تھا اسے اس کا موقع ملتا کہ ایک دو سال میں ناول لکھ کر اپنی مالی حالت کسی قدر ٹھیک کر لے، مگر جوا

کھیلنے کی عادت نے اس کا امکان نہیں رہنے دیا۔ دستہ لفٹ سکی چار سال
یورپ میں رہا، کبھی جرمنی، کبھی سوئسٹان، کبھی فرانس میں اور اس عرصہ
میں دو لمبے ناول ”محبوب“ (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹) اور ”بھوت پرست“
(۱۸۶۰ - ۱۸۶۱) لکھے، لیکن چاروں سال فاقہ مستی میں گزرے یہاں تک
کہ اکثر کپڑے اور جوتے رہن رکھنے کی نوبت آجاتی تھی۔ اتفاق سے اس
کی نئی بیوی جس سے اس نے یورپ جانے سے پہلے شادی کی تھی، ایسی
باسلیقہ اور کفایت شعار کھلی کہ بڑی عادتوں کے باوجود دستہ لفٹ سکی
کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور سلسلہ عمر میں جب اسے روس میں گزر رہ
اوقات کرنے کی صورت نظر آئی تو وہ دالیں چلا آیا۔ اسے صرف دس
سال اور جینا نصیب ہوا، مگر بیوی کے حسن انتظام کی بدولت یہ عرصہ
مقابلتاً آسودگی میں بسر ہوا۔ اس کے نادلوں نے اسے نالستائی کے
دوش بدوش روسی انشا پردازوں کا سرتاج بنا دیا تھا۔ سلسلہ عمر میں
اس نے شاعر نشکین کی برسی میں ایک تقریر کی جس نے اس کی شہرت
کو عروج پر پہنچا دیا۔ اسی سال موت نے اسے اچانک آگھیرا اور اس کی
عظمت کا ایک ادنیٰ خیرت تھا کہ اس کا جنازہ اس شان سے اٹھا جس پر
بادشاہ بھی رشک کر سکتے تھے۔

دستہ لفٹ سکی کی مزاجی کیفیات کا اثر اس کی تصانیف کے ہر
صفحہ پر ظاہر ہوتا ہی اور انہیں سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کے تمام
پہلوؤں سے واقف ہونا لازم ہے۔ بچپن میں وہ ہم عمر بچوں کی محبت سے

محروم رکھا گیا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں سے الگ رہتا تھا، کچھ اس وجہ سے نہیں کہ وہ غریب تھا اور اس کے ساتھی زیر بلکہ محض اس لیے کہ وہ صحبت سے گھبراتا تھا اور مہذب زندگی کے رسوم و آداب سے بالکل ناواقف تھا۔ اپنے بھائی سیناٹیل کے سوا اُس نے کبھی کسی سے دل کھول کر یا بے تکلفی سے باتیں نہیں کیں۔ اُس کے دل میں دوسروں کی طرف سے بجا شبہ پیدا ہو جایا کرتے تھے اور اس میں صاف گوئی کا اتنا مادہ بھی نہیں تھا کہ اپنی بدگمانی کو ظاہر کر کے لوگوں کو اس کے رفع کرنے کا موقع دے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو تنہائی کی زندگی میں خوش رہتے ہیں۔ لیکن دستہ لف سکی میں یہ بات بھی نہیں تھی، اس لیے کہ اسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں تھا، خرچ کی تنگی کے باوجود جب کبھی اُس کے ہاتھ میں روپیہ آتا تو وہ فضول چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا اور جب ضرورتیں ستائیں تو غڑھا کرتا یا اپنی قیمت کو روتا۔ ایسی وہمی اور کمزور طبیعت والے آدمی کو دوستی سے بہت سہارا مل سکتا ہے اور عموماً ایسے لوگ دوست پیدا بھی کر لیتے ہیں۔ دستہ لف سکی نے جب ملازمت ترک کر کے انسا پردازی شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھا تو ماسکو کے ادبی حلقوں میں اُس کے بہت ایلے قدر شناس تھے جو اُس سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن دستہ لف سکی نے اُن کے لیے اس رشتے کا نباہنا بہت ہی دشوار کر دیا۔ وہم کے ساتھ ہی اس کی طبیعت میں خود پسندی بھی بہت تھی

وہ ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور ہر وقت ہر شخص کی نسبت یہ بدگمانی رکھتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے یا مجھ پر رشک کرتا ہے یا میری رسوائی اور بدنامی چاہتا ہے۔ بے یں سکی، جو دستہ نَف سکی کے پہلے ناول ”غریب آدمی“ کی اشاعت کے زمانے میں روس کا ادبی رہبر مانا جاتا تھا، دستہ نَف سکی کا بڑا مداح اور اُس کے ہنر کا سچا قدردان تھا۔ لیکن محض اس بنا پر کہ ”غریب آدمی“ کے بعد جو دو چار افسانے دستہ نَف سکی نے لکھے ان کی اُس نے حسبِ دلخواہ تعریف نہیں کی، دستہ نَف سکی اس سے نہ صرف خفا ہو گیا بلکہ اُس کے تمام احسان بھلا کر لوگوں سے اس کی جھوٹی شکایتیں کرنے لگا۔ ماسکو کی ایک ادبی مجلس میں اُس کے ہم عصر ناول نویس تورگینف نے جو اس کے طرز کو پسند نہیں کرتا تھا، ”غریب آدمی“ کے ہیرو بے دردش کن کی ایسی نفل اتاری کہ وہ دستہ نَف سکی سے بہت مشابہ معلوم ہونے لگا اور دستہ نَف سکی اس بات پر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے تورگینف ہی سے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں سے جو وہاں موجود تھے ملنا جھوڑ دیا، اور جب کبھی رستہ چلتے مڈ بھیسٹر ہو جاتی تو منہ پھیر لیتا۔ اگر اس معاملے میں وہ اپنی بات کا پکا ہوتا اور اپنی بے نیازی ثابت کر دیتا تو نقصان کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کو کچھ فائدہ بھی پہنچتا اور اس کی طبیعت میں مضبوطی اور خود داری پیدا ہو جاتی لیکن فضول خرچی کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی دشواریوں میں مبتلا رہتا تھا اور اکثر اُسے انھیں لوگوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جن کی

طرف سے اس کے دل میں ہزاروں بدگمانیاں اور شکایتیں تھیں۔ غیرت و حمیت اور مجبوری کی اس کشمکش نے دستہ لفٹ سکی کی طبیعت کا توازن بالکل بگاڑ دیا۔ اپنی بُری عادتوں اور سیرت کی کمزوریوں کے احساس نے اُسے اپنی نظروں میں اتنا حقیر کر دیا کہ گو دوسرے اسے مغرور سمجھتے تھے مگر وہ خود اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت قائم رکھنے کی جو کوششیں میں کر رہا ہوں وہ بے کار ہیں اگرچہ اس کا اقرار کرنا اُسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ سیرت اور مزاج کی ان خامیوں نے دستہ لفٹ سکی کے لیے چین سے رہنا دشوار کر دیا اور سوا عمر کے آخری دس بارہ سال کے جب اس کی بیوی نے اُسے اپنے قابو میں کر لیا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے بچپن میں اُس کے ماں باپ نے، دستہ لفٹ سکی کے بے زندگی ایک عذاب تھی۔

دستہ لفٹ سکی کی سیرت پر غور کرتے ہوئے ہمیں دو باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیے کیونکہ ان کا اس کے فلسفہ حیات سے بہت گہرا تعلق ہے:-
ایک تو موت سے وہ بڑھپڑ جب اس کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، دوسرے اس کا مرگی کا مرض، جس کے پہلے دورے سائی بیریا میں ہوئے۔
موت سے بڑھپڑ کا قصہ دستہ لفٹ سکی نے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا ہے:-

”آج ۲۲ دسمبر کو، ہم سب سم یہ فون سکی چوراسے پر پہنچائے گئے

لے ۱۲۹۶ ۱۲ سے ایک مقام جہاں پر عموں کو گولی ماری جاتی تھی

وہاں ہمیں سزا کا حکم سنایا گیا، چرنے کے لیے علیب دی گئی، ہمارے سر دلوں پر بخیر توڑے گئے اور اس کے بعد ہمیں وہ سفید قمیص پہنا دی گئی جو ہمارا کفن ہونے والی تھی۔ تب ہم میں سے تین کے ہاتھ کھبوں سے باندھ دیے گئے اور وہ سزا کی تکمیل کے لیے کھڑے کیے گئے۔ میں صف میں چٹھٹا تھا، ہم تین تین کر کے مارے جانے والے تھے، اس لیے میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی تھے... مجھے بس اتنی فرصت تھی کہ بٹش پے یف اور ڈوروف سے جو میرے پاس تھے گلے مل لوں اور رخصت ہو لوں۔ لیکن اسی وقت سپاہیوں کو (جو گولی چلانے والے تھے) واپسی کا حکم ملا، وہ قینوں جن کے ہاتھ کھبوں سے بندھے تھے رہا کر دیے گئے اور ہمیں زار کا فرمان سنایا گیا جس میں اس نے ہماری جان بخشی کی تھی... ”دستہ لفٹ سکی کے ساتھیوں میں سے ایک پاگل ہو گیا اور خود دستہ لفٹ سکی کی کیفیت جنون سے کچھ کم نہیں تھی۔ ان چند لمحوں میں اس کے دل پر جو کچھ گزری وہ اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کیا ہے اور اس سے ہم کم معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حادثے کے بعد اس کی وہی حالت تھی جو ایک بڑے درخت کی ہوتی ہے جب کوئی زلزلہ اس کی جڑیں اس طرح سے ہلا دے کہ وہ نہ قوتاً کمزور ہو کہ گر پڑے یا غدا نہ پہنچنے سے سوکھ جائے، نہ اتنا مضبوط کہ زمین سے پوری غذا حاصل کرے اور پھر سر سبز اور نشاداب ہو جائے۔ دستہ لفٹ سکی کا مزاج اور اس کے احساسات اس واقعہ کے بعد کبھی ”طبعی“ انسان کے سے نہیں ہو سکتے تھے اور

اس کی نظر میں زندگی کی کبھی وہ صورت نہیں ہو سکتی تھی جو ”طبعی“ انسان کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ مرگی کے مرض نے اس کی ذہنیت کو طبعی حالت سے اور بھی دور کر دیا۔

دستہ لف سکی کے ناولوں میں کئی ایسے کیرکٹر ملتے ہیں جو اسی مفید مرض میں مبتلا ہیں اور ان کے بیان سے اس کیفیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو دستہ لف سکی پر دورے سے پہلے گزرتی تھی۔ ”بھوت پریت“ میں ایک شخص کہتا ہے: ”کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے گویا یکبارگی کل کائنات کا اندرونی نظام سمجھ لیا اور کہا: ”ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے!...“ یہ محض ایک پُر اثر کیفیت نہیں ہے، بلکہ ایک مسرت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ دل پر سب سے زیادہ دیر پا نقش اس بات کا ہوتا ہے کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں اور میرے جو احساسات ہوتے ہیں وہ بالکل صاف اور روشن ہوتے ہیں اور نہر احساس ایک عجیب مسرت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ حالت پانچ سکنڈ سے زیادہ قائم رہے تو میری روح اس کی تاب نہ لاسکے اور یقیناً ہلاک ہو جائے۔“ دستہ لف سکی کو ان دوروں کے آنے وقت کائنات اور وجود کی اصلیت جس شکل میں نظر آتی تھی، کائنات کے جو راز اس پر فاش ہو جانے تھے، اُس کے فلسفے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اسے اُس جستجو کا سودا ہوا جو اُس کے ناولوں کا اصل موضوع ہے اور یہ جستجو اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ آیا کیفیت ایک بیماری ہے یا اس میں ایک حقیقت کبھی کبھی اپنی ایک جھلک دکھلا جاتی ہے۔

دستہ لف سکی جس حقیقت کی تلاش میں نکلا وہ اس کے خیال میں خارجی زندگی اور بیرونی اثرات سے بہت کم تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ناولوں میں ”واقعات“ کا بہت کم ذکر ہے، انسان کی اندرونی کیفیات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، ان کی اہمیت پر اتنا اصرار کیا گیا ہے کہ وہ ناول کی ساری فعنا پر چھا جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا ہستی کا اور کوئی پہلو ہی نہیں۔ روزمرہ زندگی میں ان کیفیتوں کا جو دستہ لف سکی کے ناولوں میں ایک معمولی چیز قرار دی گئی ہے، سناؤ و نادر ہی تجربہ ہوتا ہے اور جس قسم کے انسانوں سے اس کی دنیا آباد ہے وہ ہمیں اپنی دنیا میں شاید ہی کبھی دکھائی دیتے ہوں۔ اس بنا پر بعض لوگ جو دستہ لف سکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتے اسے مزاج اور ذہن کی بیماریوں کا محقق اور ”پاگل خانے کا شیکسپیر“ ٹھیراتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے، کیونکہ دستہ لف سکی نے علم نفسیات میں بہت سی معلومات کا اضافہ کیا ہے اور نفسیات کے عالموں کو خوابوں کی ماسیت سمجھنے میں اس کی تصانیف سے بہت مدد ملی ہے۔ ”دہری شخصیت“ کا منظر بھی سب سے پہلے اسی کی تصانیف میں نظر آتا ہے اور نفسیات کے ماہروں نے بعد کو اس کے متعلق جو کچھ معلوم کیا وہ محض دستہ لف سکی کے بیان کی تصدیق ہے۔ دہری شخصیت محض ایک مثال ہے، دستہ لف سکی نے تیاری کے بہانے سے نفس انسانی کے ہزار ہا راز فاش کیے ہیں۔ حقیقت کے ناگوار پہلو پر وہ ڈالنا حفاظتِ نفس کی طرح انسان کی ایک جبلی

خواہش ہے۔ اہل علم ان مازوں سے اس لیے ناواقف رہے ہیں کہ یہ انسانی شخصیت کی تہ میں چھپے رہتے ہیں، ان کا احساس وجدان کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، علم کی ان تک رسائی نہیں۔

نقادوں نے دستِ نعل کی کو بیار ذہن اور روگی فطرت کا معنی بنا کر اس کی تصانیف کو بالکل اور ہی حیثیت دے دی ہے، دستِ نعل کی خود حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ جو شخص بے معنی روزمرہ زندگی اور واقعات کا پردہ اٹھا کر دیکھے گا اسے حقیقت اسی شکل میں نظر آئے گی۔ اپنے خطوط میں اس نے جا بجا اس مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے ”حقیقت نگاری کا مفہوم جو میرے ذہن میں ہے ہمارے معمولی ”حقیقت نگاروں“ اور نقادوں کے خیالات سے بالکل مختلف ہے۔ معاذ اللہ! اگر کوئی وہ ساری کیفیتیں جو ان گزشتہ دس سالوں میں ہم روسیوں کے دلوں پر گزری ہیں صاف صاف بیان کر دے... تو یہی حقیقت نگار چنچ ٹھیں گے کہ یہ محض خطبہ ہے! لیکن اس بیان کی حقیقت میں کلام نہیں ہو سکتا! ایسی ہی حقیقت نگاری سچی اور گہری ہو سکتی ہے، وہ جو عام طور سے رائج ہے محض سطحی اور حقیر ہے۔“ یوں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دستِ نعل کی کے ناولوں پر ”بیاری“ کی فضا کیوں چھائی رہتی ہے۔ وہ علمِ نفسیات کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اسے اس کی فکر ہے کہ کسی طرح انسانی زندگی اور انسانی ہستی کی اصل حقیقت معلوم کرے اور جیسے ایک سائنس

کے عالم کو انسانی جسم کے نظام اور کاروبار کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب اس نظام میں کوئی خلل پیدا ہو، دستہ لف سکی بھی بیماری اور بیماریوں کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ انسان اگر تندرست اور خوش حال ہو تو اپنی خواہشوں اور آرزوؤں میں مبتلا رہتا ہے اسے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی ہستی کے معمول پر غور کرے اور وہ اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ لیکن غربت، مصیبت اور بیماری میں اس کی توجہ جہاں زندگی سے ہٹ جاتی ہے اور تب وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا مقصد، کائنات میں اپنے وجود کا مصرف کسی طرح اپنے آپ کو سمجھائے اور پھر اپنی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ دستہ لف سکی کا موضوع ایسے ہی انسانوں کے خیالات اور احساسات ہیں اور اسی وجہ سے خود حقیقت نگاری کا یہ تقاضا تھا کہ اس کے کیرکٹر مصیبت زدہ یا کسی نہ کسی لحاظ سے "بیمار" ہوں، سکون اور نجات حاصل کرنے کو تڑپ رہے ہوں اور انھیں خارجی زندگی کے ان مسائل اور معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو جو تندرست انسان کے ذہن پر حاوی ہوتے ہیں۔ دستہ لف سکی کے فلسفہ زندگی کا یہ اصول ذہن نشین کر کے ہم اس کی تصانیف پر سلسلہ وار غور کر سکتے ہیں۔

اس کا پہلا ناول "غریب آدمی" اور دوسرا "بکیس اور مظلوم" چند افسانے جو اس نے ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان لکھے "سدا سہاگی" "ماسوں جان کا خواب" اور "ستے بان جی کوود" اس کی

تصانیف کا جدا گانہ حصہ ہیں اور موضوع کے اعتبار سے ان ناولوں سے بہت مختلف ہیں جن کا سلسلہ ”مردوں کے گھر“ سے شروع ہوتا ہے لیکن دستہ لف سکی کا طرز ان شروع کی تصانیف میں بھی وہی ہے جو بعد کے ناولوں میں پایا جاتا ہے اور ان میں بھی اس کی قوت ادراک اور اتنا سیرت کے وجود انی علم کا وہی عالم ہے۔ ”غریب آدمی“ گوگول کے افق نے ”لبادے“ سے ملتا جلتا ہے، اس کا ہیرو بھی خاکسار اور مسکین ہے، ایک ”دیپکارہ“ جس کا حال سن کر ترس آتا ہے، لیکن ”غریب آدمیوں“ کی اور ”لبادے“ کی حقیقت نگاری میں یہ بڑا فرق ہے کہ گوگول نے جگ بیتی سنائی ہے اور دستہ لف سکی نے آپ بیتی، گوگول نے مصوری کا کمال دکھایا ہے اور دستہ لف سکی نے مشاہدہ نفس کا، گوگول کا ہیرو روسی قوم کا ایک فرد ہے، دستہ لف سکی کا ہیرو بے دوش کن، جس کے دل میں خودی کا اتنا احساس بھی باقی نہیں رہا ہے کہ وہ اپنی سنگدل معنوقہ کی اجازت کے بغیر ہنسے یا خوش ہو سکے، خود دستہ لف سکی کی ایک خاص ذہنی کیفیت کا مجسمہ ہے۔ نقاد یہی بن سکی نے ”غریب آدمی“ کو پڑھ کر ٹھیک کہا تھا کہ بے دوش کن کی ہستی کوئی نادر شے نہیں ہے، بلکہ روسی زندگی کا ایک عام اور عبرت انگیز منظر ہے۔ ”بیکس اور مظلوم“ میں بھی دستہ لف سکی نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے، اس کا ہیرو وائیا ایک ناول نویس ہے، اور اس کی سیرت دستہ لف سکی سے بہت مشابہ ہے۔ ناول کا قصہ بہت دردناک ہے۔ ایک بڑے رئیس زمیندار

وال خوف سکی نے، جو عیاش اور بد معاش ہو اور جسے معصوم لڑکیوں کو دھوکا دے کر بے حرمت کرنے میں خاص لطف آتا ہو، اپنی جائیداد کے مستعد اور ایماندار منتظم اینخ مے نعت کو چھوٹے الزام لگا کر نکال دیا ہو اور اس پر کئی ہزار روپل غبن کرنے کا دعویٰ دائر کر دیا ہو۔ بے چارہ اینخ مے نعت مقدمے کی پیروی کے لیے پتیر برگ آتا ہو، اور یہاں اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوتی ہو۔ اُس کی لاڈلی بیٹی نتاشا گھر چھوڑ کر وال خوف سکی کے لڑکے ال یوشا کے ساتھ بغیر نکاح کیے بیوی کی طرح رہنے لگتی ہو۔ ناول نوئس دانیہ جس نے اینخ مے نعت کے گھر میں پرورش پائی تھی اور جو خود نتاشا سے بہت محبت کرتا تھا اپنا فرض سمجھتا ہو کہ نتاشا کے جذبہ محبت کا احترام کرے اور اسے اس حرکت کے بُرے نتائج سے جہاں تک ہو سکے بچائے۔ نتاشا کے افسانے کا انجام یہ ہوتا ہو کہ ال یوشا اپنے باپ کے کہنے سے ایک مال دار لڑکی سے شادی کر لیتا ہو اور دانیہ بڑی مشکل سے نتاشا کے ماں باپ کو اسے اپنے گھر واپس بلانے پر آمادہ کر لیتا ہو۔ نتاشا اس معاملے میں پھر بھی خوش قسمت رہی، ”بیکس اور مظلوم“ میں ایک اور لڑکی کا قصہ بھی ہو جس کی عزت اور زندگی وال خوف سکی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اُس کے باپ نے مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا اور اس کی اپنی بچی بچی بھی دل میں شکایت لیے ہوئے دنیا سے گئی۔

”بیکس اور مظلوم“ کی داستان میں دستہ نعت سکی نے ایک تو یہ

دکھایا کہ انسان فاعل مختار ہونے کا جو دعویٰ کرتا ہے، اُس کی اصل کوئی حقیقت نہیں اور دوسرے یہ کہ فلسفیوں نے جو حکم لگایا ہے کہ ہر انسان اپنی بھلائی چاہتا ہے، اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔ سکیں اور غلطوں ان بیچاری ہستیوں کے درودِ دل کی کہانی ہے جو اپنے پاک جذبات کو دنیاوی اغراض اور ”بھلائی“ کی خواہش پر نشانہ نہیں کر سکتی ہیں، اور محض اس وجہ سے کہ ان کے دل پاک ہیں اور ان کے جذبات قوی اُنہیں دنیا میں ہر طرح کی رسوائی اور ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔ یہی مجبوری کسی قدر ظریفانہ انداز سے ”سدا سہاگی“ میں دکھائی گئی ہے۔ ترو دوست سکی، ایک خوش حال آدمی، فطرتاً شادی کرنے پر مجبور ہو، اس کی بیویاں آہ ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں اور بے وفائی کرتی ہیں اور اسے یہ معلوم بھی ہے، لیکن پھر بھی وہ شادیاں کرتا رہتا ہے اور ایسی ہی عورتوں سے جن کی تلون مزاجی اور عیش پسندی انہیں وفادار نہیں رہنے دیتی۔ علم نفسیات کے رو سے ایک خواب جو اس ناول میں بیان کیا گیا ہے، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ دل چانی لوف، جس کا ترو دوست سکی کی بیوی سے ملے دستہ لطف سکی کی لڑکی لیوبوف دستہ لطف سکی کا بیان ہے کہ اس ناول میں دستہ لطف سکی نے آپ بیتی سائی ہے۔ اس کی پہلی بیوی جس سے اس کی سائی بیویاں شادی ہوئی تھی، ترو دوست سکی کی بیویوں کی طرح عیاش اور بیوقوف تھی لیکن لیوبوف دستہ لطف سکی نے اپنے باپ کی سوانح عمری میں اس قدر رائی سیدھی باتیں لکھی ہیں کہ اس کے قول پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

یارانہ تھا، تر و سوت سکی کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص خنجر لیے ہوئے اس کے بلنگ کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ جب وہ پاس پہنچ گیا تو اس نے ول جانی نون کے گلے پر خنجر مارا، اور ول جانی نون نے وار سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔ اس وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں سے خون چہرہ پر بہا رہا ہے اور تر و سوت سکی اس کے پاس کھڑا ہے۔ اگر ول جانی نون نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو تر و سوت سکی کا خنجر اس کے گلے پر پھر جاتا۔

”سدا سہاگی“ دستہ لف سکی نے ششہ اع میں لکھی اور یہ اس کے پہلے طرز کی آخری تصنیف ہے۔ ششہ اع میں ”مردوں کے گھر“ کی تصنیف کے ساتھ اس کی ناولوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا موضوع انسانی شخصیت اور اس کے وجود کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ وہ روحانی یا عذباتی مجبوری جو ناستا جیبی شریف اور شائستہ لڑکی کو بد اخلاق عورتوں کے زمرے میں شامل کر دیتی ہو ان ناولوں میں بہت زیادہ شوخ رنگوں میں نظر آتی ہے۔ اپنی پھلائی کی طرف سے بے پڑائی اور دنیاوی اغراض کی تعمیر جو ناستا اور رنلی کی ماں محسوس کرتی ہیں ایک شیطانی ضد اور تکبر میں منتقل ہو جاتی ہیں جو خیر و شر کے معیار کو ہٹ دیتا ہے۔ لیکن ہم ان مسائل کو اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم دستہ لف سکی کے فلسفے کی تدریجی نشوونما پر غور کر لیں۔

دستہ لُٹ سکی کے خیالات کی محرک دراصل ان لوگوں کی شخصیتیں
 تھیں جن سے اس نے سائی بی ریا کا قید خانہ یا ”مردوں کا گھر“ آباد
 پایا۔ اس ناول کا ہیرو قید خانے سے خلاصت ہوتے ہوئے کہتا ہے:-
 ”دکتنوں کی زندگی، کتنوں کی طاقت ان دیواروں میں دفن رہی اور
 بے کاری میں ضائع ہوئی!۔ اس جوانی اور اس قوت کو دنیا آخر کسی
 نہ کسی مصروف میں تو لا ہی سکتی تھی۔ میں اس معاملے میں اپنے خیالات
 ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا: یہ بد قسمت لوگ غالباً ہماری قوم کے سب سے
 زیادہ مضبوط ارادہ رکھنے والے آدمی اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے
 سب سے زیادہ ہونہار افراد تھے۔ ان کی ساری جہانی اور روحانی طاقت
 ضائع ہو رہی ہے۔ یہ آخر کس کی خطا ہے؟“۔ فقط یہ کہ دینا کہ یہ لوگ
 مجرم ہیں اور اپنے جرم کی سزا بھگت رہے ہیں صرف ناکافی نہیں بلکہ
 غلط ہے، یہ غلط نہ ہوتا تو اس مسئلے میں کوئی دشواری یا پیچیدگی نہ ہوتی۔
 دستہ لُٹ سکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسے مجرم جنہوں نے ضعیف
 بڑھوں اور مصدوم بچوں کا انتہائی بے دردی سے خون بہایا تھا، اپنی
 حرکتوں پر بالکل نادم نہیں ہوئے، بلکہ اکثر یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ
 انہوں نے کسی قسم کی غلطی کی ہے اور کبھی کبھی تو ان کا ضمیر انہیں یقین
 دلاتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا۔ جب ان لوگوں کو اپنی معصیت
 کا اتنا یقین ہے اور ان کی سزا ایسی بے تاثر، توہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ
 مجرم ہیں یا قید خانے میں اپنے جرم کی سزا پارہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ تسلیم

کر لیں کہ یہ لوگ بالکل بے خطا ہیں یا اگر بے خطا نہیں تو انہیں سزا دینا ہمارا
امکان سے باہر ہے، تو پھر مظلوم معصوموں کی فریاد کو کیا قرار دینا ہوگا، یا
اس کا اقرار کرنا ہوگا کہ انسانی فطرت کسی قانون کی پابند نہیں کی جاسکتی،
قانون بنانا محض حماقت ہے اور کسی مذہبی یا اخلاقی معیار کا سہارا ڈھونڈنا
انسان کی ایک مضحک کمزوری۔

دستہ ثلث سکی کو علم اور عقل پر زیادہ اعتبار نہیں تھا، جرم و سزا کی
منطق کے اس چکر نے اسے اور بھی یقین دلادیا کہ زندگی کے گہرے مسائل
کا فیصلہ کرنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ اگر ہم جرم کی حقیقت معلوم کرنا
چاہتے ہیں تو ہمیں مجرم کی شخصیت سے اس کے جذبات سے اور اس کے
شعور کے ان پوشیدہ محرکوں سے واقف ہونا چاہیے جو ان جذبات کو
پیدا کرتے ہیں۔ ”پاتال کے مراسلات“ میں جو اس نے ۱۸۶۴ء میں
شائع کی، اس نے پہلی بار انسانی شعور پر بحث کی اور اس سوال کا
ایک حد تک جواب دیا جو ”مردوں کے گھر“ میں رہنے سے اس کے
دل میں پیدا ہوا تھا۔ ”مراسلات“ کے دو حصے ہیں، پہلے میں اس کا
فرضی مصنف اپنا فلسفہ حیات بیان کرتا ہے، دوسرے میں اپنی زندگی
کے چند واقعات جو اس کے فلسفے کو اور واضح کر دیتے ہیں۔

”پاتال کے مراسلات“ کا مصنف پوچھتا ہے: ”وہ کون تھا جس نے
پہلی بار یہ کہا، پہلی بار اس بات کا اعلان کیا، کہ انسان محض اس وجہ
سے ذلیل اور مضر حرکتیں کرتا ہے کہ اُسے اپنی بھلائی کی تیز نہیں اور اگر

اس کا دماغ روشن کر دیا جائے، اس کی آنکھیں کھول دی جائیں، کہ وہ اپنے حقیقی مقاصد اپنے بچے مفاد سے واقف ہو جاتے تو وہ فوراً ذلیل اور مضحکہ خیز کرنا چھوڑ دے گا، فوراً اچھا اور شریف بن جائے گا۔ اس لیے کہ اچھائی میں اسے اپنا فائدہ نظر آئے گا۔۔۔ یا یوں کہیے کہ اچھائی کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو جائے گا۔۔۔ مگر ان ہزار ہا مثالوں کا کیا کیا جائے جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ انسان جان بوجھ کر یعنی اپنے مفاد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسرے رستے اختیار کرتا ہے۔۔۔ ایک کٹھن نامعقول رستہ جس پر اسے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے یہ خود سری اور خود رائی اپنے مفاد سے زیادہ پسند ہے۔۔۔ مفاد ہوتا کیا ہے؟ اسے آپ ٹھیک ٹھیک سمجھانے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں کہ انسان کا مفاد کس بات میں ہے اور کس میں نہیں؟ کیا مفاد کی جو صدقہیں تصور کی گئی ہیں وہ بالکل قابل اعتبار ہیں؟ انسان ہمیشہ اور ہر جگہ، خواہ وہ کوئی بھی ہو، وہی کرنے سے خوش ہوتا رہتا ہے، جو اس کی طبیعت چاہتی ہے، اس بات سے ہرگز نہیں جو اس کی عقل اس سے کہتی ہے یا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے؛ انسان کی ایسی خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں جو اس کے مفاد کے خلاف ہوں بلکہ کبھی کبھی اپنا فائدہ نہ چاہنا اس کے لیے قطعاً ضروری ہو جاتا ہے۔۔۔ انسان کو حاجت ہے۔ آزاد اور خود مختار خواہشوں کی، اس آزادی اور خود مختاری پر خواہ ہے

کچھ بھی شمار کرنا ہو، اس کا انجام چاہے کچھ ہی ہو... عقل، حضرات، ایک اچھی چیز ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن عقل محض عقل ہی اور وہ صرف انسان کی ذہنی قوت کو کام میں لاتی ہے، لیکن خواہشوں میں انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، جس میں عقل مع اپنی تمام سرگردانیوں کے شامل ہے۔“

غرض کہ انسان کا سب سے قوی جذبہ خودی کا اثبات اور کائنات میں اپنی اہمیت جتانے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش اس کے خیر و شر کے معیار کو تھوڑا لاکر دیتی ہے۔ اس کی عاقبت اندیشی، اس کی عقل کا منہ چڑھاتی ہے۔ ”پاتال کے مراسلات“ کا مصنف بھی دراصل اسی خواہش کا شکار بنا ہے؛ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہتے رہتے اس کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ اسے اپنی ذلت اور رسوائی میں مزہ آنے لگا ہے، وہ ”مراسلات“ کے دوسرے حصے میں یہ قصہ سناتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ چکلے میں جا کر ایک لڑکی کو سمجھایا کہ اسے اپنا پیشہ چھوڑ دینا چاہیے اور جب وہ کچھ روز بعد اس کے پاس آئی اور اپنا پیشہ ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے لڑکی کو بے عزت کر کے چھوڑ دیا۔ یہ کمینی حرکت کبھی فلسفے کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس جذبہ باقی قوت کا اظہار جسے اپنے اثبات کی اور کوئی صورت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ”مراسلات“ کے مصنف کو اپنی حرکت پر بہت سخت صدمہ ہوتا ہے، لیکن اپنے نزدیک اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ دنیا بھر میں

وہ ذلیل سمجھا جاتا تھا، ایک بار اسے بھی اپنی شخصیت جتانے کا موقع ملا اور اس نے ایک ہستی کو اپنے سے بھی زیادہ ذلیل کر کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اگر اس کی حرکت سے ایک بیچاری لڑکی کے دل پر چوٹ لگی تو افسوس کی بات ہے مگر وہ بھی تو ایسے موقع کا انتظار کرتے کرتے عاجز آ گیا تھا۔

اسی طرح دستہ نعلی نے ”مردوں کے گھر“ میں ایک مجرم کا قصہ بیان کیا ہے جس نے اپنی نیکی، فرماں برداری اور حلم کی بنا پر قید خانے میں شہرت حاصل کر لی تھی اور قید خانے کے حاکموں نے اسے قیدیوں کی ایک جماعت کا سردار بنا دیا تھا۔ ایک دن اس پر یکا یک جنوں سا سوار ہو گیا اور اس نے ایسی حرکتیں کیں کہ اسے مجبوراً دیوانوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ دینا پڑا۔ دستہ نعلی اس واقعے کی بس یہی تشریح کر سکا کہ اس مجرم نے برسوں اپنے جذبات کو دبایا تھا اور انھوں نے آخر کار اس خطرناک طریقے پر اپنا زور دکھایا۔ اس مجرم نے لوگوں کے سر پھوڑے ”باتال کے مراسلات“ کے مصنف نے ایک غریب لڑکی کا دل دکھایا۔ دونوں حرکتیں ایک سی ہیں، ان کا محرک ایک ہی ہے۔ ”مراسلات“ کے مصنف نے تو کہہ دیا ہے کہ میں اس کا قائل نہیں کہ ان کی اپنی بھلائی چاہتا ہے اور جو کوئی بھی اپنی شخصیت محسوس کرتا ہے اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ ”مراسلات“ کا مصنف کمزور کھسیانا آدمی تھا لیکن وہ قوی شخصیتیں جو بیمار ہو کر مجرم بن جاتی ہیں، دراصل سب اسی کی

طرح اپنی شخصیت ظاہر کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ دستہ نعت سکی کو رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ جرم کا منظر جو مسائل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ دراصل نفسیات کے معنی نہیں ہیں، ان کا تعلق ایمان اور کفر، تسلیم اور بغاوت سے ہے۔ خود دستہ نعت سکی دین عیسوی کا پیرو تھا۔ وہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور خیر و شر کے اس معیار کو جو انھوں نے قائم کیا تھا معیار مطلق سمجھتا تھا، لیکن اس کے دل میں شکوک تھے، ایسے شکوک جنہیں عقل اور دلیلیں دور نہیں کر سکتیں اور جب تک یہ موجود تھے اُسے کسی قسم کے روحانی سکون کی اُمید نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تمام روحانی نگہ کش اور نزاع، انسانی شخصیت کو نامعلوم راستوں سے درجہ کمال تک پہنچانے کی وہ تمام کوششیں جن پر دستہ نعت سکی نے اپنے ناولوں میں بحث کی ہے دراصل عکس ہیں اُس کے اپنے شکوک کا اور نتیجے ہیں اس دنیا اور اُس کے مسئلہ اخلاقی اور فلسفہ حیات کو تہ وبالا کر کے ایک نئی دنیا اور نیا اخلاقی نظام قائم کرنے کی اُن آرزوؤں کا جو اس کے دل میں امنڈتی تھیں۔ مرگی کے دورے سے پہلے کائنات جس شان سے دستہ نعت سکی کو نظر آتی تھی اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ اس کی بصیرت اور ادراک اور روشن ضمیری کی انتہا تھی، ایک دیدار جس کے لیے اس کی روح للجا یا کرتی تھی ایک کیفیت جس نے اس کی نگاہوں میں انسان کے مستقبل کو عجیب دل کش صورت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دستہ نعت سکی کو انتہائی ہستی کا بھی تجربہ ہوا کرتا تھا، اس پر دیوانگی کے لمحے گزرتے تھے جب

شیطانی خواہشیں اس کا دل ہلا دیتی تھیں اور وہ اپنی وحشت سے ہنسا
 مانگتا تھا۔ وہ مہلر جو نفسیات کی اصطلاح میں ”دہری شخصیت“ کہلاتا
 ہے اور جسے دستہ نف سکی نے دریافت کیا تھا، دراصل اُن متعنا و مفتیل
 اور اُمنگوں کا مجسمہ ہے جو دستہ نف سکی اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا۔
 بہر حال اس کے لیے کائنات اور انسانی سیرت کے اسرار معلوم کرنے کا
 یہی طریقہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو جرم اور شک کا مجسمہ بنالے، جرم و
 شک اور انکار میں تشکیل زندگی کی جو قوت ہو اُسے آزمائے اور اس
 دنیا کو جگاڑ کر اگر کوئی بہتر دنیا بن سکتی ہو تو بنائے۔ چنانچہ ”جرم اور سزا“
 اور ”بھوت پریت“ میں دستہ نف سکی نے جرم اور انکار اور بغاوت کے
 فلسفہ حیات پر غور کیا ہے اور اپنے زمانے کے چند واقعات کو پلاٹ کے
 طور پر رکھ کر مجرم، منکر اور باغی لوگوں کی نفسی کیفیات اور ان کی جد
 و جد کا انجام دکھایا ہے۔ انسانی شخصیت کے اظہار کا ایک رنگ یہ ہے۔
 دوسرے پر ”محبذوب“ اور ”برادران کرمائف“ میں بحث کی جاتی
 ہے اور ہمیں ان چار نادلوں پر اسی ترتیب سے نظر ڈالنا چاہیے۔

۱۸۹۱ کے بعد ”منکریت“ کی تحریک نے بہت
 زور پکڑا اور ”منکروں“ نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ہی
 روس کو اندرونی دشمنوں سے پاک کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ معمولاً
 ریاست کے بڑے عہدے داروں پر حملے کیے جاتے تھے، لیکن ۱۸۹۵

۱۷ دیکھیں پہلا باب ”سیاسی تحریکیں اور سیاسی تعارضات“

میں ایک طالب علم نے کسی پوڑھی عورت کو جو سود پر قرضہ دیا کرتی تھی مار ڈالا اور عدالت میں بیان کیا کہ میں نے بڑھیا کو مار کر کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ہزاروں غریب آدمیوں کو ایک بنا سے نجات دلائی ہو اور ایسے لوگوں کو مار ڈالنا جو اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچاتیں قوم اور انصاف کی ایک قابل قدر خدمت ہو۔ دستہ لف سکی پر اس واقعے کا اور اس جرم کی منطق کا بہت اثر ہوا۔ ”جرم اور سزا“ میں اصل بحث اسی پر ہو کہ جرم خیر کا ذریعہ ہو سکتا ہے یا نہیں اور اگر کوئی شخص انسانی مفاد کے ارادے سے خون بہانے تو وہ انسانیت کو اور اپنی ذات کو فروغ دے سکتا ہے یا نہیں۔

”جرم و سزا“ کا ہیرداس کول فی کوفٹ ایک ہونہار مگر بہت غریب طالب علم ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ کسی بلند منصب العین یا اعلیٰ فلسفہ حیات پر جانیں نثار کرنا کوئی جرم نہیں اور تاریخ میں اس کے ہزار ہا ثبوت ملتے ہیں کہ جن شخصیتوں نے زندگی کو ایک بہتر شکل دی ہے کبھی خون بہانے سے نہیں ڈری ہیں۔ اپنی ذات کے لیے وہ اس عام اصول سے یہ خاص نتیجہ نکالتا ہے کہ اُسے ایک بڑھیا کو جس کے پاس اُس نے کچھ چیزیں گزریں رکھائی تھیں اور جو بہت مالدار تھی مار کر نقد روپے پر قبضہ کر لینا چاہیے اور یہ دولت حاصل کر کے ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہیے جس میں اسے اپنے جو صلے پورے کرنے کا بہتر موقع ملے۔ کچھ کشمکش کے بعد وہ ایک دن جا کر کھہاڑی

سے اس بڑھیا کا سر پھوڑ دیا ہو اور اسی کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن کا جو اتفاق سے کمرے میں آجاتی ہے۔ ان دونوں کو مار کر اور دونوں کی ایک قیل چڑا کر وہ گھر بھاگ جاتا ہے۔ اس نے جرم نہایت بھونڈے طریقے سے کیا تھا اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن وہ اپنے اصل ارادے کو عمل میں نہیں لاسکا، اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جرم کرنا آسان ہے، مگر اسے ایک نئی زندگی کی بنیاد بنا نہایت مشکل ہے اور جن تاریخی شخصیتوں نے خون بہا کر اپنی زندگی کو فروغ دیا ان کی سرشت ہی کچھ اور تھی۔ اس کو لنی کوف کے جرم نے اُس کے حوصلوں کا خون چوس لیا، اس کے ارادے کی قوت چھین لی، منزل مقصود کو اس کی نظر سے چھپا دیا۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ اس کو لنی کوف دل سے اخلاقی خیر و شر کے معیار کا قائل نہیں تھا، جب تک اس کا جرم محض ایک ارادہ تھا اُسے یہ خیال رہا کہ میں ایک اصول کے ماتحت عمل کر رہا ہوں، میری کوششوں کا ایک مقصد ہے۔ بڑھیا کو قتل کرتے ہی اس کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ نئی زندگی جو دور سے اس مرحلے کو طو کرنے کے بعد شروع ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی قریب پہنچنے پر سراب کی طرح فضائے نامحدود میں غرق ہو گئی۔

قتل کے بعد اس کو لنی کوف کے روحانی ڈراما کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی منطق کا اس قدر قائل تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کی ہشمانی یا قصور کا احساس نہیں پیدا ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اُس کی روحانی تکلیف اور بھی بڑھ گئی، کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو

مجرم نہیں مانتا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ اخلاقی قانون اور خیر و شر کا وہ معیار بھی جس کی خاطر اس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا اور جسے وہ اپنی نئی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا چاہتا تھا، دراصل کچھ بھی نہیں، محض ایک خیال خام ہے۔ اس احساس نے اس کے نفس میں ایک روحانی اور اخلاقی خلا پیدا کر دیا جسے برداشت کرنے کی اس کو دل نکوف میں ہمت نہ تھی اور جسے دراصل کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس خلا سے خوف کھا کر اس نے ان تاریخی ہستیوں میں شامل ہونے کا حوصلہ چھوڑ دیا جن کی پیروی میں اُس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا اور اس کی آرزو کرنے لگا کہ کسی طرح سے عوام کی ذہنیت اختیار کر لے اور اپنے دل میں اس معیار کو بھر قائم اور استوار کر دے جس پر عوام کا فلسفہ حیات مبنی ہوتا ہے۔ اس نے سوچا سے اپنے جرم کا اقبال کیا۔ سوچا ایک غریبہ مسکین اور پاک دل لڑکی تھی جس نے اپنی سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں کو فاقے سے بچانے کے لیے مجبوراً ایک ذلیل پیشہ اختیار کیا تھا اور وہ نہ صرف ایثار کا ایک پُروردہ مجسمہ تھی بلکہ اُس عقیدت کا ایک اعلیٰ نمونہ جو انسان میں روحانی تکلیفیں برداشت کرنے کی حیرت انگیز قوت پیدا کر دیتی ہے۔ سوچا کے کہنے سے راسکول فی کوف نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا، اور اُس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی آمادہ ہو گیا، لیکن پھر بھی وہ اپنے دل میں خطا کا احساس نہیں پیدا کر سکا، اپنی منطق کی خامی کا قایل نہیں ہوا اور اپنی ناکامی کا الزام اپنی بہت ہمتی اور اس بڑھیا پر لگا تار ہا جسے اس نے قتل کیا تھا۔

اس کی ذہنیت میں انقلاب اُس وقت ہوا جب وہ سائی بی ریا میں ڈیڑھ سال رہ چکا تھا۔ اُس نے ایک خواب دیکھا کہ ایشیا کی طرف سے ایک نئے قسم کا طاعون آیا ہے جو ہزاروں بستیوں کو ویران کر رہا ہے، اس بیماری کے جراثیم بھی نئی قسم کے ہیں، ان میں عقل اور ادا دے کی قوت ہے اور جس کسی کے جسم میں وہ اپنا گھر کر لیتے ہیں وہ فوراً پاگل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے عقل مند، روشن ضمیر اور بلند حوصلہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس خطب میں مبتلا ہونے سے لوگوں میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے، ایک دوسرے کا احترام کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی، وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں، جانیں ضائع ہونے لگتی ہیں، زندگی تہ و بالا ہوجاتی ہے اور چند برگزیدہ ہستیوں کے سوا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہتا۔ اس خواب نے اس کو لنی کو ف کا اس اصول کے آخری اور لازمی نتیجے سے آگاہ کر دیا جس پر عمل کرنے کا اسے حوصلہ تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر ہر شخص اثبات خودی کو زندگی کا مقصد بنائے، ایک برگزیدہ شخصیت بن بیٹھے اور ہر قسم کا جرم اپنے لیے روا رکھے تو انسانی زندگی ناممکن ہے۔ اثبات خودی کا اصول غلط ہے، اس پر زندگی تعمیر نہیں ہو سکتی، بلکہ جو کچھ انسان نے اپنی محنت اور تکلیفوں سے تعمیر کیا ہے وہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس خواب کے بعد اس کو لنی کو ف کا دل انسانی ہمدردی اور محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، اس میں نہ غرور رہتا ہے نہ خود رائی اور سونیا اور وہ ایک نئی زندگی کے خوابوں سے اپنی مصیبت کے دن روشن کرتے ہیں۔

اس کو دل کی کوفت کے اصول کی فطری "جرم و منکر" کا ایک پہلو ہے۔
 اس کا دوسرا پہلو شعور اور جذبات کی دو کیفیتیں ہیں جو ہر دلیل سے زیادہ
 اس کو دل کی کوفت کی گراہی عیاں کرتی ہیں۔ ناول کے شروع ہی میں
 ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ گوداس کو دل کی کوفت نے جرم کا پختہ ارادہ کر لیا ہے
 اور ہر وقت اپنے آپ کو یاد دلا کر کہ ایک مہم اُس کے دہشت پر اپنے
 دل کو مضبوط کرنا رہتا ہے، نہ تو اُس کی ذہنیت ایک مجرم کی سی ہے نہ
 سرشت۔ بڑھیا کو قتل کرنے سے پہلے وہ ایک خواب دیکھتا ہے کہ بہت
 سے کسان نئے میں ایک دہلی کمزور گھوڑی کو بے دردی سے پیٹ رہے
 ہیں اور بیماری کو پیٹتے پیٹتے مار ڈالتے ہیں۔ اس خواب کے بعد وہ اپنا
 ارادہ ترک کر دیتا ہے اور ارادہ ترک کرتے ہی اس کے دل پر سے ایک
 بوجھ اتر جاتا ہے، اُس کی طبیعت صاف ہو جاتی ہے اور زندگی اس کی
 نظروں میں ایک دل فریب شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن سڑک پر جاتے ہوئے
 وہ کہیں سن لیتا ہے کہ بڑھیا چھبے شام کو گھر پر ہوگی، اور اس پر پھر
 قتل کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو فروغ دینے کی آرزو اپنا جادو کر دیتی
 ہے۔ وہ بڑھیا کو قتل کرتا ہے، مگر اس جرم کا اس پر جو اثر ہوا اور اس کے
 علاوہ سونیا اور اُس کے شرابی باپ اور دیوانی سوتیلی ماں کے ساتھ جو
 سلوک وہ کرتا ہے، یہ سب اس کا ثبوت ہیں کہ وہ طبیعتاً نہایت شرعی،
 بھولا اور محبت والا آدمی ہے اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا
 بہت قوی جذبہ ہے۔ مجرم میں یہ اوصاف نہیں ہوتے اور جس میں یہ اوصاف

ہوں وہ جرم کر کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا لیکن اس کو لنی کوٹ نے جرم کے فلسفہ حیات کا اپنی طبیعت پر بہت گہرا رنگ چڑھا لیا تھا، اسے اپنی طبیعت کا اصل رنگ یاد ہی نہیں رہا اور اس طرح وہ بھلائی کرنے کے باوجود اس روحانی تقویت سے محروم رہا جو بھلائی کرنے سے انسان کی شخصیت کو ہوتی ہے۔

”جرم و سزا“ میں سونیا کی شخصیت انسانی شعور کی تاریک اور طوفانی فضا میں کچھ روشنی پیدا کرتی ہے اور منزل مقصود کی ایک جھلک دکھا دیتی ہے، ”بھوت پریت“ میں اتنی تسکین بھی نہیں ملتی۔ ”جرم و سزا“ کی طرح اس ناول کا اصل قصہ بھی بہت مختصر ہے۔ سٹاف روگن، کریل لوٹ، وورخو ولسکی اور سٹاف لوٹ سربراہانِ درہ رکن ہیں ایک جماعت کے جو روس میں اخلاقی اور معاشی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ انقلاب پہلے کرنا کوئی آسان کام نہیں، مگر یہ نوجوان، جن کے اصل رہبر سٹاف روگن اور اس کا پٹھو وورخو ولسکی ہیں، اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ انہیں عنقریب کامیابی ہونے والی ہے اور جب سٹاف روگن اور وورخو ولسکی آخر میں دیکھتے ہیں کہ ان کی جماعت مایوس ہو کر منتشر ہونے والی ہے تو وہ سٹاف لوٹ پر جس کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے، غداری کا الزام لگا کر اسے بڑی بے دردی سے مار ڈالتے ہیں۔ کریل لوٹ پہلے ہی خودکشی کر چکا ہے، اس جرم کے بعد وورخو ولسکی غائب ہو جاتا ہے اور سٹاف روگن بھی خودکشی کر لیتا ہے۔ درستہ لٹسکی نے اس داستان کا جو پس منظر دکھایا ہے

اور جو ضمنی قصے اس میں جا بجا چھڑتے جاتے ہیں، وہ اس کو بظاہر بہت سنجیدہ بنا دیتے ہیں اور یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ساری رام کہانی محض زبان ہی۔ لیکن جو لوگ انقلابی جماعتوں کے اندرونی کاروبار سے ذرا بھی غیب رکھتے ہیں یا جن پر وہ کیفیتیں گزر چکی ہیں جب جذبات میں ہیجان ہوتا ہے، دل میں اُتنگیں جوش کرتی ہیں، انسان ہر وقت اپنی شخصیت کا پورا راز دکھانے پر تیار ہوتا ہے، مگر اسے اپنی طاقت اور قابلیت دکھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا اور اس کے حوصلے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رہ جاتے ہیں، ایسے لوگ فوراً تسلیم کر لیں گے کہ دستہ لف سکی نے حقیقت نگاری میں کمال دکھلایا ہے، اور یہاں بھی انسانی شعور کی کیفیات کے علم کا خزانہ نشا یا ہے۔

”بھوت پریت“ منکریت کے فلسفہ حیات اور ضمنا یورپ کی ماویٹ کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ دستہ لف سکی نے اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا ہے، ایک ظاہری، دوسرا باطنی، ایک وہ جس کا تعلق عام تہذیب اور تمدن سے ہے دوسرا وہ جس کا تعلق انسانی شعور اور انسانی شخصیت کی گہری ذاتی ضروریات سے ہے۔ ستاف روگن، کریل لفٹ و درخود نسکی، شا تو ف سب باغی ہیں، جن میں درخود نسکی نے معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے اور کریل لفٹ اور ستاف روگن نے انسان کے اخلاقی اور مذہبی معیار اور کائنات کے کل نظم و نسق کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ درخود نسکی جیسے لوگ ہر انقلابی

جماعت میں نظر آتے ہیں، وہ ایک کمینی مگر مضبوط طبیعت کا آدمی ہے، ایک مجرم جسے صرف ایذا پہنچانے میں نہیں بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے میں اور اداہام میں مبتلا کرنے میں لطف آتا ہے، جو ایک نظام کو تہہ و بالا کر کے دوسرے کسی اعلیٰ غرض سے نہیں قائم کرنا چاہتا، بلکہ محض تباہی اور بربادی کا منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ کریل لوٹ اورستان روگن کسٹری اور اثبات خودی کی مثالیں ہیں اور ان کی روحانی سرگزشت اس ناول کا دوسرا اور گہرا پہلو ہے۔

کریل لوٹ اورستان روگن دونوں باغی ہیں، دونوں نہ خدا کی خدائی تسلیم کرتے ہیں نہ انسان کی انسانیت۔ کریل لوٹ ایک موقع پر کہتا ہے: ”اگر خدا ہی تو ہر بات اس کے حکم سے ہوتی ہے اور میں اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں۔ لیکن اگر خدا نہیں ہے تو میں قادر مطلق ہوں اور اپنی قدرت دکھانے پر مجبور ہوں“ اور چونکہ اسے خدا کا وجود تسلیم کرنا منظر رہنمیں وہ اپنی قدرت دکھانے کے خطا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کے وجود کا مقصد اس کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ عام طور سے اپنے اس اہم فرض سے غافل رہیں، جب کہ ”ساری دنیا محض ایک فریب ہے اور اس کی بنیاد فریب اور انسانی ہستی کی تحقیر پر ہے، جب کہ دنیا کے سارے آئین جھوٹے ہیں اور شیطانوں کا مٹاشا“۔ خود کشی سے قبل وہ اپنی حرکت کو جائز اور خود داری کا صریحی تقاضا ثابت کرتا ہے ”مجھے تعجب ہوتا ہے

کہ سب لوگ کیسے بلا تامل جیتے رہتے ہیں۔ کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد آدمی نہیں ہے جو خدا کے وجود کا خاتمہ کر کے اور اپنی شخصیت کی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملے میں خود مختاری جتانے کی ہمت کر سکے؟ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کسی فقیر کو درختے میں شرمیلوں کی پھیلی لے اور وہ یہ یقین نہ کر سکے کہ وہ اس کا مالک بننے کے قابل ہے۔ میں اپنی خود مختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں ہیں اسے ثابت کروں گا، چاہے مجھے ایک بھی پیرو یا شریک کار نہ ملے۔ مجھ پر لازم ہے کہ اپنے گولی مار لوں، کیونکہ اپنے ہاتھوں فنا ہونا خود مختاری کی انتہا ہے۔ ستاف روگن کی شخصیت دوسرے قسم کی ہے، اس کی بغاوت کا اندازہ کچھ اور ہے۔ اسے کسی وجود یا قوت کا احساس نہیں جو کائنات پر حاوی اور اس کے نظام کی روح و رداں قرار دی جاسکے، وہ باغی ہے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ کسی عقیدے یا اصول کی بنا پر تسلیم غم کرنا غلط سمجھتا ہے، بلکہ محض اس وجہ سے کہ بغاوت اور سرکشی اس کی سرشت میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستاف روگن کو اپنے دل میں اور کل کائنات میں ایک خلا نظر آتا ہے، زندہ ہونے اور کل ہستی کا ایک جزو ہونے کا وہ شعور جو انسان کو کائنات سے وابستہ رکھتا ہے اور اس کی زندگی کو ایک خود سے جاری مل بنا دیتا ہے ستاف روگن کے ذہن میں معدوم ہو جاتا ہے اور وہ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہر طرف سہارے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے روحانی خلا کو کسی قوت کا میدان

عمل بنائے، اپنی بے مقصد زندگی کے لیے کوئی مقصد تلاش کرے اور پورا انسانی زندگی اور کائنات سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قائم کرے۔ اسے کامیابی نہیں ہوتی، اس کی باغی فطرت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کو اپنا سردار یا شریکِ کار بنائے، اس کا ادراک ہر وقت اسے بتاتا رہتا ہے کہ وہ تمام مقاصد جن میں وہ یا اور لوگ مشغول ہیں محض ڈھکوسلے ہیں۔ یوں وہ اپنی قوت کو تعمیر کے کام میں نہیں لاسکتا اور چونکہ سکون فطرتاً ناممکن ہے اس لیے یہ قوت تباہی اور بربادی کا ایک خطرناک ذریعہ بن جاتی ہے لیکن شاعر لیر فتوف کے شیطان کی طرح بیٹا روگن کو بُرائی کرنے میں اور دوسروں کو دکھ پہنچانے میں کوئی لطف نہیں آتا، اسے معلوم ہے کہ اس کے مقاصد بھی ویسے ہی لغو اور بیچ برس جیسے کہ دوسروں کے اور اسے کسی قسم کی تسلی دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ستاف روگن نے پہلے شہوت پرستی اختیار کی اور یہ چاہا کہ اپنی پوری شخصیت کو اس میں محو کر دے۔ لیکن اس کی شہوت پرستی زبردستی کی تھی، اس میں ستاف روگن کو نہ کسی قسم کی لذت حاصل ہوئی نہ شہوانی حرکتوں پر کوئی ندامت ہوئی اور وہ خلا جسے وہ اس طرح سے پُر کرنا چاہتا تھا ویسا ہی رہا۔ اس ناکامی کے بعد ستاف روگن منکروں میں شامل ہو گیا کہ شاید دوسروں کی طرح اس پر بھی کوئی بھوت سوار ہو جائے، یا وہ کسی ضبط میں مبتلا ہو جائے۔ منکریت کی تعلیم سے اسے مطلق کوئی عقیدت نہیں تھی، لیکن اس نے انہماکی

عقیدت ظاہر کی اور اس کی بھی کوشش کی کہ دوسرے دل کا عقیدہ پختہ ہو جائے۔ یہاں بھی وہ ناکام رہا اور اس کے عقیدت مندوں کے جوشِ اعتقاد کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر اسے اپنی شخصیت کی قوتِ جتنے کی سوچھی، اس نے ایک سنگڑی، بد قلع اور مجنون عورت سے شادی کر کے اس کا ہر جگہ اعلان کیا، اپنے آپ کو انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ بھری محفل میں رستا کرایا، بغیر آنکھ جھپکائے ایک حریف کے پستول کا سامنا کیا۔ یہ دوا بھی بے اثر تھی۔ اس کے بعد ستاروں نے عشق کے سایہ میں پناہ لینا چاہی، مگر اس جذبے میں بھی وہ روحانی خلا، جس سے وہ بچنا چاہتا تھا اسے ستاتا رہا۔ اب اس سے گریز کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، کیونکہ موت کے ذریعے سے نجات پانے کا خیال بھی اسے ایک ڈھکوسلا نظر آیا۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا ”مجھے معلوم ہے کہ یہ بھی نثر منہ گی کا باعث ہوگی۔ خود فریبی کی ترکیبوں میں ایک اور مہمل ترکیب“۔ مگر آخر کار اس نے رہائی کی یہی تدبیر اختیار کی۔

”جرم و سزا“ اور ”مہرت پریت“ میں دستِ لکھنے کی نے دکھایا کہ اثباتِ خودی سے، شخصیت کا مل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس میں وہ تمام ذریعے جو انسان کو کامل بنا سکتے ہیں معدوم ہو جاتے ہیں اور انسان یا تو اس گولِ نکوف کی طرح اپنی تنہائی برداشت نہیں کر پاتا اور نیز و شر کے معیار کی عدم موجودگی سے بے بس ہو جاتا ہے، یا اس کا

زندگی اور خیالات میں دیا ہی بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسے کہ ستان
 روگن کی زندگی میں اور وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکنے لگتا ہے لیکن
 اثبات خودی کے علاوہ بغاوت کی اور وجہ بھی ہو سکتی ہیں، ایسے انسان
 بھی خدا کو اور کائنات کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں جن کی
 بغاوت میں اپنی کوئی غرض نہیں، جو اپنی شخصیت کا بیجا فروغ نہیں چاہتا،
 جو تکبر کے زعم میں دوسروں کو اپنے مقاصد پر نثار کرنا منطق سے صحیح نہیں
 ثابت کرتے۔ یہ باغی دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جو مظلوم ہیں، دوسرے
 وہ جنہیں اور دوس کی بے کسی اور مظلومیت کا احساس ہے۔ ”محبوب“ میں
 نسا سیا فلی پونفا اور ”برادران کرمازوت“ میں ادا ان دونوں کی
 کی مثالیں ہیں۔

نسا سیا فلی پونفا کا باب ایک نہایت شریفانہ آدمی تھا جس کی ساری
 عمر ناگہانی مصیبتوں کا سامنا کرتے گزری۔ اس کی تقدیر کا آخری وار پر
 تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر میں آگ لگ گئی، اس کی دو
 بچیاں توجیح گئیں مگر اس کی بیوی سح کل گھر گرستی کے جل گئی۔ اس وجہ سے
 نے اسے ہلاک کر دیا اور اس کی دونوں بچیاں لا ادارت ہو گئیں۔ توٹس کی
 قریب کے ایک خوش حال زمیندار نے رحم کیا کہ بچیوں کی پرورش اپنے
 ذمہ لے لی اور ان کی تعلیم کا انتظام کر کے انہیں اپنی کسی غریب رشتے دار
 کے سپرد کر دیا۔ بڑی بچی تو چند سال بعد مر گئی، چھوٹی نسا سیا زندہ رہی اور
 جب اس کی عمر بارہ سال کی ہو گئی تو توٹس کی نے دیکھا کہ وہ حسن اور

ذہانت میں یکتا ہو اور اس سن رسیدہ عیاش کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے
 نستاسیا کی تعلیم کا اور بہتر انتظام کر دیا اور جب وہ سولہ سال کی ہو گئی تو اپنے
 دور افتادہ گائوں میں ایک مکان بنوایا، اسے خوب آراستہ کیا اور اس میں
 نستاسیا کو اپنی مدخل بنا کر رکھ لیا۔ اس کے خیال میں نستاسیا بہت خوش اور
 مطمئن تھی، نستاسیا کے دل کی کیفیت کا پتہ اس کو تب چلا جب چار سال
 بعد اسے ایک شریف لڑکی سے شادی کرنے کا حوصلہ ملا اور وہ نستاسیا
 سے چھپا چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ نستاسیا اس کے ارادہ کی خبر سن کر
 تین تنہا گائوں سے نکل کر پتیر برگ پہنچی اور پہلی ہی گفتگو میں توٹس کی کو معلوم
 ہو گیا کہ اسے ایک سیدھی سادی لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بے حد چالاک
 اور بے باک عورت سے سابقہ ہے جس کے دل پر اتنے زخم لگ چکے ہیں کہ اب
 اسے زخموں کا کوئی خوف نہیں، جو دکھ سہتے سہتے دیوانی ہو گئی ہو اور جسے
 اپنی زندگی کے بگڑنے کی مطلق پروا نہیں ہے۔ توٹس کی کونڈیشہ تو ضرور
 تھا کہ اب نستاسیا پر قابو رکھنا اس کے بس کی بات نہیں، لیکن پھر بھی وہ
 نستاسیا کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا رہا جس وقت "مجدوب" کا قصہ
 شروع ہوتا ہے، نستاسیا پتیر برگ میں پانچ سال رہ چکی تھی، توٹس کی بے
 اس کے لیے ایک شوہر تلاش کیا تھا اور وہ اس کا دوست جنرل
 اسے پانچ نستاسیا کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کر رہے تھے اور
 پچھتر ہزار روپے جہیز میں دینے کا لالچ دے رہے تھے۔ نستاسیا کو معلوم
 تھا کہ وہ شخص جس سے یہ اس کا نکاح کرانا چاہتے ہیں محض روپے کے لالچ

میں شادی کر رہا ہی اور جہیز کا روپیہ ان دنیا داروں کے خیال میں بڑی سے بڑی قیمت ہی جو ایک عورت کی عزت اور آبرو کی ہو سکتی ہے۔ یہ آخری بے حُرستی، ایک ایسا صدمہ تھی جسے وہ برداشت نہ کر سکی اور اس دنیا اور ان اخلاقی معیاروں کا منہ چڑانے کے لیے جو ایسا ظلم روا رکھتے تھے اس نے اپنی پچیسویں سالگرہ کے دن ایک محفل میں جس میں تولس کی او اے پانچن دونوں موجود تھے اپنے آپ کو ایک لاکھ روپے کے بدلے روگوٹرن ایک خطی تاجر کے ہاتھ بیچ دیا اور تولس کی اور اس کی دی ہوئی دولت اور آسائش کو خیر باد کہہ کر روگوٹرن اور اس کے شہدوں کے ساتھ چل دی۔

اسی محفل میں نواب لٹ نکولا یوچ میٹکن، "میزوپ" کا ہیرو، جسے کوئی دماغی مرض تھا اور جو اسی دن اچھا ہو کر سوستان سے واپس ہوا تھا، بن یلائے پہنچ گیا تھا۔ محفل میں جانے سے پہلے اس نے اتفاق سے نستاسا نلی پوفنا کی تصویر دیکھ لی تھی اور اتفاق سے دونوں کی ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ میٹکن کو نستاسا کی آنکھوں میں ایک باغیرت دل کے درد، پاک آرزوؤں کی تباہی کے غم، اور انسانی فطرت کے کیتھ پن کی شکایت ایسی موثر شکل میں نظر آئی کہ اس کا دل بیتاب ہو گیا اور اس نے اپنا فرض سمجھا کہ نستاسا کے پاس جا کر اپنے سر کو اس کے قدموں پر رکھ دے اور اس کے درد اور غم اور شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے وہ جو کچھ کر سکتا تھا اور کرنا چاہتا تھا اس کا وعدہ ایک ناپینر

تحفے کے طور پر پیش کرے۔ اس نے اپنا ارادہ پورا کیا، نستا سیا کو یقین دلایا کہ باوجود توٹس کی کی مدخل رہنے اور آوارگی اور بد اخلاقی کی بنا پر بدنام ہونے کے وہ دراصل معصوم اور بے گناہ ہے، اسے وہ واقعات یاد دلائے جب اس نے ایسی شرافت اور غیرت دکھائی تھی جس کا شاہبہ بھی اس کے معترضوں میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میٹکن نے کہا کہ میں شوہر کی حیثیت سے تمام عمر آپ کی خدمت، عزت اور دل جوئی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن نستا سیا اب "بغاوت" پر تل چکی تھی، میٹکن کی باتوں کا اور اس کے وعدے کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا، مگر اس نے میٹکن کی تجویز منظور نہیں کی۔ وہ بہت کچھ برداشت کر چکی تھی، اب اس نے ہتھیہ کر لیا تھا کہ ہر صورت میں اپنی آزادی محفوظ رکھوں گی اور جس دنیا نے مجھے بے بس پا کر رسوا کیا اس میں طوفان برپا کر کے اپنی طاقت کو دکھاؤں گی۔ محفل میں اپنے آپ کو روگوژن کے ہاتھ بیچنے کے بعد وہ اس ارادے پر قائم رہی۔ کچھ دن روگوژن کے ساتھ عیاشی کر کے وہ پیتز برگ سے بھاگ کر ماسکو میں روپوش ہو گئی، کیونکہ روگوژن اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا؛ پھر جب روگوژن نے اس کا پیچھا کیا تو نستا سیا نے میٹکن کے پاس پناہ لی اور میٹکن نے اُس سے نکاح کرنا چاہا تو آخر وقت میں اسے چھوڑ کر روگوژن کے پاس پھر بھاگ گئی۔ یہی واقعہ دوبارہ پیش آیا اور آخر ہی دفعہ جب وہ روگوژن کے قبضے میں آئی تو اس نے اسے مار ڈالا "محبذوب" کا آخری سین یہ ہے کہ

روگوژن، میٹکن کو، جو نسا سیا کی تلاش میں ہے، اس کمرے میں لے جاتا ہے جہاں اس نے نسا سیا کے سینے میں چاقو بھونک دیا تھا اور میٹکن کو اس کی لاش دکھاتا ہے، پھر دونوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اور آخر میں جب دوسرے دن لوگ دروازہ کھڑکرا کر اندر گھستے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ روگوژن اور میٹکن دونوں پاس بیٹھے ہیں، روگوژن کو سر سام ہو گیا ہے اور وہ رہ رہ کر چلا اٹھتا ہے، میٹکن بھر اُسی دماغی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے جس سے وہ اچھا ہو کر روس آیا تھا اور اب بالکل پاگل ہے۔ یہ منظر اس قدر بُرد و وحشت انگیز اور دل ہلا دینے والا ہے کہ کوئی صاحب دل اسے پڑھ کر اپنے ہوش و حواس میں برقرار رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

نواب میٹکن کا دوبارہ پاگل ہو جانا دلیل ہے اس کی ناکامی کی اور اس کی ناکامی میں خود دستہ ٹف سکی بھی شریک ہے، کیوں کہ میٹکن انسان کامل کا پہلا مجسمہ ہے جو دستہ ٹف سکی نے بنایا اور بنا کر آزمائش کے لیے دنیا کے میدانِ عمل میں کھڑا کیا۔ میٹکن آئینِ عیسیٰ کا سچا پیرو ہے، گو وہ مذہب پر گفتگو نہیں کرتا، اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کسی اور جذبے کی گنجائش نہیں۔ اس کا سلوک بھی ہر وقت ہر ایک کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کے ایک بچے پر دکا ہونا چاہیے۔ پہلے پہل اس کی انتہائی سادگی اور سادہ لوحی دیکھ کر لوگ اسے دیوانہ سمجھتے ہیں، لیکن اسے اپنی

پاک دلی، بے نفسی اور بے ریائی ثابت کرنے میں دیر نہیں لگتی اور لوگ خود بخود اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مردم شناسی اور موقع شناسی، دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی، لوگوں کی فطرت اور ان کی نیت کا وجدانی علم اسے راست گوئی اور راست بازی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کا ذہن اس قدر قوی اور روشن ہے کہ کبھی کوئی اسے بے وقوف نہیں بنا سکتا، گو اس کی طبیعت ایسی ہے جس پر دنیا داروں کا خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ مینٹکن نے وہ تمام مرحلے بغیر کسی خاص دشواری کے طے کر لیے جن سے آئین عیسوی کے سچے پیرو کو گزرنا پڑتا ہے، اس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا، خطاؤں سے درگزر کرنا، سچ بولنا، دوسروں کا بھلا چاہنا سکھایا، اُس نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی پیروی دنیاوی اغراض کے لیے بھی مفر یا محذوش نہیں، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نستا سیا پر اس کی شخصیت کا مطلق اثر نہ ہوا اور یہ ناکامی اس کی تباہی کا سبب ہوئی، کیونکہ نستا سیا کو خدا سے اور دنیا سے خوش نہ کر سکا گو یا یہ تسلیم کرنا تھا کہ دل کے بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی دوا میسج کے پاس بھی نہیں۔ مینٹکن کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان کو اپنے اد پر پورا اختیار ہوتا ہے اور اسے کوئی اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنی بھلائی چاہے۔ عموماً انسان اپنے آپ کو مجبور

سمجھتا ہے اور اس مجبوری کا احساس اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اُسے اپنے اختیار کی مطلق خبر ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کسی انسان کو ویسے ہی روحانی مددے پہنچیں جیسے نسا سائنس نے برداشت کیے اور وہ بیزار ہو کر اپنے کل اختیار کو عمل میں لائے تو اُسے کوئی قابو میں نہیں لاسکتا، پھر نہ مسیحی ایثار اور محبت کام آتی ہے نہ دنیا داروں کی نصیحتیں اور عقل سلیم کی ہدایتیں۔

دست لف سکی کے خیالات کو سلسلے سے بیان کرتے ہیں ہمیں ”مجدوب“ پر ناول کی حیثیت سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن دراصل ”مجدوب“ میں فلسفہ بہت کم نمایاں ہے۔ زندگی اور انسانی فطرت کی مصوری کے اعتبار سے وہ دست لف سکی کا بہترین ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ خبرل اُسے پانچن کی لڑکی اٹھایا شوخ چین تنک مزاج، دلیر، جو میٹکن سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اسے خبر میں نسا سائنس پوٹنا کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے، بے بچھٹ، خوشامخوروں کا سرتاج، جو ہر رئیس کے نسب نامے اور کمزوریوں اور عیاشیوں سے پوری واقفیت رکھتا ہے؛ اپرلیٹ، ایک ذہنی باغی جو بڑی دھوم سے ثابت کرتا ہے کہ دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں۔ اور بڑے جوش اور عقیدت سے اعلان کرتا ہے کہ میں خود کشی کرنے والا ہوں، مگر آخر وقت میں اس کا پستول نہیں چلتا اور اسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ مجھے ناکامی پستول کی خرابی سے ہوئی، اس میں میری ہمت کا قصور نہیں ہے، یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے کیریکٹر ہیں جن کی سیرتیں اور مشاغل بیان کرنے میں دست لف سکی نے مصوری کے کوششے دکھائے ہیں۔ لیکن ان کوششوں کی عظمت کا پورا اندازہ ناول پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے، یہاں اُسے واضح کرنے کی گنجائش نہیں۔

انسان کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا کوئی ایسی نادربات نہیں ہے۔ ناستاسیا فلی پوفنا کی طرح ہر اخلاقی پابندی سے انکار کر کے والے بہت کم ہوئے ہیں اور اختیار کی بدولت اپنی ذات کو نقصان پہنچانے والے اور بھی کم۔ عموماً انسان رسم و رواج، اخلاقی معیار اور مذہبی احکام کی پابندی سے اُسی وقت انکار کرتا ہے جب ان پر عمل کرنا اسے اپنی ذات کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم اس کی سرکشی کو غلط اور صمیم، جائز اور ناجائز قرار دے سکتے ہیں، لیکن جب اسے وہی شکایتیں ہوں جو ناستاسیا کو تھیں، اس کا دل ویسا ہی ہو، آرزوئیں وہی، تو پھر ہر شخص جس میں ہمدردی کی ذرا بھی صلاحیت ہو، اس پر الزام لگانا، یا اس کے رویے کو ناجائز قرار دینا ظلم سمجھے گا۔ نواب مینکن ہمدردی اور ایثار کا مجسمہ تھا۔ اس لیے اُس نے کبھی ناستاسیا پر نکتہ چینی نہیں کی، ہمیشہ اس کے رویہ و اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو قصور دار بتاتا رہا؛ اور آخر میں جب ناستاسیا نے اپنے اختیار کی بدولت جان کھوئی تو مینکن کو اس کی تباہی پر اتنا صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی پاگل ہو گیا۔ ”محبوب“ کا یہ انجام دستہ لف سکی کی نزاکت احساس اور نکتہ رسی کی بہت گہری دلیل ہے، مگر گمراہ کا جان کھونا اور رہنا کا دیوانہ ہو جانا جبر و اختیار کے اخلاقی معیے کو حل نہیں کرتا۔ ”برادران کرم ازوف“ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے خود دستہ لف سکی کو یقین

ہو گیا کہ اگر مفروضہ انسان کامل درد کی صدا سن کر اسی طرح تڑپ اٹھے اور بدحواس ہو جائے جیسے نواب میشکن تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے اُس نے انسان کامل کا ایک اور مجسمہ بنایا، درد کی صدا ویسی ہی دلسوز رکھی، مگر اپنے ہیرہ کے دل کو گھل جانے کی کمزوری سے بچا لیا۔ ”برادران کرمازوف“ میں درد کی صدا اداں کرمازوف بلند کرتا ہے اور وہی باغی بھی ہے، الک سے ی (الیوشا) کرمازوف، اس کا چھوٹا بھائی مسیحی اوصاف کا نیا مجسمہ ہے۔

”برادران کرمازوف“ دستہ نف سکی کا سب سے لمبا ناول ہے، لیکن پھر بھی اسے نامکمل سمجھنا چاہیے، کیوں کہ دستہ نف سکی کا ارادہ تھا کہ اُس کے سلسلے کو جاری رکھے اور الیوشا (الک سے ی) کرمازوف کی مفصل سرگزشت بیان کرے۔ دستہ نف سکی کو موت نے آگھیرا اور وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا، جس کی وجہ سے الیوشا کی شخصیت کا صرف خاکہ سا بن کر رہ گیا اور اس کے ذریعے سے دستہ نف سکی نے تشکیلی زندگی کے جو دل فریب منصوبے باندھے تھے وہ پورے نہیں ہو سکے۔ ناول کا دوسرا پہلو، جس میں شک اور بغاوت نئے رنگ میں دکھائی گئی ہے، بہت زیادہ مکمل ہے، اداں کرمازوف کا فلسفہ بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ناول کی موجودہ شکل میں وہی اس کا سب سے زیادہ دل چسپ پہلو ہے۔ الیوشا اور اداں کرمازوف کے علاوہ ان کا بڑا بھائی، ستیا (دمتری کرمازوف)، ان کا باپ، فیوڈور پافوڈیچ کرمازوف

سمجھیا کوٹ، فیوڈور پافلوویچ کا حرامی لڑکا اور ایک رہبان زوسیما
ناول کے ممتاز کیرکٹر ہیں اور ناول کا بہت بڑا حصہ ان کی سرگزشت
سنانے میں صرف ہوتا ہے، اس ناول کے سنوائی کیرکٹر بہت کمزور ہیں اور
نستاسیا فلی پوفنا، اگلیا، ”بیکس و مظلوم“ کی ہیروئن ناستاشا اور ”جرم
وسرا“ کی ہیروئن سونیہ کے مقابلے میں وہ مصنوعی اور بے جان معلوم
ہوتے ہیں۔

فیوڈور پافلوویچ کرمازوف ایک عیاش، بد طبیعت، خود غرض
اور بے حیا آدمی ہے، جس کے ساتھ کسی قسم کی انسانیت برتنا محال
ہو اور وہ ایک کسوٹی ہے جس پر دستہ نصف سکی نے اس کے تینوں بیٹوں
کی فطرت کا امتحان لیا ہے۔ متیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا، دل کا
بہت اچھا مگر آوارہ اور شرابی ہے، اُسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں
ہو اور وہ شروع سے کھلم کھلا اپنے باپ کی جان لینے کی قسمیں کھاتا
رہتا ہے۔ اداں کرمازوف کا بھی خیال ہے کہ ایلے آدمی کو جینے۔ نیا ایک
جرم ہے، لیکن وہ اپنے خیال کو بے تکلف پن سے ظاہر نہیں کرتا، وہ متیا
کی طرح فضول خرچ نہیں ہے، اسے باپ سے روپے مانگنے کی ضرورت
نہیں ہوتی، اس لیے وہ اس مسئلہ پر خیر و شر کے بلند تر مسائل کی
تحت میں غور کرتا ہے۔ اس میں اتنا جوش نہیں ہے کہ اپنے خیالات پر
عمل کرنے کے لیے بے تاب ہو، مگر جیسا کہ آگے جل کر بیان ہوگا،
فیوڈور پافلوویچ کے حق میں اس کے خیالات متیا کے ارادوں سے

کچھ بہتر نہیں۔ ایوٹا اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے۔ وہ باپ سے
 لڑتا جھگڑتا نہیں، اس کی نسبت اچھے باپ کے خیالات نہیں رکھتا
 اور گو اُسے بھی باپ کی حرکتوں پر بہت صدمہ ہوتا ہے، وہ خاموشی
 سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ایک روز اچانک فیوڈور پافلودوچ اپنے
 کمرہ میں مرا ہوا پایا جاتا ہے اور حالات کچھ ایسے ہیں کہ متیا پر شبہ ہوتا
 ہے۔ متیا اس رات کو چھپ کر اس کے کمرے تک آیا تھا، لیکن اُسے
 یکبارگی خیال ہوا کہ میں اپنے باپ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ اُسے
 مار ڈالوں تو کوئی تعجب نہیں اور اس خیال نے اس کے دل میں اتنی
 وحشت پیدا کر دی کہ وہ بھاگ گیا۔ اُس کے لیے اپنی بے گناہی ثابت
 کرنا دشوار کیا ناممکن تھا، اور آخر میں اُسے سزا بھی ہو گئی، لیکن باپ
 کا قاتل وہ نہیں تھا بلکہ سمر جیا کوف، فیوڈور پافلودوچ کا حرامی لڑکا
 جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ جرم کی منطقی اور مجرم کی نیت کا ادا کرنا
 زون کے خیالات سے بہت گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ سارا کرما زون خاندان رہبان زوسیما کی کوٹھری میں
 جمع تھا۔ رہبان کو معلوم ہوا تھا کہ ادا نے کچھ عرصے پہلے ایک مضمون
 میں کلیسا اور ریاست کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال
 ظاہر کیا ہے کہ ”اگر انسان کی روح کو بقا نہیں ہو تو نیکی کا بھی حقیقت میں
 کوئی وجود نہیں“ یہ سن کر رہبان زوسیما نے کہا کہ ”اگر تمہارا یہی
 عقیدہ ہو تو تم یا تو بڑے خوش نصیب ہو یا پھر بہت بد نصیب ...“

تھارے دل میں ابھی اس مسئلے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور یہی باتیں سب سے زیادہ دکھ پہنچائے گی، کیونکہ تم کو ہر وقت خیال رہے گا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہیے، دراصل یہ مسئلہ ادا ان کو ہر لمحہ پیچ و تاب میں رکھتا ہے اور اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ روح کی بقا کا سوال اور بہت سے مسئلوں سے وابستہ ہے جو ادا ان کے دل اور دماغ کو مصروف رکھتے ہیں اور اُسے کسی عقیدے پر استقامت سے قائم رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ ادا ان کو اپنی عقل اور دانائی پر گھنڈا نہیں، وہ خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا، بلکہ شروع ہی سے اُسے تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ خدا کے وجود کی طرح تقدیر کی مصلحتوں کو سمجھنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ وہ یوم جزا کا معتقد ہے، اسے یقین ہے کہ اس روز انسان کے اعمال کا حساب ہوگا اور خدا کے عدل و انصاف اور اس کی رحمت کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بغاوت پر، یا جیسے کہ وہ خود کہتا ہے ”خدا کو ہنایت ادب کے ساتھ اپنے داخلے کا ٹکٹ واپس دے دینے پر“ مجبور پاتا ہے۔ اُسے منظور نہیں کہ انسانی اخلاق کو عذاب اور ثواب کے قانون پر منحصر کیا جائے، ثواب کی امید میں انسان سے بے شمار تکلیفیں اٹھانے اور دکھ پہننے کو کہا جائے اور پھر وہ گناہ کرے گا اُسے سزا دی جائے۔ لیکن یہ علت اور معلول کے نظریے سے ثابت کر دیا جائے کہ انسان خود اپنی مصیبت اور دکھ کا ذمہ دار ہوتا ہے،

مگر اس توضیح سے کسی کا دُکھ درد رتی برابر بھی کم نہیں ہوتا اور جس شخص کو دوسروں کے درد کا احساس ہو اور جو اس درد کو بالکل مٹانا چاہتا ہو، اُسے علمت و معلول کے نظریے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ اداں کو اپنے اعتراضات کا کہیں بھی خاطر خواہ جواب نہیں ملا ہے، پھر بھی وہ اس پر تیار ہے کہ اپنا دل مضبوط کر کے ان لوگوں کے دُکھ درد کو نظر انداز کرے جو سزا و جزا کے قانون سے واقف ہیں، جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں اور یوں سزا کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن اداں کہتا ہے کہ دنیا میں صرف سمجھدار لوگوں کو نہیں بلکہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بھی بے انتہا اذیتیں پہنچی ہیں۔ ان کا کوئی سبب نہیں اور انہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی جس کے دل میں ذرہ بھر محبت اور درد و حساس دنیا میں رہنا اور اس کے نظام کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ سب یکساں گنہگار ہوتے ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی مصیبتوں کا ان کے گناہوں سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن بچے تو مجرم اور گنہگار نہیں ہو سکتے اور اگر دراصل وہ بھی اپنے والدین کی بدکرداریوں میں شریک ہوتے ہیں تو جس منطق سے یہ شرکت ثابت کی جاتی ہے وہ اس دنیا کی منطق نہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس سے کچھ پہلے وہ کہ چکا ہے:

”اگر سب کو دُکھ سہنا اس وجہ سے لازمی ہے کہ پھر دائمی مسرت حاصل کر سکیں اور زندگی میں کامل ہم آہنگی قائم

ہو سکے تو پھر براہ کرم یہ تو بتاؤ کہ بچوں پر دکھ سہنا کیوں لازمی ہے؟“
 اور ان نے ادھر ادھر سے واقعات یہ دکھانے کے لیے جمع کیے ہیں کہ
 بچوں کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا جاتا ہے، وہ کس بے بسی سے خدا سے دعا
 مانگتے ہیں اور ان کے معصوم دلوں کو کیسے کیسے صدمے پہنچتے ہیں، ان
 کے دروسے اور ان کو اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ وہ روزِ جزا کو اس
 بصیرت کو، جو قیامت کے دن مشیت کے کل راز واضح کر دے گی اور
 ہر دل سے کدورت اور شکایت دھو ڈالے گی اور اس وعدے کو
 کہ دنیا میں جو بے گناہ دکھ ہے گا اسے جنت کی مسرت اجریں ملے گی
 اپنے دل کی تسلی کے لیے کافی نہیں پاتا۔ وہ کہتا ہے: ”میں تلافی چاہتا
 ہوں... قیامت کے روز نہیں، جو خدا جانے کب ہو گا اور کہاں
 بلکہ اسی دنیا میں اور ابھی، تاکہ میں اسے سمجھ سکوں، میری اپنی آنکھیں
 اُسے دیکھ سکیں...“ اس خوف میں کہ کہیں آخر کار قیامت کے روز
 پاک دلوں کی محبت کا جلوہ دیکھ کر وہ خود بھی خدا کی شان میں گیت
 گانے لگے، وہ کہتا ہے: ”جب تک موقع ہے میں اپنے آپ کو ہر طرف
 سے بنیاد و محفوظ کر لوں گا، اور تب کہہ دوں گا کہ مجھے بلند روحانی

لے عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دینِ عیسوی کی سچی پیروی کی جائے تو دنیا میں کامل
 ہم آہنگی قائم ہو جائے گی۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اُن نیک
 لوگوں کو جنہوں نے حق کے لیے اپنی ساری مصیبتیں صبر سے برداشت کی ہیں،
 خدا کی مشیت کے تمام راز معلوم ہو جائیں گے اس روز گو یا حق کی فرماں برداری ہوگی۔

ہم آہنگی کی حاجت نہیں۔ یہ بلند ہم آہنگی بہت گراں ہے۔ اگر یہ اُس...
 مظلوم بچے کے آنسوؤں کے مول ملی جس نے اپنی ننھی ننھی مٹمیاں سینے
 پر ماریں اور اس گندی کوٹھری میں ایسے آنسو بہا کر جن کا کسی نے بدلہ
 نہیں لیا اپنے ”پیارے اللہ میاں“ سے دعائیں مانگیں کہ مجھے مصیبت
 سے چھڑاؤ، بہت گراں ملی، کیونکہ بچی کے آنسوؤں کا کوئی بدلہ نہیں
 لیا گیا، اور ان کا بدلہ لینا لازمی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر ہم آہنگی
 بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا بدلہ لیا جائے تو کس صورت سے... کیا
 اس طرح سے کہ مجرموں کو سزا دی جائے؟ سزا دینے سے کیا فائدہ...
 دوزخ کے عذاب سے کیا کام چل سکتا ہے جب یہ بچے جتنا دکھ سہہ سکتے
 تھے سہہ چکے ہیں اور پھر یہ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روا مئی کیسی جس کے
 ساتھ ساتھ جہنم کا عذاب بھی ہے: میں تو چاہتا ہوں سب کی خطائیں
 معاف کرنا، سب کو محبت سے گلے لگانا، میں چاہتا ہوں دنیا سے
 دکھ کو مٹا دینا اور اگر بڑوں کے دکھ کے ساتھ بچوں کا دکھ بھی شامل
 کرنا ضروری ہے کہ حق کی پوری قیمت دی جاسکے تو میں پہلے ہی سے باور
 رکھے دیتا ہوں کہ حق کی ہرگز اتنی قیمت نہیں ہو سکتی... میں نہیں چاہتا
 ہم آہنگی اور حق کی فرماں روا مئی اور اس وجہ سے نہیں چاہتا کہ مجھے
 ملے اداں اس سے پہلے اسی تجھی کا قصہ سنا چکا ہے۔ بچو ناگند کرنے کی سزائیں
 ماں باپ نے سردی کے موسم میں اس کے کپڑے اتار کر اور اس کے چہرے پر
 گولیس گر پاجانے میں بند کر دیا اور خود جا کر چین سے سو رہے۔

انسان سے محبت ہے۔ میں حق کی حکمرانی نہیں تسلیم کروں گا، میں اس دکھ میں محو ہوں گا جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے۔ میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے اس دکھ پر جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے، اپنی شکایتوں اور شکایتوں کے پیدا کیے ہوئے غصے پر قائم رہوں۔ چاہے میں غلطی ہی پر کیوں نہ ہوں۔ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کی قیمت بہت اونچی لگائی ہے۔ میری جیب میں اتنے دام نہیں کہ داخلے کا ٹکٹ خرید سکوں۔ اس لیے میں داخلے کا ٹکٹ بلا تامل فوراً واپس کر دوں گا۔ اور اگر میں ایمان دار آدمی ہوں تو جس قدر جلد ممکن ہو مجھے ٹکٹ واپس کر دینا چاہیے۔ الیوشا، میں خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتا، صرف اپنا ٹکٹ نہایت ادب کے ساتھ واپس دے رہا ہوں۔“

ادان کی بغاوت اور اس کی شکایتوں پر اگر واقعی غور کیا جائے تو اس سکون اور اطمینان کو خیر باد کہنا ہوگا جو مذہب اور عقیدے کے ذریعے سے انسان حاصل کرتا ہے۔ الیوشا، ادان کا چھوٹا بھائی جس میں مذہب کا سچا جذبہ ہے اور جو دین عیسوی کا مخلص پیرو ہے اپنے پختہ عقیدے کے باوجود ادان کی کسی دلیل کو رد نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ آخر میں جب حضرت عیسیٰ کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے اور الیوشا حضرت عیسیٰ کے ایشارہ کو معصوموں کے درد کا کفارہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو ادان اسے ایک مضمون سناتا ہے جو اس نے کچھ عرصے پہلے لکھا تھا۔ اس مضمون کا

لے الگ سے نئی کمازوف، ادان کا جوٹا بھائی جو اس تقریر میں اس کا مخاطب ہے

عنوان ”اسقف اعظم“ ہے، اور اس میں رومن کیتھولک کلیسا کا ایک بڑا
 عہدے دار حضرت عیسیٰ کو، جو دوبارہ دنیا میں آئے ہیں، قید کر دیتا ہے
 اور قید خانے میں جا کر انھیں سمجھاتا ہے کہ اُس نے انھیں کس وجہ سے
 قید کیا ہے اور دوسرے روز زندہ جلا دینے کی سزا کیوں دے گا۔ یہ حق
 کسی شبہ میں نہیں ہے، اسے بالکل یقین ہے کہ اُس کا قیدی حضرت مسیح
 کے سوا اور کوئی نہیں، مگر اس کی وجہ سے وہ اپنے قیدی کو سزا دینے
 پر اور بھی تل جاتا ہے، اس لیے کہ اُسے دین عیسوی اور خود حضرت عیسیٰ کی
 ذات سے بہت شکایتیں ہیں۔ رات کو وہ اپنے قیدی حضرت عیسیٰ کے
 پاس جاتا ہے، انھیں وہ تین ترغیبیں یاد دلاتا ہے جن سے شیطان نے
 انھیں بہکانے کی کوشش کی تھی اور اس پر بہت لعنت ملامت کرتا
 ہے اس پورے مضمون کا ترجمہ رسالہ ”جامعہ“ بابت ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔
 لہ پہلی ترغیب یہ تھی کہ شیطان نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ ”ان پتھروں کو حکم دو
 کہ روٹی بن جائیں“ مگر حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ ”انسان صرف روٹی کے سہارے
 نہیں مہیا ہے۔“ تب شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک اونچے مینارے پر لے جا کر
 کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر تمھیں خدا پر بھروسہ ہے تو نیچے کو دوڑو حضرت عیسیٰ نے جواب
 دیا کہ خدا کی آزمائش کرتا منع ہے، آخر میں شیطان انھیں ایک اونچے پہاڑ کی
 چوٹی پر لے گیا اور کل روئے زمین کا منظر دکھا کر کہا کہ اگر تم میری پرستش
 کرنے پر راضی ہو جاؤ تو میں تمھیں ساری دنیا کا بادشاہ بنا دوں گا۔ حضرت عیسیٰ
 نے خفا ہو کر اُسے اپنے سامنے سے بھگا دیا۔

ہو کہ انہوں نے شیطان کا کہنا نہیں مانا۔ پہلی ترغیب یا دلا کر ہفت کہتا ہوں
 ”جتنے معلوم ہو کہ صدیاں گزرتی جائیں گی اور نوع انسانی اپنی عقل اور
 علم کے ذریعے سے اس کا اعلان کرے گی کہ انسان مجرم نہیں ہوتے اور
 ظاہر ہی گناہ گار بھی نہیں، صرف بھوک کے مارے ہوتے ہیں“ اور پھر اگر
 روحانی غذا کے نام سے تیرے ساتھ ہزار اور دس ہزار ہوں گے تو ان لاکھوں
 اور کروڑوں ہستیوں کا کیا انجام ہو گا جن میں اتنی قوت نہیں کہ روحانی
 غذا کی فکر میں اپنے پیٹ کی بھوک بھول جائیں۔ یا تجھے صرف تیرے ہزار
 دس ہزار بلند حوصلے اور قوی ارادے والے پیر وغیرہ تھے اور باقی،
 کروڑوں کروڑ بلکہ ساحل کی ریت کی طرح بے شمار انسانی ہستیاں جو
 کمزور ہیں مگر تجھ سے محبت رکھتی ہیں، صرف اس مصرف کی ہیں کہ تیرے
 بلند حوصلے اور مضبوط ارادے والوں کا تختہ مشق بنیں؟“ اسقف کا
 عقیدہ ہو کہ اگر حضرت عیسیٰ نے لوگوں کے پیٹ بھرنے کا ذمہ لیا ہوتا
 اور انہیں روحانی غذا پر پالنے کی فکر کرتے تو انہیں بہت کامیابی ہوتی اور
 انہوں نے نوع انسانی کی محبت کا دھوی ثابت کر دیا ہوتا۔ لیکن اگر
 انہیں یہ منظور نہیں تھا تو انہیں انسان کی رہبری کا وہ دوسرا طریقہ اختیار
 کرنا چاہیے تھا جس کی طرف شیطان نے اشارہ کیا تھا؛ یعنی معجزہ، اس
 لیے کہ غذا کے برابر اگر انسان کی کوئی ضرورت ہو تو یہ کہ اُس کے ضمیر کا
 لہ یعنی بچی روحانیت اور عقیدت جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں
 اشارہ کیا تھا کہ ”انسان روٹی کے سہارے نہیں جیتا“

کوئی محافظ بن جائے اور ضمیر کا محافظ وہ اسی کو بنائے گا جو معجزے کے ذریعے سے اس کے ذہن پر جادو کر دے۔ اسقف حضرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے ”کیا تو بھول گیا تھا کہ انسان چین آرام کو، بلکہ موت کو بھی اس پیچ و تاب سے زیادہ قابلِ برداشت سمجھتا ہے جس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی ضرورت داری اسے مبتلا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی آزادی کی انسان کو بہت ہوس ہونی ہے، لیکن یہ آزادی اس کی سب سے بڑی مصیبت بھی ہو جاتی ہے۔ ۱۰۰ دنیا میں تین قوتیں ہیں، صرف تین، جو ہمیشہ کے لیے ان کمزور باغیوں کے ضمیر کو قابو میں لاسکتی ہیں اور اسے فریفتہ کر کے ان لوگوں کی مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور یہ تین قوتیں ہیں معجزہ، مذہبی اسرار اور اقتدار۔ تو نے پہلے دوسرے اور تیسرے سب سے انکار کر دیا، اور اپنی ذات کو اس انکار کی ایک مثال بنا دیا۔۔۔ تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کرتے ہوئے انسان اپنی عقیدت کے استحکام کے لیے خدا کی ذات کو کافی سمجھے گا اور اسے معجزہ کی حاجت نہیں ہوگی۔ لیکن کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جہاں انسان نے معجزے سے بے نیازی ظاہر کی وہ خدا سے بھی بھر گیا، کیونکہ انسان کو حق کی اس قدر تلاش نہیں ہوتی جتنی معجزے کی۔۔۔ ہم نے تیری تحریک کی اصلاح کر کے اسے معجزے، مذہبی اسرار اور اقتدار پر قائم کر دیا اور ان لوگوں کو اس پر بہت خوشی ہوئی۔۔۔“

عام انسان کے اور اس شخص کے نقطہ نظر سے جو عام انسانی فطرت

کو سمجھتا ہے آئین عیسوی پر اس سے زیادہ بھاری اعتراضات نہیں کیے جاسکتے جو اس وقت اعظم نے اپنے قیدی کو سنائے اور ان اعتراضات کو اگر ان دلیلوں میں شامل کر دیا جائے جن کی بنا پر ادا ان نے کائنات اور زندگی کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا تو عقیدت اور مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ادا ان خود تسلیم کرتا ہے: "باغی ہو کر جیسا شکل ہی اور میں جیسا چاہتا ہوں" اس سے کچھ پہلے وہ کہ چکا ہے: "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ ہوں، خواہ یہ میری منطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ میں کائنات کے نظام کو درست نہیں مانتا تو کیا حرج ہے، مجھے وہ کوپل تو عزیز ہے جو بہار میں پھوٹ نکلتی ہے۔ مجھے اس نیلے آسمان سے تو محبت ہے، میری سرشت میں وہ چیز ہے جو کبھی کبھی کسی سے خاص شخص لگاؤ پیدا کر دیتی ہے اور معلوم نہیں ہوتا کیوں، میں انسان کی بعض کوششوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جن کے مطلب اور مقصد سے زمانہ بڑا مجھے کوئی عقیدت نہیں رہی ۱۰۰۰ اس میں عقل اور منطق کو دخل نہیں، اس محبت میں انسان کی کل ہستی شامل ہوتی ہے یا یہاں تک کہ اس کا معرہ اور آنتیں بھی، یہ محبت گویا نئی نئی حاصل کی ہوئی قوت کا جوش ہے، ادا ان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ یہ نہیں طو کہ پاتا کہ زندہ رہنے کی خواہش زیادہ بڑی ہونی چاہیے یا زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے کی اور چونکہ اس کی طبیعت غور و فکر کی طرف زیادہ مائل ہے، اس کشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی "بغاوت" کے باوجود زندہ رہنا کینہ بن قرار دیتا ہے اور مذہب

اخلاق سے اس قدر بد دل ہو جاتا ہے کہ عملی زندگی میں ان محذووش اصولوں کو اپنا معیار بناتا ہے کہ ”سب کچھ جائز ہے“ اور ”ہر شخص جس بات کی چاہے خواہش کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دوسرے کی موت کی بھی۔“ اس معیار کے مطابق خاندانی معاملات کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ ”دو درندے ایک ایک دوسرے کو بھاڑ کھائیں گے“ اور اپنے بڑے بھائی اور باپ کی جانی دشمنی رفع کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ سمر جیا کوف نے جو اس کے باپ کے قتل کی فکر میں تھا، اس کی بے پروائی اور بے تعلقی دیکھ کر اسے مشورہ دیا کہ چند روز کے لیے پاس کے ایک گاؤں چرماش نیا چلے جاؤ۔ اس خیال سے کہ اگر ادا ان اپنے باپ کا قتل نہیں چاہتا ہے تو وہ یہ مشورہ منظور نہیں کرے گا، کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ تین چار روز کے اندر کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ ادا ان چرماش نیا کے بجائے ماسکو چلا گیا، وہاں جب اسے خبر ملی کہ اس کا باپ مار ڈالا گیا ہے اور اس کے بڑے بھائی پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے تو وہ فوراً واپس آیا۔ پہلے اسے یقین تھا کہ باپ کو اس کے بڑے بھائی نے مارا ہے، لیکن سمر جیا کوف سے تین چار مرتبہ گفتگو کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اصل مجرم وہ خود ہے، کیوں کہ اس کا ماسکو چلا جانا سمر جیا کوف کے لیے گویا قتل کی اجازت تھی۔ ادا ان نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ ”دو درندے ایک دوسرے کو بھاڑ کھائیں گے“ لیکن جب اس کا اپنے اصول کے نتائج سے سامنا ہوا اور سمر جیا کوف نے اسے یقین دلادیا کہ جرم میں بڑی حد تک آپ بھی

شرکیاب ہیں تو ادا ان کو بہت سخت صدمہ ہوا اور اس صدمے نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ یہ ہوا انجام اس کی "بغاوت" کا۔

امان کا چھوٹا بھائی الیوشا اپنے دل میں اسی قدر درد اور انسانی ہمدردی رکھتا ہے جتنی ادا ان، مگر اُس کی شخصیت بغاوت کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عملی زندگی میں شرکت کرنے سے انکار نہیں کرتی، اس وجہ سے کہ درد اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ہی الیوشا کی طبیعت میں محبت اور ایثار کا ایک قوی جذبہ ہے جو اُسے دوسروں کی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے اور دوسروں کی خدمت کرنے سے اور ان کے دلوں میں محبت کے بیج پونے سے اُسے ایسی تسلی اور تسکین حاصل ہوتی ہے، اپنے عقیدے کی سچائی کے اُسے ایسے کھلے ثبوت ملنے رہتے ہیں کہ شک اور انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ دل کی وہ خاص بھلائی، پرانے دکھ کی داستان سُن کر بے چین ہو جانے اور تڑپ اُٹھنے کی وہ پیاری صفت جس نے نواب میٹیکن کو سیانے سے دیوانہ بنا دیا تھا، اُس کی سرشت میں بھی موجود ہے، مگر ایک شدید مذہبیت کے بھیس میں، جو اسے ان اوصاف کے خطرناک پہلو سے محفوظ رکھتی ہے اور اس کی شخصیت کے لیے ایک مضبوط سہارا بن جاتی ہے۔ الیوشا عیسائی ہے، بہت سچا عیسائی، جس کے نہ دل میں کزدی ہے نہ عقیدے میں وہ آئین عیسوی کا پیرو بھی ہے اور شیدائی بھی اور اسے خاص تقویت اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ اس کی عقل مشکوک

اور نکتہ چیں نہیں ہے۔ اس کی شخصیت نواب میسکن کی طرح جادو کرنا نہیں جانتی، لیکن نواب میسکن کے مقابلے میں بہت زیادہ محکم اور مضبوط ہے۔ الیوٹا روسی قوم، روسی مذہب اور مذہبیت کی اعلیٰ ترین پیدار ہے اور اسے اپنی سر زمین اور ماحول سے بہت گہرا اور سچا لگاؤ ہے، اس کی سیرت اور وہ اصول جن پر وہ تعمیر کی گئی ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دستہ لف سکی بغاوت، انکار اور شک کے تمام مراحل طو کر کے منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔ اثبات خودی، غرور اور سرد مہری جو اثبات خودی کا لازمی نتیجہ بنتی ہے، انسانی شخصیت کو کامل نہیں بنا سکتی شخصیت کو فروغ صرف ایثار کے دم سے ہوتا ہے، لیکن اگر اس ایثار کے ساتھ دل میں قوت برداشت نہ ہو تو کوئی شخصیت اس درد کی تاب نہ لا سکے گی جو زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ہر نیک دل میں اٹھتا ہے اور وہ اس اختیار کے ہاتھوں شکست کھائے گی جو ہر انسان کو اپنے دکھ اور سکھ کی فکر کرنے کے لیے ازل سے ملا ہے۔ ایثار کی راہ پر بھی انسانی شخصیت صرف اپنے بل بوتے پر نہیں چل سکتی، اسے مدد اور تقویت کی حاجت رہتی ہے اور یہ اسے صرف مذہب سے اور مذہبی رہنماؤں کے ایثار کی مثالوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دستہ لف سکی "برادران کرماتوف" کی داستان ختم نہ کر سکا اور اسے الیوٹا کی شخصیت کی پوری شان دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں الیوٹا نے ایسے انداز سے میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے، ایسے شوق اور عقیدت سے اپنا پیغام سناتا اور محبت اور ایثار کا بیج بونا شروع

کیا ہے کہ وہ ضرور ایک روز کامیاب ہوگا۔ ایوٹا کی کامیابی اور اس کی شخصیت کا کامل بن جانا محض دین صیوی کے برحق ہونے کا ثبوت نہیں بلکہ ہر مذہب، ہر جماعت کے لوگوں کے لیے ایک نمونہ، ایک روشن مثال ہے۔ کیونکہ ہر جگہ آسمان وہی ہے زمین وہی، دل وہی اور درد وہی۔ اصل مشکل یہ خدمت کا حوصلہ پیدا کرنا، اس حوصلے میں محو ہو جانا، خودی کو بے خودی میں ڈھونڈنا اور پانا۔

دو ایک مضحک آدمی کا خواب ”دستہ لف سکی کا ایک مختصر اور عجیب سا افسانہ ہے جس میں اس کا خاص فلسفہ حیات بہت اچھی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو خود کشی کرنے والا ہے خواب دیکھتا ہے کہ وہ ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے باشندے بالکل معصوم تھے اور ان کے دل ایسے پاک تھے کہ انھیں یہ شخص جس کا دنیا میں ہر وقت بڑی بے دردی سے مضحکہ اڑایا جاتا تھا کسی طرح مذاق اور تضحیک کا سزاوار نہیں معلوم ہوا۔ اپنا تعجب اور خوشی اور ان لوگوں کی انتہائی نیکی اور خوش اخلاقی ظاہر کرنے کی غرض سے اس شخص نے ان لوگوں کو اس دنیا کا سارا حال سنا یا جس میں پیدا ہوا تھا اور اپنے دل کی ساری شکایتیں بیان کر دیں۔ مگر اسے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ افسوس کرنے کے بجائے دنیا والوں پر رشک کرنے لگے، گناہوں کا مزا بچھنے کے لیے انھوں نے معصومیت کو خیر باد کہی، رفتہ رفتہ وہ تمام برائیاں جن کی انھیں خبر ملی تھی اختیار کر لیں، منہ زندگی کو درہم برہم کر دیا اور اپنے آپ کو طرح طرح کی مصیبتوں

میں مبتلا کر دیا۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر مضحک آدمی اپنی حرکت پر بہت تادم ہلکا اور گویا یہ لوگ بھی اس پر ہنسنے اور اس کی تنقیر کرنے لگے تھے اس نے تہیہ کیا کہ میں اپنی غلطی کے کفارے میں اپنی زندگی ان لوگوں کی خدمت اور ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں صرف کروں گا۔ اس افسانے میں دستہ لغت سکی نے جبر و اختیار کے مسئلے کو بھر چھڑا ہی اور یہ دکھایا کہ انسان کے دل میں تجربے اور علم کا پھل چکنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے یہ بتا دینا کافی نہیں ہے کہ اس کا نفع کن باتوں میں ہے اور نقصان کن باتوں میں اور اسے صحیح مسرت اور نجات حاصل کرنے کے لیے کون سا مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ انسان بُرے اعمال کے نتائج سے ڈرتا بھی ہو تو ان سے باز نہیں آتا، کیونکہ اسے زندگی کا مزہ اسی میں ملتا ہے کہ جو اس کا جی چاہے وہی کرے، ہر شخص کے سامنے نیکی اور سلامت روی کی ہزاروں مثالیں موجود ہوتی ہیں، ہر شخص یہ بھی دیکھتا ہے کہ خود رائی اور بے اعتدالی کی نذر کبھی نہ کبھی ضرور ملتی ہے، پھر بھی راہِ راست پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور دنیا دہن کا نمونہ بنی رہتی ہے۔ نوع انسانی کے رہنماؤں کو صدیوں پہنچے ہیں اور ان کی تعلیم بے اثر رہی ہے تو اسی وجہ سے کہ انسان اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے، اپنے سے زیادہ سمجھ دار لوگوں کی نصیحت کا کیا ذکر ہے اسے خود اپنی عقل کی ہدایت پر عمل کرنا ناگوار ہوتا ہے جب تک اسے راست روی میں وہی مزہ نہ ملے جو اپنی مرضی پر چلنے میں

ملتا ہی عقل پرست لوگ مذہب کے غیر عقلی پہلو پر بہت اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن مذہب کی بنیاد جذبات پر رکھنے اور نیک جذبے کو صحیح رائے پر ترجیح دینے میں بڑی مصلحت ہی، کیونکہ اس سے بہت روی میں ایک خاص کشش اور نیک زندگی میں ایک قوت پیدا ہو جاتی کہ

دستہ لف سکی کے نادلوں پر جو مختصر اور نامکمل بحث یہاں کی گئی ہے اس سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ علم، اخلاق، فلسفے اور مذہب کے نقطہ نظر سے وہ کس قدر بلند پایہ اور بیش بہا تصانیف ہیں۔ وہ محض قصے کہانیاں نہیں ہیں، محض انسانی زندگی کی حقیقت عیاں تصویریں نہیں ہیں ان کا شمار دراصل ان الہامی کتابوں میں ہونا چاہیے جنہوں نے ایک قوم کے جان بہ لب عقیدوں اور حوصلوں میں جان ڈال کر ویرانوں کو آباد کیا ہے اور ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے۔ ایک انگریزی نقاد کا خیال ہے کہ ”دستہ لف سکی نے فن ناول نویسی کا خاتمہ کر دیا“ اور یہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ دستہ لف سکی نے اپنے نادلوں میں جو مقاصد پیش نظر رکھے ان سے بڑھ کر حوصلہ کرنا ناول نویس کے لیے ممکن نہیں۔ اس نے ایک فن کو جو ہمیشہ سے دلچسپی فراہم کرنے کے لیے وقف رہا تھا حق کا پیغام بربنایا اور آرٹ اور مذہب کو اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دستہ لف کے پلاٹ سب اچھے ہوئے ہیں، سیدھا سادہ قصہ سننے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔

اکثر جگہ اس نے معمولی باتوں کو جو ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہیں بہت بے جا طوالت دے دی ہے اور اس کی زبان میں ایک ہذیانی کیفیت ہے جو ان موقعوں پر نہایت ناگوار ہوتی ہے جہاں وہ موضوع کے لحاظ سے ضروری اور موزوں نہیں۔ خالص ادبی خوبیوں کا اس کے یہاں نام تک نہیں۔ اس کی کل تصانیف میں شاید ہی دو چار جملے ایسے ملیں جو سچیدہ نہیں ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں اس نے عام طور سے فصاحت کا خون کیا ہے۔ تو رکیف کی طرح وہ کسی کی سیرت یا صورت اس طرح نہیں بیان کر سکتا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، اس نے گو گول کی طرح اپنے ناولوں اور ان کے اشخاص کو قومی رنگ میں نہیں رنگا ہے۔ لیکن دستِ لُف سکی کا ایک ناول پڑھنے کے بعد ان دونوں کے ادبی کمالات نظر سے گری جاتے ہیں، ”وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے جسے ادبی کمالات کا دماغ نہیں۔“ ادبی دنیا میں اگر کوئی اس کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے تو تاستائی، اور تاستائی کو بڑے سے بڑے ناول نویس استاد مانتے ہیں۔ لیکن تاستائی میں وہ سوز، وہ درد، وہ تڑپ نہیں ہے جو دستِ لُف سکی کے دل میں تھی، اس کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں وہ پہچان نہیں آتا جو دستِ لُف سکی کے ناول پیدا کر دیتے ہیں، وہ طوفان برپا نہیں ہوتا جس سے پُرانی دنیا بگڑتی اور نئی دنیا بنتی ہے۔

چھٹا باب

میخائل یف گرافوچ سالتی کوف

میخائل یف گرافوچ سالتی کوف (۱۸۲۶-۱۸۸۹) جو شچدرن کے نام سے بھی مشہور ہے، تور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا پہلا استاد پادری نامی ایک غلام کسان تھا جسے فن مصوری میں خاصا ملکہ تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سالتی کوف نسار کو یے سیلو کے کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنا پہلا ناول ”ایک جھمیلا“ لکھا۔ سیاسی حاکموں کو اس ناول میں بہت سی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوئیں اور اس کا نوجوان مصنف جلا وطن کر کے شہر ویاتکا کو بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ سات سال تک رہا مگر وہاں ہی پراسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ ملازمت میں اس نے خاصی ترقی کی اور ایک صوبے کا گورنر بھی مقرر ہوا، لیکن اس کی طبیعت ملازمت کے لیے بالکل ناموزوں تھی اور ۱۸۶۸ میں وہ اس سے پیچھا چھڑا کر انشا پردازی میں مصروف

ہو گیا۔ پہلے وہ اخبار ”ہم عصر“ کا مددگار ایڈیٹر ہوا اور جب وہ بلند کرا دیا گیا تو شاعر نکر اسوف کے ساتھ اخبار ”سرگزشت وطن“ کی ادارت میں شریک ہو گیا۔ عمر کے آخری سالوں میں اسے ایک سخت بیماری ہو گئی جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی، مگر اس زمانے میں بھی اس نے اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ دو یا تھک سے واپس ہوتے ہی اُس نے افانوں کا ایک مجموعہ شایع کیا جس کا عنوان ”مفصلات کے مرقعہ“ تھا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کا ناول ”حضرات گولوف لیف“ چھپا جو اُس کی بہترین تصنیف مانی جاتی ہے۔ ”تاشکنت والے“ بڑے دن کی کہانیاں ایک شہر کی تاریخ ”مفصلات سے خطوط“ ہمارے زمانے کی شکل ”ذخیرہ اور افانے میں جوہما دور میں لکھے گئے۔ ۱۸۸۱ء کے بعد کی تصانیف ”بڑے دن کی کہانیاں“ اور ”پوشے خونک کی تاریخ“ ہیں۔ یہ تاریخ اس کی آخری ادبی کارگزاری سالتی کوف کے پہلے ناول ”جھیلے کو معض مشق سمجھنا چاہیے۔ اس وقت اسے زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس کے ذہنی قوی بھی پوری نشوونما نہیں پاسکے تھے۔ جلاوطنی میں اسے روسی زندگی کے مشاہدے کا بہت موقع ملا، اس کی سیرت بھی اس عرصے میں پختہ ہو گئی اور جب اس نے پیربرگ واپس جا کر پھر قلم اٹھایا تو وہ اپنا کمال دکھاسکا۔ روسی ناول نویسوں اور انشا پردازوں میں جس کسی کا بھی سرکاری ملازموں سے سابقہ رہا اس نے اپنے آپ کو اُن کی سیرت اور ذہنیت کا خاکہ اُتارنے پر

محبور پایا اور سالتی کوف کے پہلے افسانوں کا موضوع انھیں لوگوں کی زندگی تھی۔ اس کی طبیعت طنز کی طرف مائل تھی، لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے افسانے پڑھ کر سنیں اور پھر انھیں بھول جائیں۔ اس کے طنز اور تضحیک میں ایک زہر تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ زہر ان لوگوں اور اس ذہنیت کے لیے مہلک ثابت ہو جس کا اس کے افسانوں میں ذکر ہو اور سب کے دلوں میں نفرت کا وہی جذبہ پیدا ہو جائے جو اس کے اپنے دل میں تھا۔ مفصلات کے مرقعے جب شایع ہوئے تو اصلاحی تحریک بہت زور پر تھی، ان افسانوں نے اور بھی اُدھم مچا دی اور اصلاح کے حامیوں کا ایک زبردست ہتھیار بن گئے۔ ۱۸۶۴ میں وہ انتظامی اصلاحیں جن کے لیے کوشش کی جا رہی تھی ایک حد تک ریاست کی طرف سے منظور ہو گئیں، ۱۸۶۱ میں کسان آزاد کر دیئے گئے تھے اور ان دونوں اصلاحوں نے روسی زندگی کا رنگ بدل دیا۔ سالتی کوف کے افسانوں کا وہ سلسلہ جو ۱۸۶۱ سے شروع ہوا جرمانی زندگی کے باقی ماندہ آثار اور ان حالات کا نقشہ کھینچتا ہے جو نظام کے تغیرات پیدا کیے تھے۔ مفصلات کے مرقعوں کی طرح ان میں بھی وہ نصف بن کر بیٹھتا ہے، طرح طرح کے لوگوں کو اپنے سامنے بلا کر ناظرین کو ان کے اعمال نامے سنا رہا ہے اور ان کو طنز اور تضحیک کے کوڑے لگاتا ہے۔ مختلف افسانوں میں مختلف جرموں کا پردہ چاک کیا جاتا ہے۔

ایک شہر کی تاریخ میں روس کی اصلاحی کوششوں اور ان کے انجام کا مضحک پہلو دکھایا گیا ہے۔ پتیر برگ کے دوران قیام میں مفصلات کے رہنے والے کارڈوناچچہ وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے جو روس کی نئی معاشرت ایک قدامت پسند زمیندار کے دل میں پیدا کرتی ہے۔ یہ بزرگ ایک بار ٹھیکڑ جاتے ہیں اور وہاں ایک خوبصورت ایکسٹرس کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنی بکسی پرافسوس آتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ قرب و جوار کی ہر عورت کی نسبت کہہ سکتے تھے کہ ”وہ میری ملکیت ہے“ میں اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں، کل یا ابھی فوراً، میں جا ہوں تو اس کے بال کٹوا ڈالوں“ جا ہوں تو اپنے چرواہے ان تپ سے اس کا نکاح کرادوں“ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حکومت کے دن ختم ہو گئے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں ”افسوس! اب ہم کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چاہے وہ مرغی ہی کیوں نہ ہو“! ان آثارِ قدیمہ کے ساتھ ہی سالتی کوف نے ان لوگوں کے بھی مثالی نمونے لیے ہیں جو عہدِ تغیر کے خاص مظاہر تھے اور معاشرتی تبدیلیوں سے بہت جا اور بے جا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس قسم کے لوگ زیادہ تر تاجر، ٹھیکے دار، کارخانے دار وغیرہ تھے اور سالتی کوف نے ان کی بے ایمانیاں، ان کا کینہ پن، ان کے ذلیل چال چلن اور ان کی بد اعمالیاں سب صاف صاف دکھائی ہیں اور اس طرح کہ ان کی حمایت یا صفائی میں کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ان لوگوں سے بھی زیادہ سالتی کوف کو ان تھوڑی بہت تعلیم

تھوڑی بہت سمجھ والے آدمیوں سے عداوت ہو جو بطیف اور اعلیٰ حوصلوں کو اپنے حیوانی سکون اور ادنیٰ نفسانی لذتوں پر قربان کرتے ہیں، جو بے انتہا بزدل ہوتے ہیں، مگر ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کی مخالفت پر فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں جن سے ان کے سکون اور لطیف اندوزی میں ذرا بھی خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہو اور جو اپنی مخالفت میں کسی کمینی حرکت یا جرم سے پرہیز نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے روس کی نفا بہت موزوں تھی اور روس کا کوئی خطہ اس آخر سے پاک نہیں تھا۔ سالتی کوف نے ان لوگوں کا خاکہ اُتارنے میں بڑا کمال دکھایا ہے اور اس کے طنز اور تضحیک کا زہر اور کسی کے لیے بھی ایسا قاتل نہیں معلوم ہوتا جتنا اس قسم کے لوگوں کے لیے۔

۱۸۶۷ء کے بعد سالتی کوف نے جو افسانے لکھے ان کا موضوع اس کے اپنے طبقے کے لوگ اور ان میں بھی خاص طور سے وہ حضرات تھے جو جدتوں کے بہت زیادہ دلدادہ تھے اور جنہوں نے ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۴ء کی اصلاحوں کی بنا پر ایک بالکل ہی نئی دنیا بنا کر کھڑی کر دینے کے منصوبے باندھے تھے۔ ان تصانیف میں سالتی کوف کا مقصد طنز اور تضحیک نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ اور وہ سوسائٹی جس کی تصویر اتاری جا رہی ہے دنیا میں صرف چند روز کی جہان ہے اور وہ ان بیماریوں میں مبتلا ہو چکی ہے جو موت کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی سلسلے کا ایک ناول ”حضرات گولوف لیف“ سالتی کوف کی بہترین تصنیف ہے اور اس کا

زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا ضروری ہے۔

”حضرات گولون لیف“ ۱۸۶۱ء سے پہلے کے زمینداروں کے ایک خاندان کا قصہ ہے۔ جس وقت داستان شروع ہوتی ہے، اس خاندان کے بزرگ ولایچرمیخائلو و پچ گولون لیف بوڑھے اور مضمحل ہو چکے ہیں، دن رات پلنگ پر پڑے رہتے ہیں اور صرف کبھی کبھی جب جوش آتا ہے تو دل کی کدورت نکالنے کے لیے اپنی بیوی کے کمرے تک لڑکھڑاتے ہوئے جاتے ہیں، اس کے دروازے سے ذرا سر نکال کر زور سے چڑیل یا ”بھتنی“ کہہ کر پکارتے ہیں اور پھر بھاگ کر اپنے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی بیوی ایرینا پترو فنانا دیوانی حرکتوں کی عادی ہے۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی اسے اپنے شوہر کی سیرت کا پتہ چل گیا تھا اور تب ہی سے وہ اپنے شوہر کو جائداد اور گھر گریستی کے معاملات سے بے دخل کر کے خود حاکم اور قادر کل بن بیٹھی تھی۔ ولایچرمیخائلو و پچ کو جو اپاہج اور کمزور طبیعت کے آدمی تھے مطلق کوئی شکایت نہ ہوتی اگر ایرینا پترو فنانا صرف حکومت پر قناعت کی ہوتی۔ مگر ایرینا پترو فنانا ان کی شراب اور تمباکو بھی بند کر دی۔ اور کفایت شعاری کو اس حد تک پہنچا دیا کہ گھر میں کسی کو کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا وہ بھی ایسا کہ کوئی بھلا مانس اسے رغبت سے نہ کھا سکے۔ اس نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا۔ خاندانی جائداد جو پہلے بہت حقیر تھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور وہ چند ہزار کسانوں کی مالک بن گئی،

مگر یہ دولت بہت گراں ملی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ارینا پتروفنا نے محبت اور سلوک کرنا ایسا چھوڑا کہ اس کا نام تک بھول گئی۔ ولایت میرخانلو دیر تو اسے چڑیل اور مہنتی کہتے ہی تھے، اس کے بچوں کو بھی اس سے کوئی محبت نہیں ہوئی۔ دنیا میں کوئی شخص نہیں تھا جس پر اُس نے کوئی احسان کیا ہو، چھوٹے بڑے لوگوں میں کسی سے اس کے مراسم نہیں تھے اور اس کے ہمارے سب جانتے تھے کہ وہ اسی کی منتظر بیٹھی رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی مالی دشواریوں یا اور کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو وہ ان کی جائداد ادا کرنے پر تیار ہو جائے۔ اگر ارینا پتروفنا کے دل کو انسانی ہمدردی یا محبت چھو بھی گئی ہوتی تو وہ محسوس کرتی کہ اس نے اپنے اصولوں پر چل کر کیا کھویا اور کیا پایا ہے، لیکن اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کا بڑا لڑکا ستیپان کہیں بھڑا سے گالیاں دیتا رہا اور اگرچہ گھر میں سب جانتے تھے کہ وہ بہت نیک اور بامروت ہے، ارینا پتروفنا نے طو کر لیا کہ وہ باپ کی طرح دیوانہ اور احسان فراموش ہے اور خود بھی اس کے نام دھرنے لگی۔ جب وہ تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں ماسکو اور پیتر برگ گیا اور چار سال تک کوشش کرنے کے باوجود ناکامیاب رہا تو ارینا پتروفنا نے سمجھ لیا کہ یہ محض اس کی نالائقی ہے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی ناکامیابی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور پرسان حال نہیں، کیوں کہ گورنر لیف خاندان کو یا تو کوئی جانتا نہیں تھا یا جو جانتا تھا وہ اس

نفرت کرتا تھا۔ ارینا پتر و فنا کو بیٹے سے زیادہ اپنے روپے اور جائیداد کی فکر تھی اور جائیداد محفوظ رکھنے کے لیے اس نے حق اور محبت کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ جب ستپان نوکری کی تلاش میں نکلا تو اس نے اس کے لیے ماہوار حیب خرچ مقرر کر دیا، مگر اتنا کم کہ اس پر گزر کر نامی تھا۔ اس کی ناکامیابی کی خبر سن کر ارینا پتر و فنا نے اسے ایک مکان جو اس نے ماسکو میں خریدا تھا دے دیا اور حکم دیا کہ اس کے کرایے پر گزر کر وہ۔ لیکن ستپان گھر پر اس طرح قید رہا تھا کہ آزاد ہو کر وہ اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکا اور آخر کار اسے اپنا قرضہ ادا کرنے کے لیے مکان بیچ دینا پڑا۔ اس کے بعد گھر واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو ارینا پتر و فنا نے اسے رہنے کو ایک کمرہ تو دیدیا، مگر اس میں رات کو روشنی کرانا یا سردی کم کرنے کو آگ جلوانا ضروری نہیں سمجھا اور نیز پر سے جو کچھ بچ رہتا وہی کھانے کو بھجا دیتی۔ اس تواضع کا انجام یہ ہوا کہ ستپان جسے پہلے سے دق کی بیماری تھی، چند مہینے کے اندر مر گیا۔ اس کی موت بھی ارینا پتر و فنا کو ایک خلاف عقل حرکت معلوم ہوئی، گو اس نے اکثر اسے کھانستے سنا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس پہننے اوڑھنے کا سامان کافی نہیں۔ ارینا پتر و فنا کی لڑکی آنتانے بھی اسے ستپان کی طرح ”مایوس“ کیا۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے اس کو انتظامی معاملات میں اپنا مددگار بنانا چاہا۔ لیکن اس سے نہ خاندانی رواج کے مطابق بھولے رہا گیا نہ گھر کی

بے لطف اور بے رونق زندگی برداشت ہو سکی اور وہ ایک ادنیٰ فوجی افسر کے ساتھ بھاگ گئی۔ ارینا پتر و فنا نے اسے ”ماں کی دعا کے خیر“ سے محروم رکھا، مگر اپنی نیکی اور حق پرستی جتانے کے لیے اسے ایک ٹوٹا پوٹا مکان اور تھوڑی سی زمین دے دی۔ تین چار سال بعد وہ دو لڑکیاں لیو با اور آئنہ چھوڑ کر مر گئی۔ ارینا پتر و فنا نے ٹھنڈی سانس مہر کر کہا: ”خدا کے کرم کی کوئی انتہا نہیں۔۔۔۔۔ ایک لڑکی چھین لی اور دو دے دیں“ اور وہ شکایت کیوں نہ کرتی بچوں کی پرورش سے انکار کرنے کی اجازت اُسے نہ اُس کے اصول دیتے تھے نہ نیک نامی کا خیال۔

ستپان اور آئنہ کے علاوہ ارینا پتر و فنا کے دو لڑکے اور تھے، پوزیری اور پاول۔ پاول کی طبیعت پر جمود اس قدر حاوی تھا کہ اس کے لیے بات کرنا بھی ایک دقت طلب کام تھا اور اس کی عمر کھانے پینے اور خاموش بیٹھ رہنے میں گزرتی تھی۔ مگر پوزیری ہر اعتبار سے اپنی ماں کا بیٹا تھا۔ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ ارینا پتر و فنا سے کچھ کم نہ تھا اور بچپن سے عجز و انکسار کا مجسمہ بن کر ماں کی خوشامد کرنا، دل کی بات چھپانا اور ہر وقت ماں کا حکم بجالانے پر مستعد رہنا اس کا قاعدہ تھا۔ ارینا پتر و فنا کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ پوزیری کی اطاعت گزاری خوشامد اور محبت محض دکھاوا ہی، مگر پوزیری نے اسے کبھی کسی معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کے برخلاف پاول نے کبھی اسے کسی بات سے خوش نہیں کیا بلکہ ہر وقت یہ ظاہر

کرتا رہا کہ اسے ماں سے گہری دلی نفرت ہے۔ اس برتاؤ کے باوجود ارینا پترو فٹا کو پاؤل سے زیادہ لگاؤ تھا، لیکن جب کبھی لڑکوں کو کچھ دینے کا موقع آتا تو وہ پور فیری کو اوروں سے زیادہ دینے پر مجبور ہو جاتی۔ چنانچہ آخر میں جب جائداد کا بٹوارا ہوا تب بھی پور فیری کو اپنے بھائی سے بہت بہتر حصہ ملا۔

پور فیری کو اس کے بھائی بہن بچپن سے ”سود خوار“ اور ”چونک“ کہتے چلے آئے تھے اور ارینا پترو فٹا کو بڑھاپے میں جائداد تقسیم کرنے کے بعد معلوم ہو گیا کہ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے باتیں کرنے کا شوق ہے اور اس سے بھی زیادہ باتیں بنانے کا اور گو وہ ہر وقت شان دار اصطلاحیں استعمال کرتا ہے وہ اپنے فائدے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا اور اس کی ہوس اتنی شدید ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنا حق چھوڑنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے جب جائداد کے بٹوارے کے کئی سال بعد پاؤل بیمار پڑا تو ارینا پترو فٹا اس کے یہاں گئی اور یاد جو دیکہ وہ اس کے منہ پر اسے اور پور فیری کو لگایاں دیتا تھا، وہ اس کی تیمارداری کرتی رہی اور اس کی جان بچے بچے دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن پاؤل مر گیا اور جس بھرتی سے پور فیری بھائی کے قریب مرگ ہونے کی خبر سن کر اس کے مکان پر پہنچا جس انداز سے اس نے بھائی کی موت پر ہر چیز کا جائزہ لیا اور اس گاڑی کی نسبت جس پر ارینا پترو فٹا دہاں

آئی تھی اور جو اس کی ذاتی ملکیت تھی کئی بار اس سے اور دوسروں سے دریافت کیا کہ وہ حقیقت کس کی ہے، اس اندیشے میں کہ وہ کہیں پاول کی نہ ہو اور ارینا پتروفنا اس پر ناجائز قبضہ نہ کر لے، ان سب باتوں سے ارینا پتروفنا کے دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ جب وہ پاول کی تجہیز و تکفین کے بعد اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پور فیری کی صورت پھر کبھی نہ دیکھوں گی۔

پور فیری دراصل ”حضرت گولوف لیف“ کا ہیرو اور ناول کا مقصد زیادہ تر اسی کی سیرت کا ہر پہلو دکھانا ہے۔ پاول کی موت تک اس کی سیرت کا صرف ایک پہلو ظاہر ہوا تھا اور وہ اس کی زمانہ سازی خوشامد، میٹھے اور پُر تکلف الفاظ میں اپنا مطلب چھپانے اور اپنی غرض پوری کرنے کے لیے ہر قسم کی بے عزتی برداشت کرنے کی صلاحیت تھی۔ جب پاول کے مرنے پر وہ اپنی بھانجیوں کی معوڑی سی زمین اور پوشیدہ مکان کے علاوہ ارینا پتروفنا کی کل جائداد کا مالک ہو گیا تو اس کی سیرت اپنے اصل رنگ میں نظر آئی۔ اس میں یہ صفت ضرور تھی، جسے وہ کسی موقع پر بیان کرنے سے چوکتا نہیں تھا، کہ وہ دوسروں کا حق مارنا ناجائز سمجھتا تھا اور اس کی ملکیت میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اخلاقاً یا قانوناً کسی دوسرے کا حق ثابت کی جاسکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نہایت ہی سنگ دل اور خود غرض تھا، اور اس نے اپنے لیے جو اصول مقرر کیے تھے وہ قانوناً نہیں تو اخلاقاً

جرم اور بے رحمی کا ایک فلسفہ تھا اس کے بڑے لڑکے دلجمیر نے پتیر برگ میں ایک لڑکی سے نکاح کر لیا اور پور فی ری نے صحبت اس کا گزارا بند کر دیا، کیوں کہ دلجمیر نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی کرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی۔ گزارا بند ہو جانے پر دلجمیر بالکل محتاج ہو گیا اور مایوسی میں اس نے خودکشی کر لی۔ پور فی ری کے چھوٹے لڑکے پویر نے سرکاری روپیہ جوے میں اڑا دیا اور جب اس کی خیانت پکڑی گئی تو بھاگا ہوا باپ کے پاس مدد کے لیے آیا۔ اس کی مدد کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ یا تو خودکشی کر لیتا یا اگر اس کی ہمت نہ کر سکتا تو قید کر دیا جاتا اور اس کی زندگی برباد ہو جاتی۔ لیکن پور فی ری نے اس کی مدد کرنے سے قطعی انکار کر دیا، اسے قید کی سزا ہو گئی اور وہ چند مہینے بعد قیدیوں کے ایک ہسپتال میں مر گیا۔ پور فی ری کی بھانجیاں لیوبا اور آنا جب بڑی ہوئیں اور انھوں نے بڑے حوصلے لے کر زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو انھیں مالی امداد کی سخت ضرورت پڑی، کیوں کہ ان کی اپنی جائیداد بہت تھوڑی تھی۔ مگر پور فی ری نے کبھی انھیں ایک کوڑی نہیں دی۔ انھیں نانک کے فن سے شوق تھا، اگر ان کی سرپرستی کی جاتی تو ممکن تھا وہ ماسکو یا پتیر برگ کے کسی ٹھیٹر میں لے لی جاتیں، اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرتیں اور ان کے اخلاق پر کوئی برا اثر نہ پڑتا لیکن مفلسی کی وجہ سے انھیں مفصلات کے ٹھیٹروں میں ایکٹ کرنا پڑا۔ جہاں وہ بہت بڑی صحبت میں بیٹھ گئیں۔ ناکا مسیانی،

ایسی اور صحبت کے اترنے ان کے اخلاق کو بگاڑ دیا۔ انہوں نے شراب
 خاری اور عیاشی شروع کر دی اور آخر میں دونوں بہت ذلیل قسم کی
 زندگیاں ہو گئیں۔ بڑی بہن لیڈ بانے جب دیکھا کہ ذلت کے باوجود بھی
 پیٹ بھر کھائے کو نہیں ملتا تو اس نے زہر پی لیا، چھوٹی بہن آنا کا بھی
 یہی ارادہ کیا، مگر آخر وقت میں وہ ہمت ہار گئی اور اس نے چارو
 ناچار ماموں کے یہاں آکر پناہ لی۔

دو جوان بیٹوں اور ایک بھانجی کی موت اور مسلسل تنہائی کی زندگی
 پور فیری نے کیسے برداشت کی؟ اگر دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی
 دل رکھتا تھا تو اس نے ایسی کنجوسی اور خود غرضی کو کیسے گوارا کیا جس سے
 سارا خاندان تباہ ہوا اور کوئی بھی ایسا نہ رہ گیا جو دو بیٹوں کی کھانا
 شکاری کا شکر یہ ادا کرتا؟ یہ مقدمہ پور فیری کی مذہبیت حل کرتی ہے۔
 ارینا پتر دفنا کو دولت کی ہوس نے کجس اور سنگدل بنا دیا تھا
 اور اسی وجہ سے آخر میں اسے پشیمانی ہوئی اور اس کے دل کو
 صدمے پہنچے۔ پور فیری نے اپنے اصولوں کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی،
 اور یہ بنیاد بہت مستحکم ہوا کرتی ہے۔ اس کی مذہبیت دوسروں کو محض
 مکاری اور ریاکاری معلوم ہوتی تھی، اس کی پارسائی اور عبادت
 گزاری صرف ایک نفرت انگیز نمائش۔ دوسرے اس کی حاضر جوابی کو
 چالاکی اور عیاری سمجھتے تھے اور ان مسئلہ اخلاقی اصولوں کو جو پور فیری
 کی زبان پر ہر وقت رہتے تھے اخراجات اور ذمہ داریوں سے بچنے کی

ایک ترکیب اور بد اعمالیوں کو چھپانے کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔ لیکن پورفیری کی کٹر مذہبیت اور وہ اصول جنہیں بیان کرنے میں وہ اس قدر مشاق تھا، اس کے ضمیر کو راضی اور اس کے دل کو پرسکون رکھتے تھے اور وہ صدے جو کسی دوسرے کی کمر توڑ دیتے اسے دراصل محسوس ہی نہیں ہوتے۔ عمر کے ساتھ پورفیری کی دنیا تنگ ہوتی گئی، اس میں تجربہ حاصل کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں رہی اور وہ ذہنی قوی جنہیں اس کی مسلسل تنہائی نے اٹھارہ اور استعمال سے محروم رکھا تھا فضول بکواس کرنے کے بیہودہ مرض کی صورت میں اپنا زور دکھانے لگے۔ سوا ان چند گھنٹوں کے جو پورفیری گھر اور جائیداد کا حساب کتاب دیکھنے میں صرف کرتا تھا اس کا سارا دن اور رات کا ایک خاصا حصہ کھاتے اور بکواس کرتے گزرتا تھا اور یہ بکواس بھی ایسی لغو اور فضول ہوتی تھی کہ اسے سننے پر مجبور کرنا سخت سے سخت سزا تھی جو وہ کسی عزیز یا معتبوب شخص یا دشمن کو دے سکتا تھا۔ لیکن وہی مذہبیت جس نے اس کے دل کو درد اور ہمدردی سے ہیگا نہ کر دیا تھا اس کی خود پزیرا کو بھی اپنی گود میں پالتی رہی اور جس طرح پورفیری کو یقین تھا کہ اس نے دوسروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صحیح تھا ویسے ہی وہ اپنی زندگی اور طرز معاشرت سے بالکل مطمئن رہا اور اسے بے چین کرنے کو نہ کوئی حیرت پاس بھٹکی نہ اُمنگ۔

آخر میں جب پورفیری کی بھانجی آنا ذلیل اور بیمار ہو کر اس کے

یہاں رہتے کو آئی اور ایک مرتبہ رات کے تیسرے پہر پور فیری نے اسے اپنی منظرہ لیف پر اکسیا کے ساتھ بیٹھے شراب پیتے اور گندے گیت گاتے پکڑا تو پور فیری کے معمول میں ایک تبدیلی ہو گئی اور وہ یہ کہ رات کو وہ آتنا کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ شراب اور نشے کی خواہش اس بنیاد کے کمزور پڑنے کی پہلی نشانی تھی جس پر پور فیری نے اپنے فلسفہ حیات کو تفسیر کیا تھا، اس قلعے کی دیوار کی پہلی دراڑ جس میں وہ اب تک محفوظ رہا تھا۔ آنا شراب پی کر بالکل مست ہو جاتی، نشے میں پور فیری کو خوب جی کھول کر گالیاں دیتی اور اپنی اپنی بہن اور اپنے ماموں زاد بھائیوں کی تباہی اور بربادی کا سارا الزام اسی کے سر لگاتی۔ پور فیری پہلے تو جواب دیتا اور اپنی صفائی کرتا رہا، لیکن نشے میں بھٹ کر نا اور دوسرے کو قایل کرنا دشوار ہوتا ہی، رفتہ رفتہ پور فیری کے دل میں کچھ شک سا پیدا ہو گیا اور آخر کار آنا کی شکایتوں اور گالیوں نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اسے اپنا پچھلا طرز عمل غلط معلوم ہونے لگا۔ یہ احساس گویا اس کے لیے موت کا پیغام تھا اور کچھ دنوں بعد وہ واقعی موت کی آرزو کرنے لگا۔ لیکن موت نہیں آئی اور دنیا سے نجات حاصل کرنے کے لیے پور فیری کو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینا پڑی۔

سالتی کوف نے حضرات گوٹ لیف میں صرف حقیقت نگاری کا کمال اور نفس انسانی کا ہر پہلو جاننے اور پہچاننے میں مہارت نہیں دکھائی بلکہ مذہبی جذبے کا ایک روگ بھی ظاہر کر دیا جو سچی مذہبیت کا

سب سے بڑا دشمن ہے، جو صرف عقیدت کی جڑ نہیں کاٹ دیتا بلکہ ان لوگوں کے روحانی تنزل کا باعث ہوا ہے جو مذہبی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں۔ اگر پور فیری محض مکار یا ریاکار ہوتا، اگر اس کی دین داری محض نمائشی ہوتی اور وہ کہتا کچھ اور کرتا کچھ تو وہ عیاروں اور دغا بازوں میں شمار ہوتا اور اس کی سیرت ہمارے لیے اتنی سبق آموز اور عبرت انگیز نہ ہوتی۔ لیکن پور فیری کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی خود پسندی اور خود پرستی صرف تکبر یا مزاج کا ایک عیب نہیں بلکہ اس کی عقیدت اور گہری مذہبیت کا دوسرا رخ ہے۔ اس کی سنگ دلی میں اس بھیانک ذہنی بیماری کی ایک جھلک بھی نہیں نظر آتی جو دوسروں کے درد اور تکلیف کو لطف اندوزی کا ذریعہ بنا دیتی ہے بلکہ یہ بھی اُس کے اصولوں اور عقیدوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور اس کی سیرت دیکھتے ہوئے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ سنگ دل نہ ہوتا تو اپنے عقیدے پر قائم نہ رہ سکتا۔ یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کی سیرت اور سرگزشت ہمارے لیے خاص طور سے سبق آموز ہو جاتی ہے۔ انسان کو صرف جھوٹی مذہبیت سے نہیں بچنا چاہیے بلکہ اس خلوص سے بھی جو درد اور محبت کے سامنے سر نہ جھکائے۔

سالتی کوف کی تصانیف کے تیسرے دور میں نہ اس کے پہلے افسانوں کا طنز اور تضحیک ہے، نہ ”حضرات گوٹ لیت“ کی طرح

سوسائٹی اور انسانی ذہنیت پر تنقید۔ ”کہانیوں“ کے مجموعے میں زیادہ تر ۱۸۶۱ء سے پہلے کی کسانوں کی زندگی دکھائی گئی ہے اور مصنف کا مقصد نکتہ چینی نہیں بلکہ ہمدردی کا جذبہ بیدار کرنا اور نظر میں وسعت پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے۔ ”بڑے دن کی کہانیاں“ مذہبیت سے لبریز ہیں اور یہ وہ مذہبیت ہے جو ضمیر کو روشن، دل کو محبت کے نشے سے چور کر دیتی ہے اور ایثار کی تیز آگ میں اس تمام آخور کو جلا کر خاک کر دیتی ہے جو انسان کی طبیعت میں اسی طرح خود بخود جمع ہوتا رہتا ہے جیسے اس کے جسم پر سیل۔ سالتی کوف کے دل پر اس وقت وہی کیفیت گزر رہی تھی جس نے گوگول کو انشا پردازی سے توبہ کرائی تھی اور وہ بھی عمر بھر کی طنز پر تنقید اور تضحیک کا اس صورت سے کفارہ ادا کر رہا تھا۔ یہ ارادہ سب سے زیادہ اس کے آخری ناول ”پوشے خونسک کی تاریخ“ میں نمایاں ہے۔ یہ ”تاریخ“ اس نے دل سے تمام شکائیں نکال کر اور نظر کو غیب جوئی کی عادت سے پاک کر کے لکھی تھی۔ اس میں پڑتے طرز کی زندگی اور پُرانا فلسفہ حیات اسی طرح کے شاعرانہ رنگ روپ میں دکھائی دیتا ہے جیسے اک کوف کی ”خاندانی درستان“ میں۔ سالتی کوف گویا دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے کہا سنا معاف کرنا چاہتا تھا اور اپنے قلم اور تخیل سے اپنے خلوص کی شہادت دلوارہا تھا۔ اس کا شمار روس کے سب سے زیادہ تلخ زبان اور سخت گیر نقادوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کی محبت اور ہمدردی کا رشتہ دوبارہ قائم کرنے کی اس کوشش کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

ساتواں باب

لسکوف

نکولائی سیمیونوویچ لسکوف صوبہ اوڈل کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا سرکاری ملازم تھا، مگر ماں رئیس خاندان سے تھی اور لسکوف کا بچپن عام زمینداروں کے بچوں کی طرح گزرا۔ وہ سولہ سال کا تھا کہ اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو گیا اور وہ اسکول چھوڑ کر ملازمت کرنے پر مجبور ہوا۔ کچھ سال بعد وہ ایک انگریز میٹر اسکا کے کاروبار میں شریک ہو گیا، روس اور بیرونی ملکوں میں بہت سفر کرتا رہا اور اس طرح اسے روسی فطرت اور معاشرت کے مطالعے کا نہایت اچھا موقع ملا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے مضمون نگاری شروع کر دی اور دو سال مشق کر کے اخبار نویس کی عہدہ سے پیتر برگ گیا۔ اخباروں اور رسالوں نے انشا پرداز کی حیثیت سے اس کی خاصی قدر کی، مگر لسکوف سیاسی فرقہ بندیوں سے بالکل الگ رہنا

چاہتا تھا اس لیے اخبار نویسی کے میدان میں اس کے قدم کبھی جم نہیں سکتے تھے۔ انتہا پسند فرقے کے اخباروں نے اسے ایک مضمون کی بنا پر بائیں کاٹ کر دیا اور اس بائیں کاٹ کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ اس کے مضامین کا ان اخباروں میں چھپنا بند ہو گیا بلکہ اس کی ادبی شخصیت بھی عام طور پر نقادوں کی توجہ سے محروم رہی۔ لسکوف نے اخبار نویسی رفتہ رفتہ چھوڑ دی مگر اس کے ناولوں اور افسانوں کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۸۶۳ میں اس کا پہلا افسانہ شائع ہوا، اس کے دوسرے سال "پس وین" اور ۱۸۷۱ میں "چھری کناری" یہ دونوں ناول سیاسی تھے اور ان کی وجہ سے لسکوف انتہا پسند حلقوں میں بالکل مردود ہو گیا۔ "چھری کناری" کے بعد لسکوف دامن جھار کر سیاسی مباحثوں سے علیحدہ ہو گیا۔ "گر جاوے" بہت مقبول ہوا، اور اس کے علاوہ لسکوف نے روسی کلیسا اور پادریوں کے رہن سہن پر جو افسانے لکھے وہ بھی بہت پسند کئے گئے۔ کلیسائی مذہب کی طرف داری کرنے سے اس نے دربار کے بہت سے سربراہ اور وہ لوگوں کو خوش کر دیا، اور خود ملکہ کے اثر سے اسے سرکاری مذہب کی حمایت کرنے کے معاوضے میں ایک عہدہ مل گیا جس میں تنخواہ وصول کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ مگر ملکہ کی یہ سرپرستی ایک غلط فہمی پر مبنی تھی اور جب لسکوف نے کلیسا والوں کا مذاق اڑانا شروع کیا اور اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک نہیں رہا تو وہ عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ آخر عمر میں لسکوف پر

تاستائی کی شخصیت کا بہت اثر ہو گیا۔ گرو چیلے کے خیالات اور زندگی میں بہت فرق تھا مگر سکوت اپنے خاص طرز پر تاستائی کی اخلاقی تعلیم کا پرچار کرتا رہا۔

مصنفوں کو مشہور اور بدنام کرانے میں نقادوں کی رائے کو بہت دخل ہوتا ہے اور روس میں عام رائے بالکل نقادوں کے اشارے پر چلتی تھی۔ لیکن نقادوں کی عداوت کے باوجود سکوت کی تصانیف مقبول اور ہر دلغیریز رہیں اور سیاسی حادثوں اور خیالات کے تغیر سے اس ہر دلغیریزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ کامیابی سکوت کے ناولوں کی بہترین تعریف ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم کی خوش مذاق اور قدر دان ہے جو اپنے ذہنی رہنماؤں کی مانعت پر بھی سکوت قدر کرتی رہی۔ اس معاملے میں عام ناظرین کی رائے نقادوں سے زیادہ صحیح تھی۔ روسی نقاد سکوت کو قدامت پرست اور روشن خیالی اور ذہنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے، مگر وہ غلطی پر تھے۔ سکوت میں صرف ایک ضد تھی جو اسے ابھی چیز کا بُرا پہلو بھی دکھانے پر مجبور کرتی تھی اور اگر اس نے انقلابیوں کا اکثر مذاق اڑایا تو قدامت پسندی کو بھی نہیں چھوڑا۔ لیکن روسی نقادوں کو ایسی حقیقت نگاری جس میں انسان اور انسانی زندگی کے اعلیٰ حوصلے اور گہرے روحانی مسائل نظر انداز کیے گئے ہوں یا جس سے کوئی اخلاقی یا سیاسی عقیدے اخذ کیے جاسکیں ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتی تھی، اس لیے کہ ناول اور افسانے

ہی ایک ذریعہ تھے جس سے قوم میں اخلاقی اور سیاسی عقیدے وغیرہ پھیلانے جاسکتے تھے، اور جو مصنف ناول محض قصہ سنانے کے لیے لکھتا اور تعلیم یا اصلاح اس کی غرض نہ ہوتی وہ انہیں اوجھا اور بہت ہمت اپنی قوم کے مستقبل سے بے پروا اور اس کی کامیابی کے رستے میں ایک رکاوٹ معلوم ہوتا تھا۔ ایک حد تک تو ان کا ناول نولیوں سے رہبری اور اصلاح کی توقع کرتا بجا تھا۔ روسی حقیقت نگاری اگر عام انگریزی یا فرانسیسی طرز کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند اور قابل قدر ہو تو اسی وجہ سے کہ اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور وہ محض سطحی زندگی کی عکاسی نہیں ہو۔ سکوف پر روسی ناول کے معیار میں فرق ڈالنے کا الزام ضرور آتا ہے، لیکن اس میں خوبیاں بھی اتنی ہیں کہ ہم یہ خطا معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سکوف کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان ہے۔ اس نے دہشتگی اور فصاحت جو تو گینف کی تصانیف میں عروج پر پہنچی اور جس کا دستہ لغت سکی کے سوا ہر روسی انشا پرداز نے حوصلہ کیا یا کل رک کر دی اور اس کے ناولوں میں انوکھے اور ساذمجاورے، عجیب عجیب اصطلاحیں، ایہام اور مستعلیٰ مگر غلط الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ خاص انداز بیان اس کی عبارت کو کسی قدر مشکل ضرور کر دیتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کی زبان بہت رنگین اور دل چسپ ہو جاتی ہے اور اس کے قصے پڑھنے میں ایک خاص مزہ آتا ہے، کیونکہ قصے اور

اندازِ بیان میں ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے۔ لسکوف کی دوسری مہمت اس کی دبستان کی شوخی اور رنگارنگی ہے۔ اس کی تصانیف کی فضا اس بایوسی اور حزن سے پاک ہے جو روسی انشا پردازوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے، وہ ناول اور افسانے قصہ سنانے کی غرض سے لکھتا ہے اور اس کے قصے ایک اہمیت اور دلچسپی رکھتے ہیں جس کا فلسفہ یا اخلاقی اور سماجی مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ یوں اس کی نظر ہمیشہ قصے پر جمی رہتی ہے، اس نے اپنے ناولوں کی آرائش سیاسی اور اخلاقی نظریوں سے نہیں کی ہے بلکہ ان حادثوں اور واقعات سے جن سے اس کا ہر ناول باللب بھر ہوتا ہے۔ یہ واقعات اور حادثے اکثر مضحک ہوتے ہیں اور لسکوف اپنے کیرکٹروں کا مذاق اڑانے سے کبھی نہیں چوکتا، خواہ وہ دل میں ان کی کتنی ہی قدر کرتا ہو اور اپنے ناظرین سے ان کا ادب کرانا چاہتا ہو۔ نقادوں نے یہ انداز دیکھ کر ہمیشہ کے لیے طعنے لیا کہ وہ محض ایک مسخرہ ہے، لیکن دل لگی بازی اور سچے احترام کی آمیزش لسکوف کے فلسفہ حیات کی خصوصیت تھی اور اس آمیزش کا طریقہ ایسا ہے کہ دونوں کیفیتوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کی دل لگیوں کے باوجود اس کے ہیر وہ اس کی اور اس کے ناظرین کی نظروں میں ہیر وہی رہتے ہیں۔ اگر لسکوف کے فلسفہ حیات پر ذرا غور کیا جائے تو ہمیں اس پر بھی تعجب نہ ہوگا کہ اس نے ان متضاد چیزوں کو یک جا کرنے کی کوشش کیوں کی۔ وہ مذہب اور خلائق

میں کسی قسم کی تنگی اور حد بندی کا قائل نہیں تھا، کہ اس کے نزدیک آزاد فضا میں نشوونما پانا انسان کی سب سے اہم روحانی ضرورت تھی اور تنگی اس کے خیال میں وہی تھی جو نیک عمل اور انسانی ہمدردی میں ظاہر ہو۔ جیسے وہ سچے اور اچھے عقیدوں کو رسمی مذہب کا نام دے کر ان کی تاثیر گھٹانے کے خلاف تھا ویسے ہی اسے یہ ناگوار تھا کہ ایسی ہستیاں جو ادب اور احترام کی مستحق ہوں سورتیں بنا کر کھڑی کر دی جائیں اور انسان کی نظر کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ انھیں ہر پہلو سے دیکھے۔

شروع کے سیاسی ناولوں میں لسکوت اپنے اصل رنگ میں نظر نہیں آتا اور اس دور کے افسانوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا فلسفہ حیات مکمل اور پختہ نہیں ہوا تھا۔ اس زندہ دلی، وسعت نظر اور رواداری کا بھی، جو اس کی خاص صفیتیں تھیں، اس کی پہلی تصانیف میں پتا نہیں چلتا اور اس کے کیرکٹر زیادہ تر انسانی سیرت کے بڑے نمونے ہیں۔ لسکوت کی طبیعت کے جوہر پہلی مرتبہ اس کے ناول ”گر جا والوں“ میں چمکے اور اسی ناول نے اس کی شہرت کی بنیاد ڈالی۔ اس ناول میں لسکوت نے ایک فرضی شہر تارگورود کے گرجا کے تین پادریوں کی داستان سنائی ہے اور ان تینوں میں سے ہر ایک کی سیرت اور صورت کا نقشہ کھینچنے میں کمال دکھایا ہے۔ رسولی توبے روزوف، گر جا کے صدر پادری، ہنایت نیک اور پارسا آدمی ہیں اور ان کا

شماران سیرتوں میں ہونا چاہیے جو شائستہ زندگی کا مایہ ناز ہیں۔ تو بے
 روزوں میں مذہبیت کا وہ سچا جذبہ ہے جو انسان کو ہر وقت اپنے اعمال
 اور نفس کی اصلاح میں مصروف رکھتا ہے اور جو ضمیر کو اتنا زود حس
 کر دیتا ہے کہ دوسروں کی نکتہ چینی کے لیے نہ موقع ملتا ہے نہ خواہش رہتی
 ہے۔ زحار یا بے نے فاکتوف، اگر جا کے دوسرے پادری، اس مسکینیت
 کی ایک مثال ہیں جو غربت اور دینی خدمات میں محو رہنے سے اکثر مذہبی
 لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے نفس کشی اس لیے کی ہے کہ مجبور
 تھے، دنیاوی حوصلے ترک کئے اس سبب سے کہ انھیں پورا کرنے کی
 کوئی صورت نہیں تھی۔ ان کا عجز و انکسار ان کے عقیدوں کا نتیجہ
 نہیں ہے بلکہ افلاس اور طبیعت کی کمزوری کا۔ اخلاص نیت سن،
 گر جا کا ڈمکن، صورت، سیرت اور عادتوں کے اعتبار سے اپنے دلوں
 افسروں سے بالکل جدا ہے۔ اس کا جسم ایک دیو کا ہے، طبیعت بچوں
 کی سی اور شوق وہی جو تندہست نوجوانوں کو ہوا کرتے ہیں، گواہ
 وقت جب داستان شروع ہوتی ہے اس کی عمر چالیس سال سے کچھ
 زیادہ ہی ہے۔ مذہبیت اس کو چھو بھی نہیں گئی ہے اور اپنی کلیسائی
 خدمات انجام دینے کے بعد وہ سارا دن کھیل کود، ورزش اور گپ
 شپ میں صرف کرتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ان سب صفتوں کے باوجود
 بے دینی اور آزاد خیالی کی مخالفت بھی اسی کے ذمے پڑتی ہے اور جن
 جن طریقوں سے وہ یہ فرض ادا کرتا ہے ان کا بیان ناول کا سب سے

زیادہ دل چسپ حصہ ہے۔ مثلاً وہ ایک مدرس کے یہاں سے جو علم تشریح کی معلومات کا ذخیرہ بڑھانے پر تھلا ہے، مردوں کی ہڈیاں چراتا ہوا دھچکے سے دفن کر کے پھر تمام شہر میں اپنے کارنامے کی خبر سنا پھرتا ہے۔ شہر کی میونسپلٹی والوں کے لیے یہ ایک مستقل تماشا سا ہو گیا ہے کہ وہ ایک طرف تو علم کو فروغ دینے کی غرض سے مدرس کو لاوارث مردوں کی لاشیں دیتے ہیں اور دوسری طرف دین کی حفاظت کے لیے ڈیکن اخلا کو انہیں چڑا کر دفن کر دینے کا انعام دیتے ہیں۔ اخلا کو یہ نہیں معلوم ہے کہ مردوں کی ہڈیاں چڑا کر دفن کر دینے سے دین عیسوی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور وہ اس مسئلے پر کبھی غور بھی نہیں کرتا، اسے فقط اپنا فرض ادا کرنے سے مطلب ہے۔ پھر ایک بار دریا میں نہاتے وقت وہ کسی جان پہچان کے ڈاکٹر کو ایک ہڈی دکھاتا ہے اور ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ یہ انسان کے ڈھانچے کی ایک ہڈی ہے جسے آسٹراگیلس کہتے ہیں۔ اخلا کو یقین تھا کہ یہ ہڈی ”چھوٹی سی دم“ ہے آسٹراگیلس کا لفظ بھی کچھ ایسا تھا جسے اس کے خیال میں کسی شریف اور دین دار عیسائی کو ہرگز اپنی زبان پر نہ لانا چاہیے۔ اس لیے اخلا نے ڈاکٹر کو شرک اور توہین مذہب کی سزا دینا ضروری سمجھا اور اس کی گردن دبا کر اسے دریا میں کئی ڈبکیاں دیں۔ ڈاکٹر بیچارے نے لاکھ ثابت کرنا چاہا کہ آسٹراگیلس کے لفظ سے دین عیسوی یا کلیسا کے عہدے داروں کی کوئی توہین مقصود نہیں، لیکن اخلا اسے ڈبکیاں

دیتا رہا اور کسی طرح سے اسے معاف کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اخلاق کے بعد ”گر جا والوں“ کا سب سے دل چسپ کیرکٹر وہی مدرس ہی جس کے یہاں سے اخلا ہڈیاں چڑایا کرتا ہے۔ مدرس ”ملکر“ ہر اور سائنس کا شیدائی اور چونکہ اس کے ارد گرد جلتے لوگ ہیں وہ سب بہت مذہبی ہیں اور سائنس دانوں کا احترام نہیں کرتے، اسے اپنے ماحول سے سخت شکایت ہے۔ اس کی ماں ہر بات میں اس کی مخالفت کرتی ہے، جن مردوں کی لاشیں وہ لاتا ہے ان کی مغفرت کے لیے وہ گرجا میں دعائیں مانگتی ہے اور جب مدرس کو نئی بات کرتا ہے جس کو وہ نہیں سمجھتی تو اپنی جہالت پر شرمندہ ہونے کی بجائے مدرس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی ہے۔

ماں کے بعد مدرس کو سب سے زیادہ شکایت اخلا سے ہے، جسے وہ علم اور روشن خیالی کا دشمن بلکہ اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ پولیس کا جاسوس سمجھتا ہے اور گرفتار ہونے اور سزا پانے کا خوف اس پر ایسا طاری ہے کہ اخلا کے علاوہ بھی وہ ہر شخص کو جو اس کے علمی ذوق کا قابل نہیں جاسوس فرض کر لیتا ہے۔ شہر میں مدرس کو تسلی دینے والی صرف ایک خاتون ہیں جو اس وقت سے آزاد خیالی کی فدائی بن گئیں جب ان کے باپ نے زنا کی سزا میں ان کو دُڑے لگائے تھے اور پولیس والوں نے بجائے باپ کو جیل خانے میں بند کرنے کے صاف صاف کہہ دیا کہ تم ایسی ہی سزا کی مستحق ہو۔

لے نجست دور کرنے کا عمل جو روسی عوام میں رائج تھا۔

اخلا دین کی حمایت اور مدرس جاسوسوں سے بچنے کے لیے جو ترکیبیں
 کرتا ہے وہ بہت دل چسپ ہیں، لیکن ”گر جاوالوں“ کی داستان میں
 پھر بھی واقعات اور حادثوں کی وہ افراط نہیں جو لسکوت کی تصنیف
 میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔ ”مسورستیاح“ (۱۸۷۴ء) کا قصہ ایک
 شخص کی سرگزشت ہے جو اپنے بھتیجوں کی انگریزستانی کے ناگوار انتفا
 سے جان بچانے کے لیے روس چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور پولیس والے
 اسے ”منکر“ اور انقلابی سمجھ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک
 کی پولیس کو بھی اس کی طرف سے بدظن کر دیتے ہیں۔ اسی سال کی
 دوسری تصنیف ”مقفل فرشتہ“ جس میں ایک مقدس مورت کی
 چوریوں کا قصہ ہے، لسکوت کے خاص طرز کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔
 ”دنیا کے سرے پر“ ۱۸۷۶ء کا ایک افسانہ ہے جس میں لسکوت نے جو اس
 وقت تک سرکاری مذہب کا پیروانا جاتا تھا، مذہب عیسوی کے ایک
 مبلغ کی سرگزشت سنا کر اپنی آزاد خیالی پہلی بار ظاہر کی۔ اسی زمانے
 میں لسکوت پر ٹاسٹامی کی تعلیم کا اثر پڑنے لگا، مگر اس پر بھی اس
 نے اپنا زالا رنگ نہیں بدلا اور ”کھیا لو ہار“ (۱۸۸۲ء) ”بڑے دن کی
 کہانیاں“ (۱۸۸۶ء) ”ذکیتی“ (۱۸۸۷ء) اور ”بر محل قہقہے“ (۱۸۸۷ء) نظر آتی
 اور حیرت انگیز اور دل چسپ ساخوں سے لبریز ہیں۔ ان افسانوں
 میں ”کھیا لو ہار“ خاص طور سے مقبول ہوا۔ اس میں زار روس کے
 سفر یورپ کا ایک قصہ ہے۔ زار جس ملک میں جاتا ہے وہاں کے لوگ

اسے اپنی صنعت و حرفت کے کرشمے دکھاتے ہیں۔ لیکن زار سب سے زیادہ انگریزی صنعت اور کاری گری سے مرعوب ہوتا ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ وہ خرید کر ساتھ بھی لے جاتا ہے۔ یہ ایک فولاد کی مکھی ہے، اس قدر چھوٹی کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتی۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسی چھوٹی مکھی کے بیٹ میں ایک کل ہے اور جب اس میں کوک بھری جاتی ہے تو وہ ناچنے لگتی ہے۔ زار کے ہمراہ اتفاق سے پلاتوف، ایک سن رسیدہ، تجربہ کار اور قوم پرست دریائے ڈون کے کنارے پر رہنے والا کوسک بھی ہے، جس کا ہٹلرین روس کی آبرو بچا لیتا ہے اور زار کو اپنی رعایا سے مایوس اور یورپ کی قوموں کا گردیدہ نہیں ہونے دیتا۔ زار جب مکھی دیکھتا ہے اور انگریزوں کی کاری گری کی تعریف میں الفاظ کا دریا بہاتا ہے تو پلاتوف اس سے وعدہ کرتا ہے کہ میں روسی کاری گروں سے اس کے جواب میں کوئی عجوبہ تیار کرادوں گا۔ روس واپس آنے کے کئی سال بعد آخر کار جب زار کا انتقال ہوتا ہے اور اس کا بیٹا تخت پر بیٹھتا ہے تو پلاتوف کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ فولاد کی مکھی کو شہر تولا کے مشہور لوہاروں کے پاس لے جاتا ہے اور لوہارا اپنے کام کی نزاکت اور باریکی جتانے کے لیے مکھی کے ہر پر میں جوتی پہنا دیتے ہیں اور جوتوں کے تلوں پر اپنے نام کھود دیتے ہیں۔ زار ان کے کام سے بہت مرعوب ہوتا ہے اور ان میں سے ایک کو جو کھبا ہے روسی صنعت کے اس کارنامے کو دکھانے

کے لیے انگلستان بھیجتا ہے۔ انگلینڈ اس کی بہت قدر کرتے ہیں اور ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کچھ دن مہمان رہنے کے بعد روس واپس ہوتا ہے۔ راستے میں جہاز پر وہ ایک ملاح سے شراب پینے کی شرط لگاتا ہے اور جب جہاز بندرگاہ پر پہنچتا ہے تو لوگ اسے مست پاتے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے۔ دربار میں بھی سب اس کا قصہ بھول گئے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھبا لوہار جو شراب خواری کی کثرت اور سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تھا محتاجوں کے ہسپتال میں مر جاتا ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔

روسی اور عام یورپی ذہنیت کے مقابلے سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان کے علاوہ داستان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کے مکالمے بہت پُر لطف ہیں اور زبان انوکھی مگر بہت دل چسپ ہے۔

لسکون نے اپنے آخری ناولوں اور افسانوں سے تاستائی کی طرح اخلاقی تعلیم دینی چاہی اور یہ دکھایا کہ اصل خیر مذہبی رسوم کی پابندی نہیں بلکہ ایسا عمل ہے جس سے خلوص اور دل کی نیکی ظاہر ہو۔ ”پہاڑ“ ”ایس کلوں کا رہزن“ اور ”حسین آزا“ جو اس دور کے بہترین افسانے ہیں کسی قدر شہوت انگیز ضرور ہیں لیکن یہ عیب ان کی اخلاقی اہمیت میں فرق نہیں ڈالتا، بلکہ حقیقت کو اور زیادہ واضح اور روشن کر دیتا ہے۔ ان افسانوں کے بعد بھی لسکون نے ایک ناول

”خزگوشتوں کی پرورش گاہ“ لکھا جو ابھی کچھ سال ہوئے پہلی بار شایع ہوا۔ یہ ناول اس کے شروع کے طرز پر ہی اور اس کا ہیرو پے رے گوڈ ایک کمزور دماغ کا شخص ہے جسے ایک با اثر رشتہ دار کی مہربانی سے پولیس میں ایک بڑی ذمہ داری کا عہدہ مل گیا ہے۔ پے رے گوڈ اپنی مشکل خدمات خاصی کامیابی کے ساتھ انجام دیتا رہتا ہے، جب تک کہ اسے باغی منکر گرفتار کرنے کا خط نہیں ہو جاتا۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کی کوشش میں وہ ایک ایسی زک پاتا ہے کہ اس کا دماغ بالکل خراب ہو جاتا ہے اور اس کی عمر کا بقیہ حصہ پائل خانے میں گزرتا ہے۔ لسکوف کے انداز بیان نے اس داستان کو جو بظاہر محض مزاحیہ ہے قوم اند قومی ذہنیت کی تنقید اور اس کی گمراہی عیاں کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ بصیرت افزوز ظرافت لسکوف کا حصہ تھی۔

آٹھواں باب

تالستانی

روسی ادب کے دینی اور اخلاقی رجحانات کا اکثر ذکر آچکا ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ گوگول کا جذبہ دینی اظہار سے محروم رہ کر کس طرح بگڑ گیا اور وہ نفٹ سکی کے دل میں اسی جذبہ دینی نے کس طرح کامل انسان کا عکس ناول میں اتار لینے کی سرزو پیدا کی۔ تالستانی کی شخصیت اور تصانیف میں روسی ادب کا یہ رجحان فن کی حد سے نکل کر سیاست، اخلاق اور مذہب کے میدانوں میں پہنچ گیا، اس نے ایک زمانے کی آسودگی، اطمینان اور خود پسندی کی ایسی قلعی کھولی کہ ساری دنیا میں کھلبلی مچ گئی، ایک مصیبت کو جسے یورپی تہذیب نے روسی سمجھ کر کباڑ خانے میں ڈال دیا تھا دوبارہ عقیدت کی عزت بخشی اور ناول نویس کی حقیقت بینی مصلح اور رہبر ہونے کا حیرت انگیز کام کرنے لگی۔

تالستانی کی ادبی زندگی تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، جن میں سے

پہلا، جو خالص ناول نویسی کا دورہ، ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ ”آئنا کاغذ“ کی تصنیف کے ساتھ ختم ہوتا ہے، دوسرا حصہ اخلاقی اور دینی جدوجہد کا زمانہ ہے، جب ناول نویسی تالستانی کی کارگزاری کا بس ایک پہلو تھی اور اس کا معیار اس کے دینی اور اخلاقی عقیدوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ دور ۱۹۰۰ء میں ختم ہوا اور اس کے بعد پھر تالستانی کی حیثیت ایک اخلاقی معلم کی سی ہو گئی، جو مختلف مسائل پر براہِ راست اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے اور جسے اس کی خواہش یا ضرورت نہیں کہ انہیں ادبی پیرائے میں بیان کرے۔ یہ تینوں دور تالستانی کی شخصیت کی نشوونما کی تین منزلیں ہیں، ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو صبح کا دوپہر سے اور دوپہر کا شام سے۔ انہیں ہم الگ تو کر سکتے ہیں جیسے ہم دن کو پہروں میں تقسیم کرتے ہیں، لیکن اس کا خیال رکھ کر کہ آفتاب وہی تھا، اس کا مقام بدلتا رہا۔

تالستانی کے روزنامے اور اس کی ابتدائی زندگی کے واقعات سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی طبیعت بہت حساس تھی، اس کے جذبات میں بڑی شدت تھی، اور جیسا کہ ایسے مزاج کے لوگوں میں اکثر دیکھا جاتا ہے، اس میں تھیب اور خود پسندی بہت تھی اور اس کی طبیعت پلٹے پلٹے بھی بہت کھایا کرتی تھی۔ تقدیر نے اسے ایک آبرودار دولت مند خاندان میں پیدا کر کے بہت سی مشکلیں آسان کر دی تھیں، لیکن ایک تو اسے صورت بڑی ہی خراب ملی تھی، دوسرے

اس کی خواہشیں اس کی استعداد سے ہمیشہ دس قدم آگے رہتی تھیں، اس لیے اس میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی، طبیعت کو بے جہنی ایک لوگ کی طرح لگ گئی اور اس کا لڑکپن اور شروع جوانی کا زمانہ اپنے عیب گنتے، غلطیاں کرتے اور پھر اپنے دل سے ان کا اعتراف کر کے اپنے لیے نہایتیں توجیز کرتے گزرا۔ تعلیم سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوا، نہ اپنی طبیعت کی افتاد کا پتہ چلا نہ اپنے اندر کسی صلاحیت کا احساس ہوا اور ناول نویسی کی پہلی کوششوں میں اسے کامیابی نہ ہوئی تو نہ چالے اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہ کامیابی اس کے لیے بڑا سہارا ہو گئی اور اس کے اندر نمو کی ان قوتوں کو جواب تک گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھیں صرت میں آنے کا موقع مل گیا۔ لیکن دانش پر داری تالستانی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھی، اس کے دل میں بہت سے حوصلے تھے جنہیں نکلنے کو اس طرح رستہ ملا، مگر یہ رستہ تنگ تھا اور حوصلوں میں وسعت اور جوش اور وہ دانش پر داری کی حد بند یوں کو توڑ کر ادھر ادھر بہ نکلتے۔ پھر ان بندوں کو توڑ دینا بھی سیلاب کے لیے کافی نہ رہا، تالستانی کی شخصیت دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دینے کی آرزو میں تر پنے لگی اور جب تک جسم میں جان تھی دل میں یہ تر پ رہی۔

ایسی حساس اور جوشیلی طبیعت جیسی کہ تالستانی کی تھی تربیت اور تعلیم کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہی اور تالستانی کو صحیح تربیت اور دینے والے ملے بھی نہیں۔ ۱۸۳۰ میں، جب وہ دو برس کا تھا، اس

ماں کا انتقال ہو گیا اور اسی کے چند سال بعد اس کے باپ کا۔ جن رشتے داروں نے اس کی اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش کی وہ اس سے محبت تو کرتے تھے، مگر اس کی طبیعت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے تالستانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا سکتے تھے۔ تعلیم میں تالستانی کا کبھی جی نہیں لگا، شاید اس لیے کہ تعلیم اور معلوموں میں کوئی کشش نہ تھی، تالستانی نے کوئی مضمون آخر تک نہیں پڑھا اور کورس ختم کیے بغیر یونیورسٹی کو چھوڑ کر جائداد کا انتظام کرنے کے بہانے سے گھر چلا آیا۔ اس وقت تعلیم میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اس کی ذہنی نشو و نما کے لیے خاصی مضر ثابت ہوئی اور اسے وہ برسوں تک اپنے طور پر مطالعہ کر کے بھی پورا نہ کر سکا۔ جائداد کے انتظام کا شوق دراصل کتابی تعلیم سے بھاگ کر دنیا اور آدمیوں میں رہنے اور عمل کے ذریعے استعداد اور تجربہ بڑھانے کی قدرتی خواہش کا نتیجہ تھا، لیکن وہ استقلال جو اس طرح کی تعلیم کو کارآمد بنانے کے لیے لازمی ہے، تالستانی کی طبیعت میں تھا ہی نہیں۔ کسانوں کی اصلاح کا خیال کسانوں کی ذہنی اور اخلاقی بستی سے دو چار ہوتے ہی خود بخود غائب ہو گیا اور تالستانی اپنی نشو و نما کی اس منزل تک ابھی پہنچا نہ تھا کہ اسے اپنی ذہنیت اور معاشرت میں اخلاقی بگاڑ نظر آتا اور کسانوں کی زندگی صحیح اور سچی معلوم ہوتی۔ وہ زمیندار تھا اور جائداد کے انتظام کی اس پہلی کوشش کے بعد بھی وہ زمیندار ہی رہا۔

تالستانی کی طبیعت کی کلی ۱۸۵۱ میں تففا زجا کر کھلی اور وہیں کی
 فضا اور مناظر نے اس کی نظروں پر سے وہ پردہ ہٹایا جس نے اب تک
 اس کو اندھا بنا رکھا تھا۔ سماجی زندگی نے اس کے جذبات میں ایک
 الجھاؤ پیدا کر دیا تھا، آدمیوں کی صحبت نے اسے خود میں اور خود پسند
 بنا دیا تھا، یہاں وہ ایک بارگی فطرت کی گود میں پہنچ گیا اور ایک بچے
 کی طرح جو اپنی ماں سے جدا رہ کر بھر ملا ہو، تالستانی پر مسرت کا ایک
 وجد سا طاری ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی طبیعت سے اب
 تک ناواقف اور اپنی اصل سے دور رہا ہو اور اس احساس کے ساتھ
 ہی بہت سے حوصلے جو اس کے دل میں غافل پڑے تھے چونک اُٹھے۔
 پیاس سے مرجھائی ہوئی کھیتی کو اب گویا پانی ملا تھا، اس کا رنگ بدلا،
 شگفتگی آئی، ہر پودے کھلے پھوٹنے لگے۔

انسان اپنی ذات، اپنی شخصیت کا کم ایسا گرویدہ، اپنے دل
 میں کچھ ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اس کے باہر وہ کبھی نکل نہیں پاتا اور نکلتا
 بھی ہو تو بھٹکتا لگتا ہے۔ اس کی جگہ بتی تب ہی سچی اور موثر ہوتی ہے
 جب وہ آپ بتی کا ایک روپ ہو، واقعات اور حادثوں کو وہ
 تب ہی سمجھا سکتا ہے جب وہ خود اس پر گزرے ہوں، زندگی اور
 دنیا کے راز وہ تب ہی معلوم کر سکتا ہے جب اس نے اپنی شخصیت
 کے راز معلوم کر لیے ہوں۔ اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری
 حقیقت انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے

کہ ہر انسان کی دنیا اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی کہ اس کی شخصیت اپنی کوئی کال کوٹھری میں بند ہوتا ہے اور کوئی ساری مادی اور انسانی دنیا پر جاویں حقیقت نگار صرف اپنی حقیقت بیان کرتا ہے اور اس فن میں کامل ہم اسی کو کہیں گے جو ایک دنیا کی زندگی کا سارا طلسم اپنے اندر رکھتا ہو اور وہ اپنے دل پر نظر ڈالے تو ایک دنیا کا ماجرا بیان ہو جائے یا نہ ہو۔
 نے اپنی انشا پردازی سوانح عمری سے اور نعل عمری پہن سے شروع کی جو ہم کے لیے نہیں تو شخصیت کے لیے ہم اور وجود کی درمیانی کیفیت ہوتی ہے۔ اس نے ناول نویسی کی مشق بالکل نہیں کی تھی، لیکن اپنی طبیعت پر وہ ایک زمانے سے غور کر رہا تھا اس کے سامنے کوئی معیار نہ تھا اور کسی معیار پر پورا اترنے کا اسے یقین بھی نہ تھا، لیکن تخیل اور قلم کو آزاد چھوڑ دینے سے اس کے بیان میں ایسی بے ساختگی، سچائی اور سادگی آگئی جو خود معیار ہو اور جسے دیکھتے ہی پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں۔

تالستانی کی انشا پردازی کا ہر رنگ دراصل اس کی شخصیت کا رنگ تھا۔ اس کی ابتدائی اور آخری تصانیف میں، خواہ وہ ناول ہوں یا رسالے، یہ خصوصیت مشترک ہے کہ ان کا جو ہر آپ بیتی کا وہ عنصر ہے جو ان میں شامل کیا گیا یا شامل ہو گیا۔ اس طرح اس کی تصانیف پر معقول بحث کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ہمیں اس کی شخصیت کا اندازہ ہو جائے اور نشو و نما کی جو منزلیں اس نے طو کیں ان کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں قائم ہو جائے۔

یہ تو ہم بیان کر چکے ہیں کہ تالستانی بہت حساس تھا اور اس کے جذبات سونے ہوئے رہتے یا اگر اُٹھتے تو ایک طوفانی موج کی طرح۔ لیکن اس کے باوجود تالستانی کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی اور ہر مسئلے پر اس کی نظر صاف اور سیدھی پڑتی تھی، اس میں نہ تہذیب کی وہ خود پسندی تھی نہ مذاق اور ذہن کے وہ تعصبات جو غور کرنے سے پہلے ہی رائے کو کسی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ مناظر قدرت نے اسے اپنے نفس اور اپنے جذبات کا مطالعہ کرنے کا شوق دلا کر ناول نویس بنا دیا، پھر بعد کو جب تہذیب سے اس کا جی ہٹ گیا تو کسانوں کی سیدھی سادی طبیعتوں اور دیہات کی معاشرت سے اس نے اتنا اثر لیا کہ بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ اسے مہذب زندگی کے مقابلے پر لایا اور اس میں شک نہیں کہ دل و دماغ کی وہ سادگی، طبیعتوں کا وہ ہم دار اور سلجھا ہوا، جس کی شان یہ ہے کہ محسوس نہ ہو، اسے وجد میں لاسکتا تھا۔ اس کی آنکھ دنیا کو اور آدمیوں کو بچے کی نظر سے دیکھتی تھی اور اس کا دماغ ان دیکھی ہوئی چیزوں کو بوڑھوں کی طرح جانچتا تھا، جو تصویر وہ کھینچتا ہے وہ تعصب اور نظر کے دھوکوں سے خالی اور اس وجہ سے صحیح اور دل کش ہوتی ہے، جو رائے وہ قائم کرتا ہے وہ ایک حساس دل کی سرگزشت اور تجربے پر منحصر اور اس وجہ سے سبق آموز ہوتی ہے۔ یہ سب بڑی نایاب خوبیاں ہیں اور اگر ناول نویسی میں تسکین دینے کا

اتنا مادہ ہوتا کہ وہ تاستائی جیسی بے چین طبیعت نہ کھنے والے کی زندگی کا مقصد بن سکے تو تاستائی ناول نویسی میں کامل ہوتا اور ہمیشہ کے لیے ویسے ہی سرفراز مانا جاتا جیسے کہ کوہ ایورسٹ پہاڑ کی چوٹیوں میں، لیکن ناول نویسی میں اتنی وسعت کہاں کہ وہ تاستائی جیسی شخصیت کے لیے چولاں گاہ بن سکے۔ اس کی طبیعت میں موج پر موج اٹھتی رہتی، کبھی دو چار موجیں ایک ہی طرف بہتیں تو کبھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتیں اور وہ طوفان برپا ہوتا کہ خدا کی پناہ۔ تاستائی کو کبھی رفاہ عام کا حوصلہ ہوا، کبھی تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا شوق اور تان اس ارادے پر ٹوٹی کہ دنیا میں وہ دین جو دراصل حضرت عیسیٰ کا دین تھا عام مسلک بنایا جائے۔ یہ سب حوصلے بہت بڑے تھے، اتنے بڑے کہ ہر ایک کے لیے عمریں وقف کی جاتیں تو بھی یقین نہ ہو کہ ان کے پورے ہونے کی صورت نکل آئی ہو، ان میں سے ہر ایک کے لیے وہ صبر اور استقلال چاہیے جو وقت کو خاطر میں نہ لائے اور کوشش کو کامیابی سمجھے۔ تاستائی کا تخیل اور اس کا دل اتنا بڑا اور قدر شناس تھا کہ ہر حوصلہ پر جان کو قربان کرنا وہ ایک ادنیٰ خدمت سمجھتا تھا، لیکن اس کے دل کو بڑے حوصلوں کی تاب نہ تھی، وہ انھیں پیدا ہونے ہی دنیا کے سپرد کر دیتا یا وہ خود اس کے دل کے باہر کود پڑتے۔ ہر حوصلہ اسے دنیا کو بدل دینے کی فکر میں ڈال دیتا، اس کی شخصیت میں وہ صفات پیدا نہ کرتا جو دنیا کو

بدل سکتی ہیں۔ اس کی نظر سب کچھ دیکھ سکتی تھی، ایسی گہرائیاں ناپ سکتی تھی جہاں وجود ان کے سوا علم کے کسی ذریعے کی رسائی نہیں، لیکن آنکھ کی دیکھی چیز اس کی طبیعت کے سانچے میں ڈھل کر دوسرے تک نہیں پہنچتی تھی، اس کا نقش فوراً دنیا پر اثر آتا اور تالستانی کی اپنی شخصیت اس کا غز کی طرح رہ جاتی جس پر سے کسی نے تصویر مٹائی ہو۔ اس کے جذبات کا سیلاب کبھی ادھر بہتا کبھی ادھر کسی کی کھیتی سیراب نہ ہوتی اور جب وہ گزر جاتا تو تالستانی کے اپنے دل میں بھی اس کا پتہ دینے کو ایک ذرا ساناٹا تک نہ رہ جاتا بس خشک زمین کی صورت یہ بتاتی تھی کہ ادھر سے سیلاب گزرا ہے۔

تالستانی میں یہ کم زوریاں نہ ہوتیں تو شاید وہ ناول نویس نہ ہوتا، اس سے کچھ بہت بڑھ کر ہوتا اور وہ اپنی کم زوریاں محسوس نہ کرتا تو دنیا اس بصیرت افروز ہنگامے سے محروم رہ جاتی جو اس کی تنقید نے پیدا کیا۔ ہمیں اس کی دینی اور معاشرتی تعلیم کے صحیح اور کامیاب ہونے سے بحث نہیں، صرف اس ادیب سے مطلب ہے جس نے ادب، فن اور اخلاق کے چٹنوں کو ملا کر اپنے دل اور اس کے ساتھ ساری دنیا کی پیاس کو بجھانا چاہا، جس نے حجاب کی رسموں کو توڑ کر ادب کو دین اور اخلاق کی صورت دکھائی اور قلم کی انتہائی قوت میں بے چارگی پائی تو اسے اٹھا کر پھینک دیا اور دل کو ہاتھ میں

لے کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ناول نویسوں کے لیے خصوصاً جب وہ حقیقت نگاری کا دعوے کرتے ہوں، یہ خلافِ ادب مانا گیا ہے کہ وہ قصے میں اپنے خیالات کو اس طرح ظاہر کریں کہ وہ ایک پیوند معلوم ہوں، یا افسانے کے ذریعے سے اپنے کسی عقیدے کی مکمل کھلا تبلیغ کریں۔ تاستائی نے اس قاعدے کی پروا نہیں کی اور شروع میں کم لیکن آخر میں بہت زیادہ اپنے خیالات اور عقیدوں کو ناولوں اور افسانوں میں بیان کرتا رہا کہیں پر تو بے شک اس کی یہ تبلیغی کوششیں گراں گزرتی ہیں اور اصل داستان سے الگ اور بے تعلق ہو جاتی ہیں، مگر دوسری طرف دیکھیے تو ناول نویسوں کا دعوے کہ وہ آدمی اور دنیا کو جیسی کہ وہ ہر دکھا سکتے ہیں صریحی دھوکا ہے۔ فن اور فن کے سچے قدردانوں کا مطالبہ تو بس یہ ہوتا ہے کہ ناول نویس آدمی کے نام سے پتلے بنا کر نہ کھڑے کر دے اور زندگی کی وارداتوں کے بہانے سے خیالی باتیں بیان کر کے نہ رہ جائے، یعنی اسے آدمی کی سیرت اور زندگی کے کاروبار سے غیر معمولی طور پر گہری اور سچی واقفیت ہونا چاہیے، خواہ وہ یہ واقفیت اخبار نویسوں کی طرح آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرے یا اپنے جذبات کے دریا میں غوطے لگا کر۔ قصہ تو بہر حال سوچا جاتا ہے، سیرتوں اور صورتوں کے نقش بنائے اور مٹائے جاتے ہیں جب تک کہ وہ اصل کے بالکل مطابق

نہ ہو جائیں۔ تالستانی نے چھوٹے قاعدے کی پروا نہ کی، مگر وہ سچائی اور خلوص کا ایسا دل دادہ تھا کہ اس کی تصانیف میں حقیقت اور افسانے کے درمیان فرق ہی نہیں رہا۔ اس کے بیان میں ہم شروع ہی سے ایک بے تکلفی، سادگی اور صفائی دیکھتے ہیں جو یا تو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہو یا برسوں کی محنت اور مشق کے بعد کسی کسی کو حاصل ہوتی ہو اور یہی صفت تھی جس نے اس کی پہلی تصانیف میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ وہ قارئین کو دل چسپ بنانا دیکھنا، قصہ سنانے ہی کی شرط سے بری ہو گیا۔ یہ صفت روس کے اور کئی ناول نویسوں میں پائی جاتی ہو، تالستانی دوسروں سے بازی لے گیا اس لیے کہ اس کی ادبی صفات میں ایک شخصیت کی پرچھائیں بھی نظر آتی تھی جو اور کسی روسی ناول نویس کو نصیب نہ ہوئی۔

تالستانی کا مذاق اور اس کے رجحانات کی ایک علامت یہ ہو کہ اس نے لکھنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے ”بچپن“ لکھا۔ شاید فقہان کے مناظر کا اس کی طبیعت پر جو اثر پڑا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے ورق الٹ کر اور کئی حصوں پر قلم پھیر کر اسے دوبارہ اور اس نئی نظر سے جو فقہان کی دین تھی، مرتب کرنا شروع کیا۔ سرگزشت کی یہ نئی ترتیب تاریخ نہ تھی، اس وجہ سے اس کو افسانہ کہا گیا، لیکن لکھتے وقت تالستانی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ تاریخ سے زیادہ صیح ہو کہ اس میں آغاز اور انجام کا خیال رکھا گیا ہو۔

اس میں جان ہو، اسے پایہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جو کوئی محض کھوج کی خاطر تالستانی کے بچپن کے حالات معلوم کرنا چاہے اسے اس کتاب کا دوسری ”تاریخی“ کتابوں سے مقابلہ کرنا ہوگا، جو تالستانی کے بچپن میں اپنا بچپن دیکھنا چاہے اور شخصیت کی کلی کے کھلنے کا مزہ لینا چاہے اس کے لیے یہ افسانہ نہیں بلکہ مستند سے مستند تاریخ سے بھی زیادہ صحیح اور بصیرت افزا ہوگی، کیوں کہ اس میں وہ حقیقتیں اور کیفیتیں بیان کی گئی ہیں جن تک مورخ کی رسائی نہیں ہوتی۔ ”بچپن“ کی ایک کیفیت ملاحظہ ہو:

”پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں۔ چائے کی میز کے سامنے اونچی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دودھ اور شکر کا پیالہ پئے ہوئے دیر ہو چکی۔ نیند جیسے پوٹوں کو چپکائے دیتی ہے۔ مگر اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بیٹھے ہیں اور سن رہے ہیں۔ سنیں نہ تو کریں کیا۔ اماں کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی آواز بڑی میٹھی اور خوش اخلاقی سے بھری ہے۔ آواز سنو اور بات نہ سمجھیں تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے دل سے بہت کچھ کہ گئیں۔ نیند سے نظر دھندلی پڑ گئی ہے مگر میں انہیں کی طرف دیکھ جاتا ہوں۔ ایک بار گی وہ چھوٹی ہو جاتی ہیں، بالکل مُتی سی۔ ان کا چہرہ بٹن سے بڑا نہیں ہے، مگر مجھے بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ پر ایک نظر ڈالتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ مجھے وہ اپنی چھوٹی بہت بھلی لگتی ہیں۔ میں اپنی آنکھیں اور دبا لیتا ہوں۔ اب وہ

بس اتنی بڑی ہیں جتنے کہ وہ چھوٹے بچے جو پتلیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن پھر میں ہل جاتا ہوں اور یہ سارا تماشا ختم ہو جاتا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں، بدن کو ادھر ادھر مڑوڑتا ہوں، ہر طرح سے کوشش کرتا ہوں کہ تماشا پھر سے دیکھوں، مگر کچھ نہیں ہوتا۔ ”بچپن“ ختم ہوتا ہے تو ”لڑکپن“ اور ”جوانی“ شروع ہوتی ہے۔ بچپن کا بھولا پن اب بدل کر لڑکے کی بے چینی اور جوان کی جستجو بن جاتی ہے، کلی اب پھول بن گئی ہے، پھول اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور جن، عبا اور بہار، خزاں اور انتشار، سب کا حال اس پر کھلنے لگتا ہے۔ اس دور کی کیفیتیں بیان کرتے وقت تاستائی کی نظر زیادہ تیز اور گہری ہو جاتی ہے اور وہ تمام احساسات جنہوں نے اس زمانے میں اسے پریشان اور جان سے بیزار کر دیا تھا سب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے جب وہ جائیداد کا انتظام کرنے کے لیے یونیورسٹی چھوڑ کر گھر چلا آیا تھا اور ”زمیندار کی صبح“ اس وقت کی زندگی کا سچا اور موثر خاکہ ہے جس میں اس نے نہ اپنے ساتھ کوئی رعایت کی ہے نہ ان غلام کسانوں کے ساتھ جن سے اس کا سابقہ تھا۔ اس کے مشاہدے میں اب وہ بے باکی آگئی ہے جس نے آگے چل کر اس کی حقیقت نگاری کو سوسائٹی کے لیے ایک تازیانہ بنا دیا مگر ساتھ ہی محبت اور انسانی ہمدردی کی چارہ سازی پر ایسا بھروسہ بھی نظر آتا ہے جو سچائی اور حقیقت نگاری کی کڑی دھوپ میں سائے کی

طرح پناہ دیتا ہے۔

تالستائی ۱۸۵۱ء میں قفقاز گیا اور اسی دوران میں جب وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہا تھا اس نے وہاں کے منظروں کی تصویریں بھی کھینچیں۔ اس فن میں بھی اسے کمال تھا۔ دوسرے روسی مصنفوں سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی زبان کچھ خاص طور پر اچھی نہیں، لیکن اس میں مشاہدے کی جو قوت تھی وہ اس کے بیان میں ایک انوکھی تاثیر پیدا کر دیتی جو شاعری اور مصوری دونوں کی تاثیر سے جدا تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ تالستائی قدرت کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس سے کہ اپنے آپ کو اور صبح اور شام، سکون اور طوفان، غرض قدرت کا ہر رنگ اور ہر کیفیت اس کی اپنی کیفیت، اس کی آپ بیتی بن جاتی تھی۔ قفقاز کی ایک صبح کا منظر، جو اس کے افسانے ”حملہ آور“ میں بیان کیا گیا ہے، اور ”برف کا طوفان“ دونوں فن کی شاہ کار مانی جاتی ہیں۔ لیکن قفقاز کی فضا سے اثر لے کر تالستائی نے جو کچھ لکھا اس میں اس کا افسانہ ”کوسک“ سب سے ممتاز ہے۔

”کوسک“ کا قعدہ بہت مختصر ہے۔ ایک روسی نوجوان اولین جنوبی روس میں جا کر کوسکوں کی ایک بستی میں رہتا ہے اور کچھ دنوں رہ کر چلا آتا ہے۔ بہت سے لوگ اسی طرح صحت یا سیر کی خاطر یا ملازمت کے سلسلے میں کوسک علاقے میں جا کر رہتے ہوں گے اور دل پر کوئی خاص اثر لیے بغیر چلے آتے ہوں گے۔ لیکن اولین کا حال ہی کچھ

اور ہے۔ اس میں وہ قدرتی تنگ نظری اور خود غرضی نہیں ہے، جو انسانی زندگی کو چند خواہشوں کا مجموعہ بنا دیتی ہے اور خواہشوں کے پورے ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بخشتی ہے۔ وہ یہ سمجھ کر کہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، اپنے لیے کوئی مسلک نہیں بنا سکتا اور اسے کسی خاص مسلک کے متبع ہونے کا یقین بھی نہیں ہے۔ قدرت یا قسمت یا اس کی اپنی طبیعت کے کسی چھپے روگ نے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ اس کی ایک آنکھ تن کی دنیا کو دیکھتی ہے تو ایک من کی دنیا کو دیکھتی رہتی ہے، اسے دنیا میں کسی طرف اطمینان کی صورت نظر نہیں آتی اور سب سے زیادہ شکایت اسے اپنے آپ سے ہے۔ اس کے مذاق اور اخلاق میں بڑی نفاست پسندی آگئی ہے، جو کہ بذاتِ خود بہت اچھی اور کمیاب صفت ہے، مگر اسی نے اس کی قوتِ عمل کو اس طرح مار دیا ہے کہ اسے ان حقیر اعراض اور ادنیٰ ذہنیات رکھتے والے لوگوں پر رشک آتا ہے جو مزے میں اپنا کام نکالتے رہتے ہیں اور جنہیں اپنے عیبوں کا احساس ہے نہ اس کا اندیشہ کہ دنیا ان پر اعتراض کرے گی۔ اولین ہر وقت اپنی طبیعت پر غور کرنے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور اس مشغلے کو بہت اہمیت دیتا ہے، اس لیے اسے بڑا سخت صدمہ ہوتا جب کبھی وہ اچانک محسوس کرتا ہے کہ دنیا کو اس سے مطلب ہے نہ ان مشکلوں سے جو اسے مصروف رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ

کہ جس کی طبیعت کا یہ رنگ ہوا سے حسرت کے سوا کیا نصیب ہو سکتا
 ہے۔ اولین کی حسرتوں پر ستم یہ ہے کہ وہ جوان ہے، حسن کا قدردان
 ہے اور دل میں ہزار انگلیں رکھتا ہے۔ وہ شہری زندگی اور آدمیوں
 کی صحبت سے بیزار تھا اور ایسی جگہ پہنچ کر جہاں قدرت انسانی زندگی
 کو اپنی گود میں پالتی ہے اسے پھر اپنے آپ سے اور دنیا سے بڑی
 امیدیں ہو گئی تھیں۔ لیکن قفقاز سے بھی وہ دنیا کی بے دردی کا
 داغ دل میں لے کر واپس ہوا۔

”کوسک“ میں تالستانی نے اولین کی آڑ میں اپنی سیرت کا
 جو نقشہ کھینچا ہے وہ شاید اس خاص زمانے کے لیے جب وہ قفقاز
 میں تھا صحیح ہے۔ نومبر ۱۸۵۳ء میں روس اور ترکی کی جنگ
 شروع ہوئی، جس میں انگلستان اور فرانس ترکوں کے ساتھ تھے
 اور ان کی فوجوں نے کریمیا کے جزیرہ منا پر حملہ کیا۔ یہاں پر ایک
 لمبی جنگ کا سامان ہونے لگا اور تالستانی پر بھی وطنیت کے
 جوش نے اتنا اثر کیا کہ اس نے لڑائی میں بھیجے جانے کی درخواست
 کی اور قفقاز کی فوج سے منتقل ہو کر نومبر ۱۸۵۴ء میں سواستوپول
 پہنچا، جو جنگ کا مرکز تھا۔ اس کے ساتھیوں کے بیان سے معلوم
 ہوتا ہے کہ وہ بڑا مہنس مکھ رفیق اور بہادر سپاہی ثابت ہوا۔ دنیا
 کو اس کے اس جنگ میں شریک ہونے سے تین افسانے ملے جو
 فن کے اعتبار سے بہت اچھے اور مضمون اور خیالات کے لحاظ

سے شاید اس وقت تک کے یورپی ادب میں انوکھے تھے۔ پہلے
 میں، جو سب سے کم زور ہو، صرف سواستوپول کی فضا اور وجد
 کی سی ایک کیفیت جو خود تالستائی پر طاری تھی، بیان کی گئی ہے۔
 لیکن تالستائی کا تخیل و طینت جیسے جذبے کے فریب میں آنے والا
 نہ تھا۔ دوسرے افسانے میں ہم اس کا بالکل اور ہی رنگ دیکھتے
 ہیں۔ اب اسے نہ کسی طرف بہا دے دی نظر آتی ہے نہ وطن اور بادشاہ
 پر جان دینے کا شوق، بس خود پسندی ہو اور مجبوری اور خوف،
 مرنے میں کوئی شان نہیں ہو اور زندگی میں رونق پیدا کرنے والے
 ارمان نہیں ہیں۔ اس کو لکھنے کے بعد تالستائی خلوص سے کہہ سکتا
 تھا کہ ”میرے افسانے کی ہیروئن جیسے میں پورے دل سے چاہتا ہوں۔
 جسے میں اس کے پورے حُسن کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں، سچائی
 ہو، وہ سچائی جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے گی۔“ جنگ کی فضا
 میں جذبہ مہینے رہنے سے تالستائی کے مذاق سے جذبات پرستی
 کی طرف وہ تھوڑا سا میلان جو اس کی ابتدائی تصانیف میں ملتا ہے،
 جاتا رہا اور اس کی نظر کے سامنے سے وہ ہلکا سا کہرا جواب تک
 پڑا تھا، اٹھ گیا۔ سواستوپول کے متعلق جو تیسرا افسانہ ہے اس کا
 موضوع انسان کی طبیعت ہے اور جنگ کی حیثیت بالکل ضمنی ہو گئی
 ہے۔ یہاں تالستائی نے جذبات کی اُلتا پھیر کا جو منظر دکھا یا ہے
 وہ درد کی ایک موثر تصویر اور نفسیاتی مطالع اور تشریح کا ایک

کار نامہ ہی۔

تالستانی کریمیا سے واپس ہوا تو اس کا شمار ملک کے ممتاز ادیبوں میں ہونے لگا تھا اور پترو گرا دیمیں وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن ادیبوں کی صحبت میں اسے ایک ہمدرد نہ ملا۔ اور ادیبوں کو بھی عام طور پر اس سے یہ شکایت ہو گئی کہ وہ اپنی ریاست اور اعلیٰ خاندانی جتنا ہی، تنگ چڑھا ہی اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ یہ شکایت بھی اپنی جگہ پر غلط نہ تھی۔ آرٹسٹ عموماً تنقید اور اختلاف رائے سے جڑھتے ہیں، اپنے آرٹ کو چاہے وہ خود پسندی سے جتنا بھی پاک کر لیں، ان کے اخلاق پر شہرت اور کامیابی کا کچھ برا اثر ضرور پڑتا ہی۔ تالستانی میں ذات اور خاندان کا خیال ایک ناگوار صورت اختیار کر لیا کرتا تھا اور اگرچہ بعد کو وہ بہت فیس کرتا مگر غصے میں منہ سے گھمنڈ اور تکبر کی کوئی نہ کوئی بات نکل ہی جاتی تھی۔ آپس کی رنجشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تالستانی نے روسی ادیبوں سے ملنا اور ادبی صحبتوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔

لیکن تالستانی کی شکایتیں ذاتی اور اتفاقی تھیں تو اصولی بھی تھیں۔ اس کی طبیعت اس زمانے میں بہت بے چین تھی، وہ گویا جذبات کی ایک موج کے ساتھ بہت اونچا اٹھ کر پھر نیچے گرا تھا، اور ایک تو یہ اٹھ کر گرنا اور دوسرے شاید منزلت سے دور ہونے کا خوف، کہ وہ بلندی سے دیکھنے پر بھی کسی طرف نظر

نہ آئی تھی، اسے پیچ و تاب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اپنے زمانے کے ادیبوں سے اس کو امید تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح منزل مقصود تک پہنچنے کے شوق میں تڑپ رہے ہوں گے، اور ان کی سرگزشت سے اس کو کچھ سبق، کچھ سہارا ملے گا۔ مگر اس نے انہیں ایسے ہر جوصلے سے خالی پایا اور وہ تمام عیب اسے ڈھیروں نظر آئے جو وہ معمولی آدمیوں میں لہر خود اپنے اندر بھی دیکھتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی ادبی استعداد بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی، اس نے جو کچھ لکھا وہ خالص طور پر پسند نہ کیا گیا جس سے اس کا یہ اندیشہ اور بھی بڑھ گیا کہ وہ غلط رستے پر جا رہا ہے اور روحانی سکون اور اخلاقی نشو و نما ایسے مقصد نہیں ہیں جو خالی انشا پرداز بننے سے حاصل ہو سکیں۔ اس کی عقل ایسی نہ تھی کہ خبر وہی اصلاحوں کو بے جا اہمیت دے، دل ایسا تھا کہ انقلاب چاہتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں کو غافل اور گمراہ پایا تو غفلت اور گمراہی کی جڑ تک پہنچنے کی ٹھانی اور پہنچ بھی گیا۔ اس نے خود جس طرح تعلیم پائی تھی اور ہر سبق کو کڑوی دوا کا ٹھونٹ سمجھ کر اور منہ بنا بنا کر پیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ رائج طریقوں کے مطابق اس نے پڑھانے کی بھی کوشش کی تھی اور نا کامیاب رہا تھا۔ اب اس نے یورپ کا سفر کیا، وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھے، مگر وہ بھی اسے صحیح رستہ نہ بتا سکے اور اس کی اس رائے کی تصدیق ہو گئی جو اس نے روسی سوسائٹی اور

اس کے مختلف طبقوں کی زندگی اور جوصلوں کا مشاہدہ کر کے قائم کی گئی کہ ہمارے تعلیمی ادارے ایسے آدمی پیدا نہیں کرتے جن کی نوع انسانی کو ضرورت ہو بلکہ ایسے آدمی جن کی ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی میں قدر ہوتی ہو، سرکاری ملازم، تعلیمی اداروں کے ملازم، ادب کے ملازم، یا ایسے آدمی جنہیں بیکار ان کے ماحول سے کھینچ کر نکالا گیا ہو، جن کی جوانی برباد کی گئی ہو اور جنہیں زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی، یعنی جڑ چڑے، روگی، ترقی کے پرستار جب تعلیم اس قدر غلط تھی تو کوئی تعجب نہیں کہ عوام جو اخلاقی اور جہانی تندرستی کے حس کو کھو نہیں چکے تھے، اس سے بھاگتے تھے۔

لیکن اس عام تعلیمی گمراہی کا علاج کیا تھا؟ تالستانی کا خیال تھا کہ تعلیم کو آزادی پر منحصر ہونا چاہیے اور اسے کتاب کی پرورش کی بجائے خدا اور انسانیت کی سیوا کرنا اور اپنے طریقوں میں قومی ضرورت کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ تالستانی نے اپنے کسانوں کے لیے ایک اسکول کھولا اور اپنے تعلیمی نظریوں پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن معلم کے لیے جو صبر اور استقلال چاہیے وہ اس میں نہ تھا اور اگرچہ تالستانی نے بات بڑی دور کی سوچی تھی، اس کا اسکول تھوڑے ہی دنوں میں بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس نے شادی بھی کر لی (۱۸۶۳) اور شادی سے پہلے اس نے ”گھر کے سکھ“ کے عنوان سے جو ناول لکھا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی طبیعت

پھر ناول نویسی کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ یہ ناول بڑے شوق سے لکھا گیا، ازدواجی زندگی پر شاید اس سے زیادہ پاکیزہ کوئی تصنیف نہیں اور عشق اور محبت کا پردہ اٹھا کر نباء اور نباء ہنس کی خواہش کے پیدا کیے ہوئے سکون کا جو منظر دکھایا گیا ہو اس سے بہتر از دنیا زندگی کی شرح تفسیر بھی مشکل سے ملے گی۔

اسی سکون کی بدولت تالستانی کو بلند پروازی کا حوصلہ ہوا اور کچھ دنوں پر تولنے کے بعد اس نے ”جنگ اور صلح“ لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول قصے کی حد سے گزر کر قومی زندگی کی ایک تصویر ہو گئی ہے اور تصویر بھی ایسی جو قومی معاشرت اور حالات کے جو کھٹے میں نہیں ساتی بلکہ تاریخ اور بڑی تاریخی تحریکوں کے وسیع پس منظر میں ہی ٹھیک دکھی جاسکتی ہے۔ تالستانی نے توجہ صرف روسی زندگی پر کی ہے، لیکن انسانی طبیعت کی وہ خصوصیتیں بھی واضح کر دی ہیں جو تاریخ کے بہاؤ کو ذرا سا ادھر یا ادھر موڑ کر عام انسانی زندگی کو کچھ نہ کچھ بدل دیتی ہیں اور اس طرح وہ فرق جو قومی معاشرت اور عادات انسانوں میں پیدا کرتی ہیں مٹا کر انسانی نے روسی اور عام یورپی بلکہ انسانی زندگی کے جوڑ ملا دیے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے لیے تالستانی نے اپنا قلم موٹا نہیں کیا، سیرتوں کے ہجوم میں ہر ایک کو اس دیدہ ریزی اور صفائی سے بنایا ہے گویا وہی ناول کی مرکزی سیرت ہے

اور خاندانوں اور افراد کی روزمرہ زندگی کے باریک نقشوں سے قومی زندگی کی ایک جیتی جاگتی کتھا مرتب کی ہے۔

”جنگ اور صلح“ کا زمانہ انیسویں صدی کے پہلے بیس پچیس سال ہیں۔ شروع میں روسی سوسائٹی اور اخلاق کی پسٹی اور کھوکھلے پن کا منظر دکھایا گیا ہے، پھر ہم سیاست اور جنگ کے میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور آؤسٹرلٹز کی لڑائی کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امن کا ایک مختصر سا دور آتا ہے جب وہ جذبات اور حوصلے جو جنگ نے بیدار کیے ہیں روسی زندگی میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ خیال ہوتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے اور وہ اٹھان جو ہم نے آؤسٹرلٹز کی لڑائی کے زمانے میں دیکھا تھا موج کا اٹھان نہ تھا کہ اپنے بعد دوسری موجوں کے لیے سامان کرتا بلکہ دریا کا کنارہ تھا کہ کٹ کر گرا تھا اور دریا کے خاموش بہاؤ میں چند لمحوں کے ہیجان کے سوا کچھ پیدا نہ کر سکا۔ لیکن روس اور پولین کے درمیان پھر لڑائی چھڑ جاتی ہے اور اب روس ہی میدان جنگ ہے۔ پولین سرحد کے قریب روسیوں کو پس پا کر کے روس کے اندر گھستا چلا آتا ہے، ماسکو کے پاس پورودنوس کے مقام پر پھر لڑائی ہوتی ہے اور پولین ماسکو پر قبضہ کر لیتا ہے۔ روسی ماسکو خالی کر دیتے ہیں اور صلح کی درخواست نہیں کرتے۔ اسی سے پولین کی تدبیر الٹ جاتی ہے

اور اس کی فوج والہی کے وقت سردی اور برف کے طوفانوں اور بھوک کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے۔ روس میں پولین کی لشکر کشی اور لہس پائی قومی حوصلہ مندی کے بیج بوجاتی ہے، قومی خطرے نے ہمدردی اور اتحاد عمل اور ایثار کا جو جوش پیدا کیا تھا وہ چند حکاموں میں خدمت اور قومی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کا ایسا شوق ڈال جاتا ہے کہ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب خود غرضی، پست ہمتی اور سزا کا خوف روسی زندگی کے بہاؤ کو روک کر دریا کو گندے پانی کا تالاب نہ بنا دے گا، بلکہ دریا اپنے لیے نئے رستے نکالے گا اور ادھر ادھر سے چشمے آکر اس میں گریں گے اور اس کے زور کو بڑھاتے نہیں گے۔

مورخ زندگی کے مدوجزر سے غافل نہیں ہوتے، لیکن شخصی زندگی کی تفصیلات ان کی نظر میں نہیں ہوتیں، وہ بچوں کو جوان، جوانوں کو بوڑھا ہوتے نہیں دیکھتے، ان کے کان حاد ثلوی کے شور سے گونج جاتے ہیں، وہ دلوں کی دھڑکن نہیں سن سکتے۔ ناول نویس بھی ان واقعات اور تحریکوں کو اصولاً نظر انداز نہیں کر سکتے جن کا اثر شخصی زندگی پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن ان کے ذہن کو ایسی وسعت کم نصیب ہوتی ہے کہ ایک قوم کی قوم اور زمانے کا زمانہ اس کے اندر سما جائے، ان کے تخیل میں اتنی ہمت کم ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار انفرادی سیرتوں

کے بدلتے رنگوں کو دیکھیں اور ان کی جھلجھل سے ایک بدلتا ہوا اجتماعی رنگ بھی پیدا کریں۔ تالستانی "جنگ اور صلح" میں مورخ بھی ہے اور ناول نویس بھی، تاریخ کے فلسفے پر بحث کرتا ہے اور ایک زمانے کی تحریکوں اور واقعات سے اپنے نظریوں کو ثابت بھی کرتا ہے، دوسری طرف وہ روسی زندگی کو ناول نویس کی نظروں سے دیکھتا ہے، ایک نسل کے جو سن کو پہنچ چکی ہے چند مثالی مٹونے پیش کر کے وہ نئی پود کو ہنستے کھیلے دکھاتا ہے، اس نئی پود میں پھر آہستہ آہستہ قدرتی پردوں کو ہٹا کر شعور اور شخصیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، وہ اپنے ماحول اور ابدی اور موروثی مسائل سے دوچار ہوتی ہے، ایک نئی نسل کی پرورش کا ذمہ اپنے اوپر لیتی ہے اور آخر میں ہمیں دکھایا گیا ہے کہ بچے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں اور اس طرح ایک نسل کے حوصلے دوسری تک پہنچتے ہیں۔ روسیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی سیرتیں بھی بیان کی جاتی ہیں اگر سوانہولین اور دوا ایک اور ممتاز لوگوں کے، کہ جن کا ذکر تاریخ کے سلسلے میں آیا ہے اور جن کی سیرتیں پیش کرتے ہوئے تالستانی اپنے آپ کو مورخ تصور کرتا تھا نہ کہ ناول نویس، ہمیں کسی سیرت پر شبہ نہیں ہوتا کہ یہ گھڑی ہوئی ہے اور اس میں اصلیت کا رنگ روپ نہیں۔

"جنگ و صلح" کے آخری حصے میں خاص طور پر تاریخی بحث

پوری شیطان کی آنت بن جاتی ہو اور بڑی اکھن پیدا کرتی ہو، اس لیے کہ تاستائی نے اپنے نظریوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی بات بار بار دہرائی ہو۔ مگر یہ تاریخی بحث اصل قصے سے جدا چیز ہو اور جسے تاریخ سے دل چسپی نہیں وہ اسے بڑی آسانی سے نظر انداز کر سکتا ہو۔ تو رگینف کے اس اعتراض کا جواب البتہ ذرا مشکل سے دیا جاسکتا ہو کہ ”جنگ و صلح“ میں دراصل ارتقا اور نشو و نما کا کوئی پہلو نہیں، ارادے کی کم زوری اور جذبات کی ادا پٹی کی ایک مستقل کیفیت دکھائی گئی ہو۔ روسی نقاد بھی عام طور پر ناول نویسوں سے اسی کی شکایت کرتے رہے ہیں کہ وہ انفرادی زندگی کی رنگارنگی دکھا کر رہ جاتے ہیں، اجتماعی زندگی کو ایک قدم آگے بڑھتے نہیں دکھاتے۔ خود تو رگینف پر بھی یہی اعتراض کیا جاسکتا ہو جو اس نے تاستائی پر کیا لیکن تاستائی اور اس کے ساتھ تمام حقیقت نگار مجبور تھے کہ جے جینی اور ٹرپ کی کیفیت دکھا کر خاموش ہو جائیں، اس لیے کہ آگے کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ تاستائی نے یہی بہت کیا کہ روگی معاشرت اور اخلاقی اور خالی دلوں کے ستائے لے فضا میں جو افسردگی پھیلائی تھی اسے بچوں کے کھیل کو اور بھولے جذبات کی انگڑائیوں سے کسی قدر زائل کیا اور نئی پود کی محبت دلوں میں اس طرح بٹھا دی کہ اس کا پروان چڑھنا ہی ترقی اور کامیابی کی صورت بن گئی۔

”جنگ اور صلح“ جیسے کارنامے کے بعد لازمی تھا کہ تاستائی پر

بے چینی کا ایک دور گزرے، جیسے شدید محنت کے بعد سُستی اور تھکن لازمی ہے۔ تالستانی کو بھرپور خیال ستانے لگا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے اور اسے جو کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہا ہے۔ اس نے عوام کے لیے ایک کہانی لکھنے پر چار برس صرف کیے، یونانی زبان کو سیکھنا شروع کیا اور یونانی ادب کے گن گن گئے۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح آزاد نہیں تھا کہ جو دھن سوار ہو اسی میں لگ جائے۔ اب اس کے بیوی بچے تھے۔ اس کی بیوی چاہتی تھی کہ وہ ناول لکھتا رہے اور زیادہ نام پیدا کرے۔ ”جنگ اور صلح“ کی تصنیف میں اس نے بڑی مدد کی تھی اور اسے خواہش تھی کہ اشتر اک عمل کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ پھر تالستانی کی بے چینی بھی غضب کی ہوتی تھی اور جن تبدیلیوں کا وہ ارادہ کرتا وہ بھی ایسی کہ زندگی کو جڑ سے اُکھاڑ دیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس زمانے میں اس کے ارادوں کا بیوی کی خواہشوں سے تصادم ہوا اور اسے اندیشہ ہونے لگا کہ بیوی اور ازدواجی زندگی اس کے اخلاقی ارتقا میں رکاوٹیں ڈالے گی۔ بعد کو اس اندیشے نے تالستانی کی خاندانی زندگی کو بالکل تروبالا کر دیا، لیکن اس وقت کی روحانی بے چینی یہ ظاہر کر چکے تھے کہ انے انقلاب کا مادہ اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ پھر کچھ دیر گئی اور تالستانی نے ”آنا کارینا“ اسی سکون کے دوران میں (۱۸۷۷ء - ۱۸۷۹ء) لکھا۔

سن ناول میں زندگی کی وہ وسعت نہیں دکھائی گئی ہے جو کہ

”جنگ اور صلح“ کی امتیازی خصوصیت ہے، اس کا موضوع چند افراد کی زندگیاں ہیں، لیکن تاستائی کی نظر وہی ہے کہ جس نے ”جنگ اور صلح“ کو ناول نویسی کا کرشمہ بنا دیا اور میدان کے محدود ہو جانے سے روٹھا جہاں پڑتی ہو تیز پڑتی ہے۔ اس ناول میں سیاست اور تاریخ سے بحث نہیں ہے، اخلاق سے ہے، مگر اس انداز سے کہ نہ تو انجام سے وہ بے تعلقی برتی گئی ہو جو رسم نے حقیقت نگار کے لیے لازمی بنا رکھی ہو اور نہ وہ نامعائنہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو جو تاستائی کی بعد کی تعانیف میں ملتا ہے۔ کسی کی زندگی بگڑتے دکھائی گئی ہو، کسی کی بخت، کسی کو طبیعت اور عادات نے ایسا سخت کر دیا ہو کہ وہ نہ بگڑ سکتا ہو نہ بن سکتا ہو، کسی کی زندگی بس جینے میں ہو اور اسے اس کا احساس ہی نہیں کہ بگڑتا کیا ہو اور بنتا کیا ہو۔ لیکن صورتیں، سیرتیں، جذبات کے پلٹے، واقعات، تقریبیں۔ سبھی کے بیان کرنے میں تاستائی نے کہاں دکھایا ہو اور اس کا اخلاقی حس کبھی اسے چشم پوشی حقیقت کو صاف صاف دکھانے سے پرہیز کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ آخری حصہ باقی ناول کے مقابلے میں بے شک ذرا کم زور ہے، کیوں کہ اس وقت جب یہ لکھا گیا تاستائی پر ایک روحانی کیفیت طاری تھی جس نے اس کی طبیعت کو ناول نویسی سے ہٹا دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ پاپ کٹے۔ اس آخری حصے کا تعلق دراصل ناول کے حصے سے نہیں ہے بلکہ تاستائی کی اپنی زندگی

کے ایک نئے دور سے جو کہ اب شروع ہو گیا تھا۔

”آئنا کارینن“ کی مرکزی سیرتیں دو ہیں، ایک تو خود آئنا اور دوسرے لیون۔ لیون تالستائی کی اپنی سیرت کا عکس ہے، تالستائی نے اسے اپنی طرح بد صورت، جھپو، بے چین، سوسائٹی اور اس کے معیار سے غیر مطمئن اور ایک بہتر اصول زندگی دریافت کرنے کی فکر میں مبتلا دکھایا ہے۔ لیون کی سرگزشت کے بعض موقعے اور واقعات تالستائی کی اپنی زندگی سے لیے گئے ہیں، تالستائی کی طرح وہ بھی ہی تو رشتیوں کے خاندان سے مگر سرکاری ملازمت اور سوسائٹی میں شہرت حاصل کرنے کے حوصلے کو غلط سمجھتا کہ وہ زمینداری اور دیہات سدھار میں لگ جاتا ہے، تالستائی کی طرح وہ بھی تین بہنوں پر ایک ساتھ عاشق ہو جاتا ہے، بڑی بہن ڈولی آئنا کارینن کے بھائی سے بیاہ دی جاتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ منجھلی بہن ہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہوگی اور جب یہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اسے چھوٹی بہن کیٹی سے شادی کرنے کی دھن ہو جاتی ہے۔ لیون جب کیٹی سے پہلی مرتبہ اپنی دلی خواہش بیان کرتا ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس وقت ایک خوب صورت، خوش مذاق رئیس، کاؤنٹ ورونسکی سے رشتے کا امکان بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ ورونسکی خود اگرچہ سیر تفریح اور ناچ وغیرہ کی محفلوں میں کیٹی سے اپنا خاص تعلق سب پر ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ محبت کے ساتھ ازواجی

دندگی کی پابندیوں کو عاید کرنا ضروری نہیں سمجھنا اور کچی کو مایوسی
ہی نہ ہوتی بلکہ شاید ذلت بھی اُٹھانا پڑتی اگر آئنا کارین کے اچانک
منو دار ہونے سے خود وردنسل کی طبیعت پھر نہ جاتی۔

آئنا کارین ایک معزز سرکاری ملازم کی بیوی ہو، خوش خلتہ
ہمدردی رکھنے والی عورت ہو اور خود داری اور بے تکلفی، حیا اور
طنساری کے رنگ اس کی طبیعت میں اس طرح ملے ہیں کہ وہ نائنگی
اور بھولے بھالے حسن کا ایک مثالی نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے اپنی
قسمت سے یا اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں، پُر سکون گھر بیلو
دندگی اسے دل سے پسند ہو اور اس کے گھر کی رونق ایک بچہ بھی
ہر جس سے اسے اتنی محبت ہو جتنی کہ ماں ہی کو ہو سکتی ہے۔ لیکن
انسان کی طبیعت میں بگڑنے کے امکانات اسی طرح موجود رہتے ہیں
جیسے کہ تندرست جسم میں بیماریوں کے جراثیم۔ وردنسل سے ملاقات
ہوتی ہو اور تعلقات بڑھتے ہیں تو آئنا کی اخلاقی خوبیاں آہستہ
آہستہ ماند پڑنے لگتی ہیں۔ وردنسل کی محبت کے منہ پر سے پردہ
ہٹتا ہو تو شہوت کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہو اور یہ شہوت
کچھ ایسا منتر مارتی ہو کہ آئنا کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا،
اس کا ضمیر، اس کا اخلاقی حس بالکل فنا ہو جاتا ہو، اس کے معصوم
چہرے پر شہوت کی ہر لگ جاتی ہو اور وہ جدمصر جاتی ہو، جہاں
بیشکی ہو، اسی شہوت کی بوجھیل جاتی ہے۔ اب تو وردنسل کو جال میں

پہناتے رکھنے کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور اس کوشش میں اس کی صورت اور سیرت ان بے حیا عورتوں کی سی ہو جاتی ہے جو مجبوری سے پیٹ پالنے کے لیے نہیں بلکہ طبیعت اور عادت سے مردوں کو بچڑانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ رشک میں جلتی، درون کی کسے چھوڑ بھاگنے کے خوف میں گھبراتی رہتی ہے اور اپنی مستقل بے چینی اور درد کا علاج وہ مورفیہ (جوہر افیون) سے کرتی ہے۔ وحشت اور بے چینی آخر کو ایسی شدید ہو جاتی ہے کہ آتنا کہ اس کی تاب نہیں رہتی اور جب درون کی اسے چھوڑ کر ایک فوجی ہم پر چلا جاتا ہے تو وہ ایک مال گاڑی کے نیچے گر کر اپنی جان دے دیتی ہے۔

کسی کی طبیعت اس طرح رو گئی ہو جائے اور زندگی تباہ ہو تو دوسرے اس کے اثر سے بچے نہیں رہ سکتے۔ لیون، کئی اور کئی کی بڑی بہن ڈوڈلی، جو آتنا کی بھاوج ہے، سب آتنا کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر دنگ کر رہ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے سب سے زیادہ دکھ آتنا کے شوہر کارین اور اس کے لڑکے کو ہوتا ہے، جو ماں کی جہائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ کارین رد کھا پھیکا رسم اور قاعدے کی پرستش کرنے والا آدمی ہے، اس کی طبیعت میں ذرا مہی لوچ نہیں اور وہ انسانی ہمدردی اور شرافت جو گمراہوں کو بھی محبت کا سخن سمجھتی ہے، اس کے

قیاس میں نہیں آتی۔ کاریزمین پہلے اپنی بیوی کو ایک خاص رسمی اور خشک انداز سے نصیحت کرتا ہے، جب درون کی سے اس کا تعلق مشہور ہوتا ہے تو وہ آنا کو گھر میں آنے اور بچے کو دیکھنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور اس ضد میں آنا کو طلاق دینے سے انکار کرتا رہتا ہے کہ اگر اسے طلاق مل گئی تو وہ درون کی سے نکاح کر لے گی اور اس کی بد اخلاقی جیسی عیاں ہونی چاہیے، رہے گی۔ اس معاملے میں اور ہر دوسرے معاملے میں کاریزمین کا رویہ منطقی اور مردوجہ اخلاق کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، لیکن جب سینہ میں آدمی کا دل نہ ہو تو آدمی کی صورت اور ناصح کی منطق کام نہیں آتی۔ دکھ میں بھی کارنین کوئی ہمدردی حاصل نہیں کر پاتا اور آخر میں جب اس پر ایک طرح کی روحانیت طاری ہوتی ہے تو وہ خاصا مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔

آنا کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں قصور کس کا تھا؟ اس معاشرت کا جو اپنے آپ کو ناچ رنگ کی محفلوں سے سنوارتی اور آزاد خیالی کے چرچے سے ذہن اور دماغ کو چلا دیتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے، لیکن آنا ایسی کس اور بھولی نہ تھی کہ بہک جاتی اور اس کے مقابلے میں کئی کا معاشرتی عیبوں میں بھنس کر یا کسی کے دھوکے میں آکر ذلیل اور تباہ ہونا کہیں زیادہ آسان تھا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا ہزار اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے، مگر عورت کے لیے خود تاستائی کے خیال میں بھی اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا

کہ گھر ہو، بخوبی ہو اور اولاد ہو، وہ تمام چیزیں جو آئنا کو حاصل تھیں اور جنہیں وہ حد درجہ عزیز رکھتی تھی۔ پھر درون کی نہ دغا باز تھکانہ بدتمیشتی اس نے آئنا کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی، اسے کسی دھوکے میں نہیں ڈالا اور اسے آئنا سے جو محبت تھی اس سے زیادہ داستانوں میں بان ہو تو ہو، دنیا میں کم پائی جاتی ہے۔ تالستانی نے لیون کے لیے نو بہت اور نجات کا سامان اس طرح کیا کہ ایک کسان کے ذریعے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ آدمی کو اپنے واسطے نہیں، خدا کے واسطے زندگی رہنا چاہیے، آئنا کا معہ حل نہیں کیا۔ ہم چاہیں تو اس کی حقیقت نگاری کو عشق مجازی کی پردہ دری سمجھ سکتے ہیں اور عبرت کی ایک تصویر، چاہیں تو اسے درد کی ایک سچی کہانی سمجھ سکتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور وہ غفلت دور ہو جاتی ہے جو انسانیت کی سب سے مہلک بیماری ہے۔

تالستانی نے جب ”آئنا کا ریتن“ ختم کیا تو وہ شخصی اخلاق کے معنوں کو چھوڑ کر ان بنیادی اصولوں کی تلاش میں نکل گیا تھا کہ جن پر اجتماعی زندگی تعمیر کی جاسکے، امدیج تو یہ ہے کہ یہی اصول ان شخصی معنوں کو بھی حل کر سکتے ہیں کہ جن پر الگ الگ غور کیجیے تو در دسر اور بے چینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تالستانی حقیقت کی تلاش میں نکلا تو صبر اور استقلال اور ضبط کا وہ سامان جو ایسے لمبے سفر کے لیے درکار ہے اس کے پاس نہ تھا، مگر اس کا شوق ایسا سچا تھا کہ

بے سرو سامانی کے باوجود وہ بہت دور پہنچ گیا اور اس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ ہزار دشواریاں اور الجھنیں پھر اسے کھیدت کر بلندی سے پستی کی طرف نہ لاسکیں۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ علم جو فرد اور جماعت دونوں کی اخلاقی نشوونما کا ذریعہ نہ بن سکے جہالت سے بھی بدتر ہو اور وہ آزاد خیالی جو بصیرت دینے کی بجائے تنقید کے نشے میں مست کر کے نظر کو اور بہکا دے ایک روگ ہی کہ جسے دور کیے بغیر صحیح اخلاقی کا تصور قائم کرنا ناممکن ہوگا۔

”عقیدہ زندگی کی قوت ہو؟ انسان بغیر عقیدے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ زمانے میں انسان کے روحانی شعور نے جس طرح دینی تصورات مرتب کیے اور عقیدے نے زندگی کی پہیلیاں جس طرح بوجھی ہیں اسی میں نوع انسانی کا سب سے گہرا علم پایا جاتا ہے؟ اس خیال کی تکمیل ایک اور کیفیت نے کر دی۔ ہر بہار کا دن تھا اور میں اکیلا جنگل میں بیٹھا خاموشی پر کان لگائے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے پچھلے تین سال سے بے چین ہوں، خدا کی جستجو ہے، خوشی اور بیزاری کی دو حالتوں کے درمیان جھولتا رہتا ہوں.....

ایک بارگی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں زندہ تب ہی ہوتا ہوں جب مجھے خدا پر یقین ہوتا ہے... میرے گرد ہر چیز جاگ اٹھتی ہے، ہر چیز میں معنی اور مقصد نظر آنے لگتے ہیں..... خدا کو جانتا اور زندہ ہونا ایک ہی ہے“

مذبذب دینی کے اس تسلط نے ایک طرف تو تالستانی کو اس پر
 مجبور کیا کہ وہ اپنے عقیدے صاف صاف بیان کرے جس کے
 سبب سے اس کی روسی کلیسا سے لڑائی ہو گئی اور دوسری
 طرف اسے یورپ کے ادیبوں اور فزین لطیفہ کے قدر شناسوں سے
 بھڑا دیا۔ تالستانی انجیل کا مطالعہ، ماحول کا مشاہدہ اور اپنے
 دل سے جرح کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ حضرت علیؑ نے
 اخوت، مدم تشدد، ایثار اور سلمیٰ ہوئی پاکیزہ محنت مشقت کی
 زندگی کی تعلیم دی تھی کلیسائی نظام، اس کا ٹھکانہ، اس کی عبادت
 اور رسمیں بعد کے تصرفات ہیں جنہوں نے اصل تعلیم کی صورت بگاڑ دی
 ادھر ان لوگوں کے جواب میں جن کا خیال تھا کہ مذہب اور تہذیب
 کا ساتھ نہیں ہو سکتا، اور انسان اگر تہذیب کو چھوڑ دے تو ترقی
 کے تمام رستے بند ہو جاتے ہیں تالستانی نے کہا کہ مذہب اور
 عقیدہ اگرچہ اس محدود علمی عقل کے لیے مہلک ہے جو جرد کوکل
 اور حیوانی زندگی کو اصل زندگی ٹھہراتی ہے، لیکن وہ اس سچی عقل کی
 روشنی پھیلاتا ہے جو کائنات کے اندر مضمر ہے اور جس سے انسان کو
 بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ عقل عمل چاہتی ہے، اس کا عمل عشق ہے،
 جو انسان کو بے خودی سکھاتا ہے اور اپنی ذات کجس کی کوئی وقعت
 نہیں اس لیے کہ انسان کو اس پر اختیار نہیں، قربان کر کے ایک غیر
 محدود، دائمی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔

اس وقت سے تالستانی، سرکاری کلیسا اور ”روشن خیال“
 طبقے کے درمیان جو جنگ چھڑی وہ تالستانی کے مرتے دم تک
 جاری رہی۔ ہم یہاں پر مذہبی بحث میں حصہ نہیں لے سکتے، اگرچہ
 یہ موضوع بہت دل چسپ ہو اور ایک زمانے میں تالستانی کے
 جوش اور اس کے قلم کے زور نے سارے یورپ کو اس میں الجھا دیا
 تھا۔ ادب اور فن کے معیار پر جو بحث تالستانی نے چھیڑی وہ بھی
 کچھ کم دل چسپ اور بصیرت افزا نہیں، لیکن اسے مفصل بیان کرنے
 کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جائے تو بھی شاید کافی نہ ہوگی۔ تالستانی
 اب تک تو ادب اور انسانیت کی خدمت کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور
 ادب کے خلاف جو کچھ کہا تھا اس کا مقصد ادیبوں کو حقیقت شناسی
 کی طرف مائل کرنا تھا۔ ۱۸۸۲ میں اس نے مردم شماری میں حصہ لیا
 اور ماسکو کے غریب واٹروں میں اس نے افلاس، درد اور بے حسی
 کے جو منظر دیکھے انھوں نے اس کے دل کو تڑپا دیا اور یہ ناممکن
 ہو گیا کہ اس کے بعد وہ ادیب رہ سکے اور اب تک اس کی زندگی
 کی جو صورت تھی وہ قائم رہے۔ ”ہمیں کیا کرنا چاہیے“ کے عنوان
 سے اس نے جو کتاب لکھی وہ ایسی ہمہ گیر ہو اور ایسے گہرے خلوص
 اور شدید غم اور غصے کا پتہ دیتی ہے کہ جس کی مثال یورپی ادب میں
 نہیں ملتی اور جو اس کتاب کا رشتہ الہامی کتابوں سے جوڑتا ہے۔
 تالستانی نے پہلے غریب واٹروں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور

پھر اس کے اسباب پر بحث کر کے نتیجے نکالے ہیں جو صحیح تسلیم کر لیے جائیں اور ہدایت کا ذریعہ بنائے جائیں تو مذہبی، سیاسی اور معاشی نظام، علم، ادب، فن سب ہی کو مٹانا اور مٹا کر نئے سرے سے قائم کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ لیکن تالستانی کی بحث علمی اور عقلی نہیں ہے، اس نے ریاست کے ظلم، دولت مندوں کی خود غرضی اور علم اور تہذیب کے دھوکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور اس کی تلقین کی ہے کہ ظالموں اور گمراہ کرنے والوں سے قطع تعلق کیا جائے، غریبوں کی محنت سے فائدہ اٹھانا، ریاست کی خدمت کرنا بند کر دیا جائے، جسمانی محنت کو ایک اخلاقی فرض مانا جائے اور عدم تشدد کے ذریعے سے ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جائے جو سماجی زندگی میں ظلم اور خود غرضی پیدا کرتی ہیں اور قائم رکھتی ہیں۔ عدم تشدد کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں بلکہ ایثار سے کرنا چاہیے اور دنیا کا سارا دکھ درد اپنے اوپر لے کر اپنی زندگی کو مجسمہ صبر، محبت اور بے خودی بنا دینا چاہیے۔ یہ تعلیم ایسی ہے کہ اس پر عمل کرنے والا ہو تو یہ ہنایت دل افزور اور ہمت افزا بن سکتی ہے، لیکن اگر یہ باتوں اور بحثوں تک محدود رہے اور اس پر عمل کرنے والا بڑے پائے کی شخصیت نہ رکھتا ہو تو اس کا اثر بالکل اٹا ہوتا ہے اور لوگ متاثر ہونے کی بجائے محبت، صبر اور ایثار جیسے قابلِ قدر جذبات کی مہنی اٹاتے

لگتے ہیں۔ تالستائی کی شخصیت ناہم دار تھی، اس کا جوش زائد بھاپ کی طرح زبان اور قلم کے رستے سے نکل جایا کرتا تھا اور عمل کا وقت آتا تو وہ ایسی پس و پیش میں پڑ جاتا کہ جو اس کو مثل اور اس کے معتقدوں کو حیران کر دیتی تھی۔ گاندھی جی نے اگرچہ اپنے دل کا دیا تالستائی کی مشعل سے جلا یا، مگر اپنی خاص استعداد کے سبب سے وہ عمل میں اپنے استاد سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدے اور عمل ہی میں نہیں بلکہ عقیدے اور معمول میں ایسی سلا بقت پیدا کر لی کہ جو تالستائی کو نصیب نہ ہوئی۔

پھر تالستائی اپنی طبیعت کی افتاد اور اپنے خاص ذوق اور استعداد سے مجبور تھا کہ ایسی بحثیں چھیڑے جو دینی مصلح کے لیے بالکل ضمنی ہیں اور جن سے اسے جہاں تک ہو سکے بچنا چاہیے۔

”ہمیں کیا کرنا چاہیے“ اور ”آرٹ کیا ہے؟“ (۱۸۹۸ء) ان دونوں کتابوں میں تالستائی نے آرٹ کی ماہیت اور آرٹسٹ کے فرائض کو اپنے محبت، ایثار اور اخوت کے عقیدے کی روشنی میں دکھایا ہے اور یہ روشنی بڑی ہی بصیرت افروز ہے۔ ”آرٹ کیا ہے؟“ ہمیں کیا کرنا چاہیے“ کے تیرہ برس بعد لکھی گئی، اس میں تنقید زیادہ ہے اور اس میں تالستائی نے یورپی آرٹ کے مثالی نمونوں پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اکثر غلط اور بے جا ہیں۔ تالستائی کو دراصل یورپی ادب اور آرٹ سے اتنی واقفیت نہ تھی کہ وہ ان پر

معقول تنقید کر سکے اور اس بحث سے اس کا اصل مطلب واضح ہونے کی بجائے تفصیلات میں اور چھپ جاتا ہے۔ لیکن اس تنقیدی حصے کو نظر انداز کر کے تاستائی کی تعلیم کو دیکھیے تو اس میں نور ہی نور ہے۔ آرٹسٹ اور ادیب ان حقیقتوں اور اعلیٰ مقاصد کے سامنے سر نہ جھکائیں جن کا جلوہ تاستائی کی تعلیم میں نظر آتا ہے تو آپ سمجھیے کہ وہ شیطان ہیں اور ایسے غرور کے مجسمے جو کہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ انسانیت کا جوہر اس کی خود نمائی پر نثار کیا جائے۔

”اپنے آپ کو قربان کرنا اور دکھ سہنا بھیہ سچے مفکر اور ماہر فن کا حصہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا مقصد انسانیت کی بھلائی ہے۔ آدمی غم میں مبتلا ہوتے ہیں، مصیبتیں جھیلتے ہیں، مرتے ہیں، فراغت اور لطف اندوزی کی مہلت کے ملتی ہے۔ مفکر اور ماہر فن آسمان کی بلندیوں پر بھنگتا نہیں پھرتا۔۔۔ وہ ہمیشہ حوصلوں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے، اس کا دل بے چین رہتا ہے۔ اس کا فرض منصبی یہ طے کرنا اور بتانا ہے کہ انسان کی فلاح کا رہے میں ہے، اسے مصیبت سے نجات کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے مگر وہ ابھی تک کچھ طے نہیں کر پایا ہے، کچھ بتائیں سکا ہے اور کل تک شاید بہت دیر ہو جائے اور وہ مر جائے۔۔۔۔۔

مفکر اور ماہر فن وہ ہے جو خوش ہوتا اگر اسے سوچنا نہ پڑتا اور دل میں جو بات بیٹھ گئی ہو اسے بیان نہ کرنا پڑتا مگر وہ اپنے آپ کو اس سے روک نہیں سکتا، اس لیے کہ دو پوشیدہ قوتیں اسے اس پر

مجبور کرتی ہیں: ایک تو اس کا اپنا شوق اور دوسرے اس کی انسانی ہمدردی۔ فن کے سچے شیدائی جو سیر اور لطف اندوزی کی طرف مایل اور اپنے آپ سے مطمئن ہوں، ڈھونڈھے بھی نہ ملیں گے، (”نہیں کیا کرنا چاہیے؟“)

مفکر اور ماہر فن کا یہ خاکہ نالستانی نے اس وقت بنایا جب ماسکو کے غریب دائروں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور یہ خاکہ آخر وقت تک اس کے ذہن میں محفوظ رہا۔ یہ نصب العین اسے بے حد غزنہ بھی تھا اور اسے بڑا صدمہ ہوتا اگر لوگ اس پر تنقید یا اعتراض کرتے۔ ”آرٹ کیا ہے؟“ ان اعتراضات کا ایک جوشیلا جواب ہے، اس میں ”نالستانی“ نے اپنے زمانے کے آرٹ کے شیدائیوں پر حملہ کیا، ان کے بتوں کو توڑا، ان کے احساسات کو پامال کیا، ان کے عقیدوں کا مذاق اڑایا، ان پر یہ الزام دھڑکا کہ وہ اپنی ایک، الگ، ذات بنائے ہیں اور اپنی بہت دل چسپیوں اور گہرے ہوئے مذاق کو معیار قرار دیے بیٹھے ہیں۔ عام خیال کے خلاف اس نے یہ دعویٰ کیا کہ آرٹ کسی طرح محدود نہیں اور اس کا دار و مدار خاص استعداد پر نہیں۔ ”آرٹ ہر جائی ہے۔“ ”آرٹ ہماری ساری زندگی میں سما یا ہوا ہے۔ ہم جسے آرٹ کہتے ہیں ایسی ٹھیکسٹر، کونسٹرٹ، کتابیں اور تصویروں وغیرہ کی نمائشیں، یہ آرٹ کا بہت ہی حقیر حصہ ہے۔ ہماری زندگی طرح طرح کے فنی الباموں سے

بھری ہوتی ہے، چاہے آپ بچوں کے کھیل کو دیکھیے، چاہے مذہبی رسموں کو۔ آرٹ اور بولی انسانی ترقی کے ذریعے ہیں، ایک دلوں کو ملاتا ہے، دوسرے خیالات کو۔ جب ان میں سے کسی میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی روگی ہو گئی ہے۔ ہمارے زمانے کا آرٹ غلط اور جھوٹا ہے۔

آرٹ کا میدان اتنا وسیع ہے تو اس کا صحیح مظہر وہی جذبات ہو سکتے ہیں جو انسان کی سرشت میں ازل سے موجود ہوں اور اس کا صحیح مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ سچے اخلاق کو فروغ دے کہ وہ معاشرتی اور ذہنی فتنہ پیدا کرے کہ جس میں انسانیت کے جوہر گھلیں، افراد میں جماعت کی بھلائی کا احساس بڑھے، مختلف جماعتوں اور ملتوں میں ربط اور اتحاد قائم ہو۔ ہر جماعت کا ایک مخصوص تصور حیات ہوتا ہے جس کی بنیاد اس کا دین ہوتا ہے، آرٹ کو چاہیے کہ دین کا خادم ہو اور اس مخصوص تصور حیات کا آئینہ۔ مثلاً عیسائی مذہب کی امتیازی صفت ایثار اور اخوت ہے، اس لیے عیسائیوں کے واسطے وہی آرٹ قابل قدر ہے جو اخوت اور ایثار کے جذبے کو چمکانے اور ان کی تکمیل کی آرزو کو یہاں تک بڑھائے کہ وہ پوری ہو جائے۔ ”آنا کارنین“ کے بعد تالسائی نے جو انسانے اور نادل اور ڈرامے لکھے ان میں آرٹ کا یہ نیا مقصد جو اس کے ذہن پر حادی ہو گیا تھا اپنا رنگ دکھاتا رہا۔

”عوام کی کہانیاں“، ”عوام کی داستانیں“، ”اودان ایلچ کی موت“
 ”باطل کی قوت“، ”کراٹر سونٹا“، ”آقا اور غلام“ اور ”نئی زندگی“
 موضوع کے اعتبار سے اتنے مختلف اور فنی نقطہ نظر سے اتنے کامیاب
 کا رنامے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اور کوئی نہیں تو تالیفی
 خود تو اپنے معیار پر پورا اتر سکتا تھا۔

عوام کی کہانیوں میں سے زیادہ تالیفات نے کانون اور
 داستان گوؤں کی زبانی سنیں، چننا اس خاص طرز میں اس کی اپنی
 تصنیف کہی جاسکتی ہیں۔ ان سب میں ایسی سادگی اور ہموازی ہے،
 خالص ادبی خوبیوں سے ایسا تغافل برتا گیا ہے کہ وہ ادب سے
 ایک برتر چیز بن گئی ہیں اور ان میں نصیحت بھی کی گئی ہے تو ایسے پیرائے
 میں اور ایسی ظاہری بے پروائی سے کہ درسی بات جو لوگ سمجھتے ہیں کہ
 ادب لطیف میں کبھی نہیں یہاں زیور کا نگینہ، حسن کی خاص ادا
 بن گئی ہے۔ ”آدمی کو کتنی زمین چاہیے“ اور ”تین بوڑھے“ تو ایسے
 قصے ہیں کہ جنہیں ایک بار پڑھ لیجیے تو ساری عمر یاد رہیں اور اس
 وجہ سے یاد رہیں کہ ان میں جو نصیحت کی گئی ہے وہ خود بخود دل پر
 نقش ہو جاتی ہے۔ ”آقا اور غلام“ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا افسانہ ہے،
 اگرچہ اس میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس
 خیال سے تالیفی نے اپنے ابتدائی زمانے کے ایک افسانے ”برن
 کے طوفان“ کا ایک حصہ پس منظر کے طور پر رکھا ہے۔

”ادان اپٹچ کی موت“ ایک ایسے آدمی کے انجام کا نقشہ ہے جو اپنی زندگی، معمول، خیالات کے لحاظ سے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو یورپ میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ادان اپٹچ ایک ایمان داری سے کام کرے، عام قاعدے کے مطابق زندگی بسر کرنے والا سرکاری ملازم ہے۔ اس کے دل میں اپنی ترقی کے سوا کوئی حوصلہ نہیں، اس کے اخلاق اور عادات کی ابتدا اور انتہا یہ ہے کہ اپنے جیسوں میں اچھا سمجھا جائے، وہی مانتے جو سب مانتے ہوں، وہی کہے جو سب کہتے ہوں، پابندی سے کام کرے، عام دل چسپیوں میں شریک ہو، کبھی ناچ لے، کبھی تاش کھیل لے۔ جب تک وہ اپنے معمول پر چل سکا اسے اپنے اندر کوئی خامی، اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب وہ بیٹھنے کے کمرے میں پردہ لگانے وقت گر پڑا، بیماری نے اس کے معمول کو چھڑا دیا اور درد کے دورے اسے دوا اور تسکین کے لیے تڑپانے لگے تو اسے ایک بارگی معلوم ہوا کہ اس کا کوئی سہارا نہیں۔ جان پہچان والے اسے بھول گئے، بیوی یہ تاڑ گئی کہ اب وہ بچنے والا نہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے انتظام کرنے لگی، بڑی لڑکی نادی کی فکر میں پڑ گئی۔ ان سب کی سرد مہری اور خود غرضی نے ادان اپٹچ کو ان سے بیزار کر دیا، لیکن ایک مدت تک اسے نہ تکلیف نے چھوڑا نہ موت نے اپنے دامن میں پناہ دی، اس کے دل کا کسی عقیدے پر تکیہ نہ تھا، اس کا جذبہ دینی ایسا معطل ہو گیا

تھا کہ اس نے دائمی حیات کی وہ جھلک کبھی نہ دیکھی تھی جو ایک زندگی کے خاتمے کو دوسری کی ابتدا بنا دیتی ہو اور اس لیے وہ ٹڑپا اور کراہتا رہا۔ موت بے شک آئی اور تسلی ساتھ لائی، مگر اسی وقت جب بے عقیدہ، بے مقصد زندگی کے عبرت ناک انجام کی ہیبت طرح طرح سے دل میں بٹھائی جا چکی تھی۔

اخلاقی اور روحانی بے مایگی یا کج روی کی پردہ دری کے لیے موت کا آنا ہی ضروری نہیں، عام زندگی میں بہترے ایسے موقع اور واقعات پیش آتے ہیں کہ جن سے سبق لیا جاسکتا ہو۔ اوان ایٹج ساری عمر گزار چکا تھا جب ایک حادثے نے دنیا سے اس کا رشتہ توڑا اور عادت اور رسم کی غلامی اور خدا کی بندگی کے درمیان جو فرق ہے اس پر آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ ”کرائسٹر سوناٹا“ میں تالستانی نے خود اس رسم رواج اور اس تربیت پر حملہ کیا ہے جو بلوغ کے زمانے سے ہی انسان کو غلط رستے پر لگا دیتی ہے اور اس معاشرت کی قلعی کھولی ہے جو ایک ناپاک جذبے کو لطف و محبت کی خوشبو میں بسا کر اور ازدواجی زندگی کی سنہری ہتکڑیاں پہنا کر اپنا اور قدرت کا کام نکالنا چاہتی ہے۔ کرائسٹر سوناٹا یورپ کے سب سے بڑے ماہر موسیقی بیٹھوون کی ایک تصنیف ہے جسے تالستانی نے ایک زمانے میں سنا تھا اور شاید اسے یہ شہوانی جذبات کے لیے شتمل انگیز معلوم ہوئی، اگرچہ دوسروں پر اس کا یہ اثر نہیں ہوتا اور ہمیں یہیں پر کہہ دینا چاہیے کہ بیٹھوون جیسے پاکیزہ نفس آرٹسٹ کا نام اس

طرح سے اس بحث میں اُبھادینا جو تالستانی نے اپنے افسانے میں چھپری صریحی زیادتی ہے۔ غالباً تالستانی کا مقصد یہ جتان تھا کہ یورپی تہذیب کے نیک اور پاک لوگ بھی ان رسموں کی تائید کرنے اور ان کو اپنے نام کا سہارا دینے میں شریک ہیں جنہیں اس نے سچے اخلاق کے لیے مہلک پایا۔ پھر بھی بیٹھون کا اس سلسلے میں ذکر نہ آنا چاہیے تھا۔

”کرائسٹ سوناٹا“ کا قصہ ایک مجرم پوزدنی شیف کی زبانی بیان کیا جاتا ہے جو دس برس قید کی سزا بھگت چکا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی بیوی اور اس کے دوست پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پوزدنی شیف قصہ اس وقت سے شروع کرتا ہے جب وہ نوجوان تھا، خوش حال تھا اور بہت سی مائیں چاہتی تھیں کہ اسے اپنا داماد بنائیں۔ ایک خاندان کی عورتیں ذرا زیادہ ہشیار تھیں، انھوں نے گفتگو اور سنہنی مذاق کے ذریعے طرح طرح سے پوزدنی شیف کو ایک خاص لڑکی کی طرف متوجہ کیا، اس کے موقع نکالے کہ دونوں کا ساتھ ہو، لڑکی کا لباس ایسا تھا اور طریقہ ایسا کہ جنسی رغبت پیدا ہو اور آخر میں یہ سازشیں کامیاب ہوئیں، یعنی پوزدنی شیف نے لڑکی سے نکاح کر لیا۔ لڑکی والے مطمئن ہو گئے کہ بیٹی ٹھکانے لگ گئی، لڑکی آپ بھی خوش تھی، لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے لیے اس کے شوہر میں شہوانیت کی جو آگ بھڑکائی گئی ہے وہ کسی طرح بجھائے نہ بجھے گی۔ اس نے شادی سے پہلے لگاوٹ کی تھی تو یہ سمجھ کر کہ قاعدہ یہی ہے، اس کی

لگاؤٹ انسانی تھی، حیوانی نہ تھی، لیکن پوزونی شفت کی طبیعت ایسی نہ تھی کہ اس آٹھکھ مچھلے میں اسے مزہ آئے، اس زمانے میں اس کے احساسات کچھ بھی ہوں، اپنی داستان بیان کرتے وقت تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے شروع سے دیکھا کہ میرے جنسی جذبات کو اُکسایا اور ایک خاص لڑکی کی طرف مائل کیا جا رہا ہے، لڑکی کا لباس اور انداز ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی اس میں شریک ہے۔ شادی ہو جانے پر لڑکی سمجھی کہ مطلب پورا ہو گیا ہے، اب تعلقات کارنگ بدلتا چاہیے، پوزونی شفت کے لیے شادی بیاہ نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے رسمی پردہ تھا اور وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے علاوہ ازدواجی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔ پوزونی شفت کی بیوی بہت جلد تعلقات کے اس ڈھنگ سے بیزار ہو گئی، اسے اس کی تمنا ہوئی کہ کوئی اسے انسان بھی مانے۔ موسیقی کا اسے پہلے بھی شوق تھا۔ اب وہ اس طرف زیادہ توجہ کرنے لگی اور اسی سلسلے میں اس کی ایک واپسین بچانے والے سے دوستی ہو گئی جو اس کی انسانیت کی بھی قدر کر سکتا تھا۔ دراصل اس کی دوستی جنسی خواہشوں سے بالکل پاک تھی، لیکن پوزونی شفت کو اب یقین ہو گیا تھا کہ مرد و عورت کا میل جول صرف انھیں خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ہو سکتا ہے، اور ایک نام کو جب وہ گھر آیا اور اپنی بیوی اور اس کے دوست کو کراٹر سوتا دیکھا تو اس نے الٹی پر حملہ کر کے دونوں کے کاری زخم لگانے اور اس طرح خستے کو ختم کیا۔

یورپی لباس، گفتگو اور میل جول کے قاعدوں پر تائیدی پہلے بھی
 اعتراض کر چکا تھا، اس افسانے میں اس نے یورپی معاشرت کے جسم پر
 لاج رکھ لینے کو ایک جیتھرا بھی نہ چھوڑا اور اسے پڑھنے کے بعد آدمی
 کی کئی دن تک ہر شخص اور ہر چیز پر نہ نظر آتی ہے۔ تائیدی کے اعتراضوں
 کو غلط ٹھہراتے اور پوزونی شفت کی ذہنیت کو ایک شخصی روگ سمجھے
 تو ”کرائسٹر سوناٹا“ ایک بہت اچھا افسانہ ہے اور وہ دل کو صاف اور
 محبت کو پاک رکھنے کی خواہش بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس پر خاص
 اخلاقی نقطہ نظر سے غور کیجیے تو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ تائیدی کی تنقید
 عدل اعتدال سے گزر گئی ہے اور اس نے اپنے اوپر ایسی تعلیم دینے کا ذمہ
 لے لیا ہے جو انسانی سرشت کو بالکل بدل دے گی اور نسل کی بقا کے
 لیے کوئی ایسی ترکیب بتائے گی کہ جو نفس سے کوئی دور کا رشتہ نہ رکھتی
 ہو، یا پھر انسانوں کو اس پر راضی کرے گی کہ وہ پیدائش کا سلسلہ بند
 کر دیں۔ چنانچہ جب تائیدی پر اعتراضات کی بوچھاڑ بہت پڑی
 تو اس نے افسانے کا ایک تہہ بھی شایع کیا جس میں اس نے یہ تسلیم کیا کہ
 ”کرائسٹر سوناٹا“ کی اخلاقی محنت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسل انسانی کو
 شہوت سے پاک ہونے کے لیے افزائش نسل کا سلسلہ بند کر دینا چاہیے
 اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ نتیجہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے مطابق ہے اور نسل
 انسانی کے لیے بقا کوئی ایسی نعمت نہیں کہ جس کی خاطر اخلاقی گمراہی
 گوارا کی جائے۔ لیکن یہ تو منطقی ہے کہ اس کے گھر تک پہنچا نہ گیا۔ اس سے

اخلاق کی کوئی گتھی نہیں سلجھتی اور قانونِ قدرت اور انسانی فطرت کے یہ تعلیم اس قدر خلاف ہے کہ وہ کبھی صحیح مافی نہیں جاسکتی۔

شہوانی جذبات کی ستم شکاری تالستانی کے ایک ڈراما ”بطل کی قوت“ اور ایک ناول ”بازخاست“ کا بھی موضوع ہے۔ ”بطل کی قوت“ کا قصہ وہ ہے جو تقریباً ہر روز اخباروں میں بیان ہوتا ہے: فلاں کافلاں کی بیوی سے ناجائز تعلق ہو گیا عورت بڑی پدمعاش تھی، اس نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا اور اپنے بچے کو مار ڈالا۔ تالستانی نے صرف یہ جدت کی ہے کہ مجرم باپ کے کہنے سے بچوں کے سامنے اپنے جرم قبول دیتا ہے اور سزاگاہ کے دھبوں کو دھو کر دل میں صفائی پیدا کرتی ہے شاید اس خیال سے کہ ڈراما دیہاتیوں کو دکھایا جائے گا تالستانی نے دیکھنے والوں کے تخیل پر قہقہے کا جوڑ ملانے اور گفتگو یا کیفیت سے ایسے واقعے کا پتہ چلانے کا بار نہیں ڈالا ہے جو اسٹیج پر دکھایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے سچے بھی اسٹیج پر مارا جاتا ہے، جو کہ بہت ہی کریمہ منظر ہے۔

”بازخاست“ کے آخری حصے میں انجیل کی آیتیں ہر خیال اور ہر کیفیت کی سند کے طور پر شامل کر دی گئی ہیں جن کی بدولت وہ ایک عیسائی ناول معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس میں اور تالستانی کے کے پچھلے ناولوں میں اصولِ ادب کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور وہ ہر طرح سے ناول نویسی کی ایک شاہ کار ہے۔ بے شک اس کا

مقصد اخلاقی نصیحت اور اصلاح ہی اور یہ صاف ہو جاتا ہے کہ مصنف کا ارادہ ہی کہ یہ ثابت کرے کہ شہوت "ایک ڈراؤنا جانور ہے جو انسان کے اندر رہتا ہے اور کبھی اسے چھوڑتا نہیں، جو اس وقت اور بھی زیادہ ہیبت ناک ہو جاتا ہے جب وہ اپنی صورت نہیں دکھاتا، جب وہ ایک شاعرانہ بھیس میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے۔" تالستانی اسے کسی میدانوں میں اپنا ناپاک کام کرتے اور طبیعتوں کو روگی اور زندگی کو گندہ کرنے دکھاتا ہے، مہذب محفلوں کے طور طریق اور پول جال میں، اس ملازمہ کی سرگزشت میں جو گھر سے بے عصمت ہو کر نکلتی ہے اور بازار میں جا بیٹھتی ہے، ان لوگوں کے دلوں میں جو اس بے چارے کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں اور ہتھوکتے ہیں، جو اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولیس اور عدالت کے حوالے کرتے ہیں، مجرموں کی دنیا میں، انقلابیوں کے گرد ہوں میں۔ اس طرح اگرچہ تالستانی کو کہنا بس یہ ہے کہ نفس کے پھندوں سے بچے رہو اور گناہوں سے توبہ کرو، کہ سچی مسرت اور خدا کی رضا مندی اسی میں ہے، اس نے اپنی بات ذہن نشین کرنے کے لیے ساری دنیا کا کاروبار نظروں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور کبھی اشارے، کبھی بحث، کبھی تلقین اور لطیفے سے اپنا مطلب واضح کیا ہے۔ انقلابیوں کی کارروائیاں اور چال ڈھال، مجرم اور جیل خانے، یہ تالستانی کے لیے نئے مضمون تھے، لیکن سوائے انقلاب کے کہ جس سے اس کو تپتی

مداوت تھی، اس نے یہ نئے مضمون خوب ہی برتے ہیں۔

”ہمیں کیا کرنا چاہیے“ لکھنے اور مذہبی بحثیں چھیڑنے کے بعد تالستانی

کو خالص ادبی تصانیف کے لیے بہت کم مہلت ملتی تھی اور اگر ادبی

شوق اس کی رگ دلی میں نہ ہوتا تو شاید آئنا کارنیں“ کے بعد کوئی

ناول یا افسانہ تک لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ آخر میں نو یہ ہوا بھی کہ اس

کی اصلاحی کوششوں اور عدم تشدد کی تعلیم نے انگلستان کی پارلیمنٹ

اور پیرس کی رنگینی کی طرح تالستانی کی روحانیت کو ایک چنبر بنا دیا

جس پر تعجب کرنے کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور سوالات اور

مباحثوں کی بھرمار نے ایک طرف اور سیاسی مسائل نے دوسری طرف

تالستانی کو ایسا مبتلا اور مصروف رکھا کہ وہ بس انھیں کاہور ہا۔ معلوم

ہنیں اس سے انسانیت گھٹائے میں رہی یا فائدے میں۔ یورپ

کے چند حساس اور برگزیدہ لوگوں پر تو اس کی فنی، اخلاقی اور دینی

تعلیم کا بہت گہرا اثر ہوا، مگر عدم تشدد کی تعلیم ایسی تھی کہ جس کو عملاً

صحیح ثابت کرنا تالستانی کے بس کی بات نہ تھی اور سچی عیسائی زندگی

کا جو معیار اس نے قائم کیا تھا اس کا نباہ خود اس کے لیے قریب قریب

ناممکن تھا۔ پھر تالستانی ایسا قدامت پسند تھا اور لبرل اور انقلابی

تحریک کی اس نے ایسی سختی سے مخالفت کی کہ انھیں جو شیلے اور کار

پرداز لوگوں کی طبیعتیں اس سے پھر گئیں جن پر اسے دراصل بھروسہ

کرنا چاہیے تھا۔ تالستانی ادب ہی کو اپنا میدان عمل سمجھتا تو شاید یہ

عداوت پیدا نہ ہوتی اور اس کی ادبی عظمت اس کی تداست پسندی اور نصیحت کے شوق پر احترام کا پردہ ڈال دیتی۔

تالستائی کی زندگی کا سب سے افسوس ناک پہلو وہ خاندانی کشمکش ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ عقیدے کے مطابق رہن سہن بدلنے کی خواہش پہلے تو تالستائی کی اپنی روحانی کیفیت کا عکس تھا، لیکن ہوتے ہوتے یہ ایک ایسا فرض بن گیا کہ جسے تالستائی انجام نہ دیتا تو دنیا میں اس کی منہسی اڑائی جاتی۔ مگر اس کی بیوی اور اولاد پر اس کے خیالات کا آخر تک کوئی خاص اثر نہ ہوا، وہ اپنی پُرانی وضع پر قائم رہے اور تالستائی کی بیوی خاص کوشش کرتی رہی کہ وہ بھی پُرانی وضع کو نہ چھوڑے۔ اس وجہ سے اکثر ایسے موقعے پیدا ہوتے رہے جن سے تالستائی کو صدمہ بھی پہنچتا اور تداست بھی ہوتی۔ مرنے سے چند روز پہلے تالستائی نے اپنی بیوی کے نام خط لکھ کر رکھ دیا اور چپکے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔ سفر کے دوران ہی میں اسے بخار آیا اور ایک جھوٹے سے اسٹیشن کے مسافر خانے میں اس کا انتقال ہوا۔ عقیدے پر عمل کرنے کی آزادی کا یہ مظاہرہ جو اس نے گھر والوں کے خلاف کیا ایک لمبی اور عبرت انگیز کشمکش پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی۔

نواں باب دسے ولود میخانکو وچ کارشن

(۱۸۵۵-۱۸۸۸)

کارشن اپنے خاندان، تربیت، تعلیم اور طبیعت کے لحاظ سے اپنے زمانے کے خوش حال روسیوں کا ایک مثالی نمونہ تھا، مگر مزاج کی چند خصوصیتوں نے اس کی زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ان خفیف مسرتوں اور اس ذرا سے سکون سے بھی محروم رہا جو مایوسی اور ندامت کے اس دور میں تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں کو کبھی کبھی نصیب ہو جاتا تھا۔ ابھی اس کی تعلیم ختم ہوئی نہیں تھی کہ ترکی اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی (۱۸۷۶) اور کارشن ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اگست ۱۸۷۷ میں وہ ایک معرکے میں زخمی ہوا اور چار دن تک ایک مردہ ترک کے پہلو میں پڑا کراہتا رہا۔ ہسپتال میں پہنچ کر جب وہ اس قابل ہوا تو اس نے اپنی سرگزشت ایک افسانے

کی شکل میں لکھی جس کا عنوان ”چار دن“ تھا، اور اس ایک قسطے نے اسے ادبی دنیا میں مشہور کر دیا۔ صحت پانے کے بعد اس نے انشا پردازی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا اور اسے خاصی کامیابی ہوتی رہی۔ مگر اس کی طبیعت میں قوت برداشت بالکل نہیں تھی اور اس پر آفت یہ تھی کہ وہ بہت نازک مزاج اور حساس بھی تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی طبعی مایوسی اور خون جنون کی حد تک پہنچ گیا اور جب اس کے ایک عزیز دوست کو پھانسی دے دی گئی اور اسی کے ساتھ چند اور واقعات ہوئے جن سے اس کے دل کو سخت چوٹ لگی تو اسے جنون کا ایک شدید دورہ ہوا۔ اسی میں وہ مکان کے زینے سے نیچے کود پڑا اور تین چار روز بعد مر گیا۔

۱۸۷۶ء کی لڑائی میں گارشن اس سبب سے نہیں شریک ہوا تھا کہ اسے وطن سے محبت یا ترکوں سے نفرت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ان مصیبتوں سے بچے رہنے کا کوئی حق نہیں جن میں ہزاروں بے گناہ خواہ مخواہ مبتلا کر دیے گئے ہیں اور یہ نقطہ نظر اس کی سیرت کے سب سے اہم پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نے جس فضا میں نشو و نما پائی وہ ندامت، مایوسی اور شہماتی سے معمور تھی اور اس فضا نے درد اور ہمدردی کے جذبے کو اس کے لیے سوبان روح بنا دیا۔ روسی انشا پردازی میں حزن اور مایوسی کی ہر کیفیت پائی جاتی ہے، مگر مرثیہ لعل کی طرح لڑنا اور تر پنا گارشن ہی کا حصہ ہے۔ ”چار دن“ میں اس نے

بڑی سادگی سے ایک سپاہی کی تکلیفیں بیان کی ہیں، بالکل اسی طرح
 جیسے ایک بے زبان سپاہی بیان کرتا ہے جس میں شکایت کرنے کی
 جرأت نہیں ہے اور جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ لڑکر ایک دوسرے
 کا خون کیوں بہاتے ہیں اور اسے وطن اور عزیزوں سے چھڑا کر اس
 کشت و خون میں شریک کرنے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک
 اور افسانے میں جس کا عنوان ”بزدل“ ہے گارشن نے یہی داستان ذرا
 انداز بدل کر سنائی ہے۔ اس قصے میں ایک نوجوان جو جنگ کو غلامی
 جرم مانتا ہے لڑائی میں شریک ہو کر اپنی جان دے دیتا ہے، اس لیے
 کہ وہ بھی گارشن کی طرح اپنے آپ کو ایک دبا سے جس میں لاکھوں
 معصوم جانیں ضائع ہو رہی تھیں محفوظ رکھنا بزدلی اور نامردی سمجھتا ہے۔
 اسے یقین ہو گیا ہے کہ اپنی جان بچا لینے میں کوئی مصلحت نہیں ہو سکتی،
 اس کے سامنے ایک تندرست اور خوبصورت و دست کی مثال ہے جو
 کسی لڑکی پر عاشق ہو کر زندگی سے ایسا بیزار ہو گیا کہ ایک معمولی مرن
 کو بڑھاتے بڑھاتے مہلک بنا لیا۔ اس کی معشوقہ کا انجام اس سے
 کچھ بہتر نہیں ہوا کیوں کہ جب اس نے اپنی بے اتفاقی کا درد ناک انجام
 دیکھا تو اس کے دل کی کیفیت ایک بجھے ہوئے چراغ کی سی ہو گئی
 جس میں کوئی آرزو اور کوئی امید و دشنی پیدا نہ کر سکی۔
 گارشن کے سب سے مشہور افسانے ”نوج بول“ اور ”آتا لیر پرست“
 لہذا ان کی ایک قسم جو جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے۔

ہیں۔ ”سُرخ پھول“ ایک دیوانے کا قصہ ہے جسے پاگل خانے کے باغ میں تین سُرخ پھول فطر آئے اور انھیں دیکھتے ہی اسے یقین ہو گیا کہ یہ پھول دنیا کی کل بُرائی کے مجسمے ہیں، اگر وہ توڑ ڈالے جائیں اور ان کے بیج زمین پر نہ گرنے پائیں تو دنیا سے بُرائی بالکل مٹ جائے گی۔ وہ ساقی ہی یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ یہ پھول بہت زہریلے ہوں گے اور کوئی تعجب نہیں اگر انھیں توڑ کر کپڑوں میں چھپانے سے انسان کے جسم میں زہر پھیل جائے اور وہ ہلاک ہو جائے۔ مگر وہ ایثار پر آمادہ ہے۔ وہ بڑی چالاک سے رات کو محافظوں کی آنکھ بچا کر ایک ایک کر کے تینوں پھول توڑ لیتا ہے اور انھیں اچے سینے میں چھپا لیتا ہے۔ آخری پھول توڑنے کے لیے اسے سردی میں اُٹھ کر چوروں کی طرح دیواروں پر چڑھنا اور کھڑکیوں سے نیچے کودنا پڑا اور اس مہم سے واپس ہونے کے بعد اس کے ذہنی لے بالکل جواب دے دیا سویرے جب اس کے محافظ اسے دیکھنے آئے تو وہ مرا پڑا تھا، مگر اس کے چہرے پر شگفتگی اور رونق تھی جو پہلے کبھی نہیں دکھائی دی تھی اور معلوم ہوتا تھا کوئی گہری مسرت اس کے منہ کو بوسہ دے گئی ہے۔ اس قصے کو ہم واقعہ نگاری سمجھیں یا استعارہ، اس کی خوبی اور عبرت انگیزی ظاہر ہے اور اس کے درد اور طنز کا لہجہ دل میں ایسا چھب جاتا ہے کہ پھر شکائے نہیں نکلتا۔ کارشن خود کچھ دن پاگل خانے میں رہا تھا اور اس افسانے میں اس نے

وہی فضا پیدا کر دی ہو۔ اپنے دیوانے ہیر کی طرح گارش بھی تمام عمر دنیا کو بُرائیوں سے پاک کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا تھا اور یہ قصہ بالکل آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ نقتے کے ادبی اوصاف بھی بیان کے محتاج نہیں، لیکن ایسے جنوں آموز حزن کی تاب لانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

”اتالیہ پرنسپس“ میں بھی درد اور مایوسی کا وہی عالم ہے جو ”سُرخ بھول“ میں۔ نباتیات کے ایک روسی ماہر نے جنوبی امریکا سے تار کے ایک درخت کو لاکر اپنے باغ میں لگایا اور اسے سرزمی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک شیشے کے گرم خانے میں رکھا یہ تار کی ایک بہت نایاب قسم تھی اور لوگ اسے دور دور سے دیکھنے کو آئے ان میں سے ایک جنوبی امریکا کے اس خاص علاقے کا رہنے والا تھا جہاں سے تار کا درخت لایا گیا تھا۔ درخت کو دیکھتے ہی وطن کی یاد نے اس کو ایسا بے قرار کر دیا کہ پردیس میں ایک لمحہ اور گزارنا اسے گوارا نہ ہوا اور وہ فوراً وطن روانہ ہو گیا۔

ایسے ہی کسی جذبے نے تار پر بھی اپنا جادو کر دیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور بڑھتے بڑھتے گرم خانے کی چھت تک پہنچ گیا۔ ماہر نباتات کو خوف ہوا کہ گرم خانے کی چھت پھٹ پڑے گی اور اس جسم سے اس نے درخت کو کٹوا کر باہر پھینکوا دیا یہ انجام ہوا

بیچارے درخت کی آرزوؤں اور کوششوں کا اور یہ حقیقت تھی ان لوگوں کی قدر دانی کی جنہوں نے اسے اپنی اصل سرزمین سے جدا کر کے پردیس میں ایک اعجوبہ بنا کر رکھا تھا۔

گارشن کا شمار روس کے سربراہ اور وہ انشا پر دازوں میں نہیں ہوتا اور دراصل وہ اس کا مستحق بھی نہیں ہے۔ اس کے تخیل میں قوت کی کمی اور درد کی بہت زیادتی تھی، زندگی کی جو تصویریں وہ دکھاتا ہے ان پر ایک مردنی چھائی ہوتی ہے جسے برداشت کرنا آسان نہیں اور اسے برداشت کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ خاکساری، ایثار، دوسروں کے درو کیا پناہ اور بنا لینا بلند اخلاقی اوصاف ہیں لیکن گارشن کے فلسفے میں وہ زندگی کی بنیاد نہیں ہیں بلکہ زندگی کو برباد کرتے ہیں۔ گارشن نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، اس کے کیرکٹر گھڑے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن دنیا میں بیماری ہے تو تندرستی بھی ہے، اگر کسی جماعت میں اتفاق سے اکثریت بیماروں کی ہو جائے تب بھی تندرستی ہی کو سب کا نصب العین اور سب کے لیے دائمی حقیقت کا منظر ہونا چاہیے۔

ولاجیر گلاکتیو نووچ کو رولینکو

(۱۸۵۳ - ۱۹۲۱)

کو رولینکو گول کا ہم وطن یعنی روس کے جنوب مغربی صوبے اوکرائن کا رہنے والا تھا۔ اوکرائن کی زبان روسی سے جدا ہے اور

یہاں کے لوگ صورت اور سیرت میں روسیوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں ہمیشہ سے قومیت کا ایک جذبہ موجود ہے جو ان کے اور روسیوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرتا رہا ہے۔ لیکن گو گول کی طرح کورولینکو کی تعلیم بھی روس میں ہوئی اور اس کی زبان بہت سستہ اور فصیح ہے۔ اپنے سیاسی خیالات کی بنا پر کورولینکو پتر برگ کے مدد سے صنعت و حرفت اور پھر ماسکو کے مدرسہ زراعت سے نکالا گیا اور ۱۸۷۹ء میں ملک بدر کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ چھ سال کے بعد اسے روس واپس آنے کی اجازت ملی، اور اسی وقت اس کی پہلی قابل قدر تصنیف، ایک لمبا افسانہ جس کا عنوان ”ماکار کا خواب“ تھا، شائع ہوا۔ دس برس تک کورولینکو افسانہ نویسی میں مشغول رہا اور اس نے خاصی مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی، مگر پھر وہ انشا پردازی ترک کر کے پولیس اور نظام عدالت کی اصلاح کی فکر میں پڑ گیا، اور آخر عمر تک بس ایک ناول اور لکھ سکا جو اس کی آپ بیتی ہے۔ کورولینکو پولشیوک پارٹی کا ہم خیال نہیں تھا، مگر اس نے پولشیویکوں کی عملی مخالفت بھی نہیں کی۔

کورولینکو سیاسی معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور اس کا میلان انتہا پسندی کی طرف تھا، لیکن اس کے افسانوں میں اس کے سیاسی خیالات کا عکس بہت کم نظر آتا ہے۔ اس کا فلسفہ حیات تو رنگینف کے عقائد سے بہت ملتا جلتا ہے اور تو رنگینف کی طرح

وہ بھی چاہتا ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے قدرتی ماحول کو ایک شعر کے دو مصرعے بنا دے۔ اس کا یہ رنگ بہت پسند کیا گیا، اس وجہ سے کہ جس زمانے میں کورولینکو نے ادب کے میدان میں قدم رکھا، اس وقت تو رگینف کا دوبارہ چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن کورولینکو محض ایک مقلد کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے بیان میں شاعرانہ انداز کے ساتھ ایک ظرافت پائی جاتی ہے جو تو رگینف کی تصانیف میں نہیں ملتی اور اس حزن سے بھی نا آشنا معلوم ہوتا ہے جو تو رگینف کے تخیل پر چھایا ہوا تھا۔ دراصل کورولینکو اپنے اوکرائینی پیش رو گوگول سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، اگرچہ اسے گوگول کا جوش اور جولانیت اور تخیل کی فراوانی نصیب نہیں ہوئی۔ مگر دوسری طرف کورولینکو کی ظرافت مردم بیزاری کے دھتے سے بالکل پاک ہے اور اس کو انسان کی خلقی نیکی کا اتنا گہرا اور سچا اعتقاد ہے کہ اس کے افسانے پڑھنے والے کو مایوس یا مغموم نہیں کرتے اور اس اعتبار سے وہ روسی انشا پردازوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

”ماکار کے خواب“ میں کورولینکو نے شمال مشرقی سائبیریا کے مناظر کی کیفیات بیان کی ہیں۔ افسانے کا ہیرو اس علاقے کی ایک نیم وحشی قوم ”یاقوت“ کا ایک آدمی ہے۔ کورولینکو نے اس کی طبعی خود غرضی کو واضح کیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ دکھایا ہے کہ اس خود غرضی کی تنگ و تنار یک فضا میں انسانیت اور اخلاقی بے غرضی کا

چراغ بھی ٹٹمار رہا ہے۔ ”بُری صحبت“ میں مناظرِ قدرت کا عکس اُتارنے میں کمال دکھایا گیا ہے، مگر اس کے بلاٹ اور کیرکٹروں میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ ”رات“، ”یومِ جزا“ اور ”بے زبان“ کو رولینکو کی نظر کے بہترین نمونے ہیں۔ ”رات“ میں بچوں کی ایک شبانہ مجلس کی کارروائی بیان کی گئی ہے، جس میں وہ بیٹھ کر اس اہم مسئلے پر رائے زنی کرتے ہیں کہ بچے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ ”یومِ جزا“ ایک عیسائی کی سرگزشت ہے جسے شیطان نے ایک سود خوار یہودی کے شہرے میں جہنم پہنچا دیا، کیوں کہ عیسائی میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو سود خوار یہودی کو اصل جہنم کرنے کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں۔ ”بے زبان“ تین اوکرائینی مزدوروں کا قصبہ ہے جو کسبِ معاش کے لیے امریکا گئے۔ انھیں اپنی زبان کے سوا اور کوئی بولی آتی نہیں تھی، اور اس سبب سے نہایت ہی مضحکہ خیز وارداتیں پیش آئیں۔ کورولینکو کی بہترین تصنیف اس کا آخری ناول ہے، جس کا عنوان ”میرے زمانے کے ایک صاحب کی سوانحِ عمری“ ہے۔ اس میں اس کے سارے کمالات، مناظرِ قدرت کی مصوری، ظرافت، انسانیت اور نوعِ انسانی سے عقیدت مندی، سب یک جا ہو گئے ہیں اور اس کی انشا پر دازی کا حسن نکھر آیا ہے۔

دسواں باب

آنتون پافلوف چخوف - (۱۸۶۰-۱۹۰۴)
 چخوف کے اجداد جنوبی روس کے شہر تگن روگ کے تاتار تھے،
 جو پہلے مسلمان تھے اور بعد کو عیسائی ہو گئے۔ اس کا دادا ایک زرعی
 غلام تھا، مگر اس نے روپیہ پیدا کر کے اپنی آزادی خرید لی اور چخوف
 کے باپ نے دادا کے قایم کیے ہوئے کاروبار کو بہت ترقی دی۔
 چخوف کا بچپن خوش حالی میں گزرا، لیکن وہ اسکول ہی میں تھا جب
 باپ نے کاروبار میں بہت نقصان اٹھایا اور چخوف کو اسکول میں
 چھوڑ کر سارا خاندان ماسکو چلا گیا۔ ۱۸۷۹ میں چخوف بھی فارغ ہو کر
 ماسکو پہنچا اور وہاں کے دارالعلوم کے شعبہ طب میں داخل ہو گیا۔
 خاندان کی مالی دشواریاں رفع کرنے کی نیت سے اس نے طالب
 علمی کے زمانے میں انشاپردازی کی مشق شروع کر دی اور شہر کے
 معمولی قسم کے اخباروں اور رسالوں میں اس کے مزاحیہ افسانے

شایع ہونے لگے۔ اس نے جب مسند حاصل کی تو اس تغل سے اس کو خاصی آمدنی ہونے لگی تھی، اس لیے طبابت کرنے کی جگہ اس نے افسانہ نویس کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ ۱۸۸۶ میں اس کا تعارف ایک مشہور نقاد گرگیور وویچ اور ماسکو کے سب سے بڑے روزانہ اخبار کے مدیر سووورن سے ہو گیا گرگیور وویچ کی سرپرستی کی بدولت روس کی ادبی دنیا میں چخوف کی ایک خاص حیثیت ہو گئی اور جب سووورن اس کے افسانے اپنے اخبار میں شایع کرنے لگا تو چخوف کو نفس مذاق اور وسیع نظر رکھنے والے قدر داں مل گئے، جن کی نکتہ رسی ہر صاحب ہنر کیا اپنے چہرہ دکھانے کا حوصلہ دلاتی ہے۔ چخوف نے مسخرے پن کا وہ انداز جو اس نے ادبی اخباروں کی خاطر اختیار کیا تھا چھوڑ دیا، اور رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں وہ خاص رنگ پیدا ہو گیا جو اس کی امتیازی صفت ہے۔ ۱۸۸۷ میں اس کا پہلا ڈراما دکھایا گیا، مگر ڈراما نویس کی حیثیت سے وہ اسی وقت مقبول عام ہوا جب ماسکو آرٹ تھیٹر نے اس کے ڈرامے دکھانا شروع کیا۔

۱۸۹۰ میں چخوف سخا لین کے جیل جانے اور سنز ایافنہ مجرموں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لیے مشرقی سائبیریا گیا اور "سخا لین" کے عنوان سے اپنی رپورٹ شایع کی، جس کا ریاست اور عام تعلیم لہ چخوف کے ڈراموں کا مفصل ذکر "روسی ڈراما" کی بحث میں ہو چکا ہے۔

روسیوں پر بہت اثر ہوا۔ ۱۸۹۱ میں ماسکو کے قریب کئی ضلعوں میں قحط پڑا اور پھر انھیں ضلعوں پر مہیضے کا بہت شدید حملہ بھی ہوا۔ ان دونوں موقعوں پر چخوف نے مصیبت زدوں کی بڑی جاں فشانی سے خدمت کی۔ جب اس کی مالی حالت سنبھل گئی تو اس نے ماسکو سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک مکان مول لیا اور ایک نوآبادی کی بنا ڈالی جسے وہ دیہاتی بستیوں کا مثالی نمونہ بنا نا چاہتا تھا اور جس کی ترقی کے خواب وہ عمر بھر دیکھتا رہا۔ وہ آس پاس کے کسانوں کا علاج کرتا تھا اور دو انیس مفت تقسیم کرتا تھا، اس کے علاوہ اس نے ایک اسکول بھی قائم کیا اور کانو کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے گرجا میں ترمیمیں کرائیں۔ اس کا آبائی شہر تلگن روگ اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ وہاں بھی وہ ایک کتب خانہ، ایک ادبی عجائب خانہ اور تاجروں کو ہر طرح کی معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے کے لیے ایک دفتر یادگار چھوڑ گیا۔

چخوف کو جوانی سے کھانسی کی شکایت شروع ہو گئی تھی اور بلغم کے ساتھ اکثر خون بھی گرا کرتا تھا۔ یہ شکایت دق کا پیش خیمہ تھی، لیکن چخوف نے اس کی مطلق پروا نہیں کی اور اپنے عزیزوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے مرض کو حتی الامکان چھپاتا رہا۔ ۱۸۹۷ء کے بعد اس کی حالت بہت خراب ہو گئی اور اس کی زندگی کے بقیہ سات سال زیادہ تر علاج کرنے میں صرف ہوئے۔ اس زمانے میں

بھی اس کے ادبی مشاغل جاری رہے اور اس کے ڈراموں نے اسے خاص طور پر ہر دل عزیز کر دیا۔ ۱۹۰۴ میں اس کا ڈراما ”چری کا باغ“ دکھایا گیا تو ناظرین پر ایک وجہ کی سی کیفیت طاری تھی اور تماشے کے بعد جب دستور کے مطابق مصنف اسٹیج پر بلایا گیا اور اس کی صورت دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ وہ صرف چند دن کا بہانہ ہو تو پورے مجمع کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی کے تھوڑے دن بعد چخوف کا جنوبی جرمنی کی ایک صحت گاہ باؤن دائلر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے ماتم میں ایک روسی قوم نہیں بلکہ ساری مغربی دنیا شریک تھی اور اس کا جنازہ اس دھوم سے اُٹھا کہ دستہ نقشبندی کے سوا کسی اور کا نہ اُٹھا ہوگا۔

۱۸۹۰ کے بعد چخوف نے کئی مرتبہ یورپ کا سفر کیا، عام طور سے اس کا لینا بلنا متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں سے رہتا تھا اور اس کے افسانوں میں زیادہ تر انھیں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے ہیں۔ یورپی تہذیب اور اس تہذیب کے مارے ہوئے تعلیم یافتہ روسیوں سے تعلق رکھنے کے باوجود کسانوں، مزدوروں اور ادنیٰ قسم کے تاجروں کی یہودی کی ایسی فکر رکھنا جیسی کہ چخوف کو تھی ذہنی اور روحانی صحت کی روشن دلیل ہے۔ چخوف کی تصانیف پر غور کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ نہایت نیک دل، ہم درد، مخلص اور بڑی محبت کا آدمی تھا اور اس کے دل میں انسانی

زندگی کو سدھارنے اور سنارنے کے بڑے حوصلے تھے۔ وہ بہت ملن سارا اور مہمان نواز تھا اور لوگوں کی ہر طرح مدد کرنے میں اسے بہت فزا تھا خاندان کی پرورش کا ہر تمام عمر اسی کے ذمے رہا، اور یہ ذمہ داری اس نے خوشی سے منظور کی اور بہت مستعدی اور محبت سے پوری کرتا رہا۔ اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ دوسروں پر حاوی ہو جائے، لیکن اس کی مردم دوستی سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی، روس کے بہت سے نوجوان انشا پرداز اس کی سرپرستی سے فیض یاب ہوئے، اور جن لوگوں کی شہرت پہلے سے قائم تھی انہیں اس کے ادب اور احترام نے خوش رکھا، تالستانی سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے، تالستانی نے کئی خطوط میں اس کی تعریف کی ہے، اور اس کے ایک افسانے پر تبصرہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چخوف کو انسانی سیرت کا عکس اُتارنے میں کیسا ملکہ تھا اور تالستانی کی نظر کیسی نکلتے ہیں تھو۔

چخوف افسانہ نویسی کے ایک نئے اور نرالے طرز کا موجد مانا جاتا ہے جو زندگی کی کیفیات اور انسان کے احساسات بیان کرنے کے لیے اس قدر موزوں ہے کہ اس نے فن افسانہ نویسی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سب سے نمایاں خصوصیت اس نئے طرز کی یہ ہے کہ اس میں قصہ سنانے کا خیال بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ دوسرے روسی انشا پردازوں کی طرح چخوف بھی داستان کو معنی خیز بنانے

کے لیے غیر معمولی حادثوں کا سہارا نہیں ڈھونڈھتا تھا، اس کے قلم میں معمولی واقعات اور احساسات کو اس صفائی اور وضاحت سے پیش کرنے کی قدرت تھی کہ اس کے افسانے سیدھی سادی حقیقت ہی کی بدولت لطیف اور دل کش ہو جاتے ہیں۔ عام طور سے چخوف افسانے کے لیے اپنے ہیرو یا ہیروین کی سرگزشت کا کوئی ایسا موقع یا واقعہ منتخب کرتا ہے جو ایک مثالی نمونہ قرار دیا جاسکے، اور اس کو وہ ایک شمع بنا دیتا ہے جس کی روشنی میں اس کے ہیرو کی ساری زندگی اور تمام مزاجی اور روحانی کیفیتیں آپ ہی آپ نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے طرز بیان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ہم اس فضا سے گھر جاتے ہیں جس کا عکس اُتارنا چخوف کا مقصد ہوتا ہے، یہاں تک کہ چخوف کے فنی کمالات کو ہم اپنی نظر کی گہرائی اور ادراک کی خوبی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس نے خواہ کتنی ہی نازک بات پیدا کی ہو، ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر پہلے ہی اس پر پڑ گئی تھی اور ہم چاہتے تو اسے خود بھی اسی طرح بیان کر دیتے۔ ایسے ہی وہ ہزاروں اپنے اپنے رنگ کی نرالی طبیعتیں رکھتے والے لوگ جن سے چخوف ہمارا تعارف کراتا ہے سب اپنے جانے بوجھے دوست آشنا معلوم ہوتے ہیں جن کے چلے اور سر پہ سے ہم بخوبی واقف ہیں، جن کی سیرت اور خصلت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں، جو کچھ ان پر گزری وہ ہمارا سنا ہوا قصہ ہے اور جو کچھ ہونے والا ہو وہ ہمارے لیے کوئی راز نہیں۔ چخوف نہ تو خط و خال کی باریکیوں

جان دیتا ہے، جو عہدِ مغلیہ کے مصوٰروں کا دستور تھا اور نہ اصلیت سے قطع نظر کر لیتا ہے جیسا کہ یورپ کے جدید مصور کرتے ہیں۔ بعض نقاد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی دنیا میں دھوپ چھاؤں نہیں، دن رات نہیں، بس ایک جھٹپٹا سا رہتا ہے جس میں کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی، اسی وجہ سے اس کی تصویروں میں کوئی رنگ نہیں، جو صورتیں اس نے بنائی ہیں وہ دھندھلی اور سب ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک حد تک تو یہ اعتراض درست ہے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ روس اور تمام یورپ میں طریقہ تعلیم، معاشرتی انقلابات اور سیاسی اور اخلاقی دباؤ نے یک رنگی کو ایک دبا ہوا دیا ہے، نرالے اوصاف کے لوگ ڈھونڈتے سے بھی نہیں ملتے اور زندگی کا ایسا مصور جو ذہنی اور اخلاقی فضا کی ہر کیفیت سے متاثر ہوتا ہو حقیقت کا اتنا پابند ضرور ہو جاتا ہے کہ اس یک رنگی کو ہر جگہ دکھائے۔ یورپ کی زندگی کو دیکھتے ہوئے چخوف نے اپنے افسانوں میں پھر بھی بہت کچھ رنگ پیدا کیا ہے، کیوں کہ وہ بہت سی نازک کیفیتوں کو جو دوسرے ملکوں کے ناول نویسوں سے پوشیدہ رہیں بڑی نکتہ رسی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ چخوف کی تصویروں کے دھندھلے ہونے کی شکایت وہی لوگ کرتے ہیں جو انگریزوں کی طرح ناول اور افسانے کو دراصل حسنِ عشق کی دل چپ داستان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ایک مافی ہوئی بات ہے کہ ہر صورت اور خصوصاً حسین صورت کسی نہ کسی اعتبار سے نرالی ہوتی ہے

اور عشق کا جذبہ ایسا جامہ زیب ہو کہ ہر لباس اس پر نیا اور اچھا لگتا ہو۔ لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہو کہ عشق بالکل خیالی نہیں تو اس قدر ناپائدار جذبہ ضرور ہوتا ہو کہ اسے زندگی کی حقیقتوں میں شمار کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہو، اس کی بدولت داستان چٹپی ہو جاتی ہو، مگر اور بہت سے احساسات جو اتنے ہی لطیف اور رنگین ہیں بیان سے محروم رہ جاتے ہیں، اور اس لحاظ سے یک رنگی کا اعتراض چخوف سے زیادہ ان انشا پر دازلوں پر عائد ہوتا ہو جو پڑھنے والوں کو طرح طرح سے حس و عشق کے شعبہ سے دکھا کر کنبھاتے ہیں۔ چخوف ہر شخص کو عاشق یا معشوق نہیں سمجھتا، اس نے انسان کے احساسات کو ایک جذبے تک محدود نہیں رکھا، ایک ہی تصویر کو پس منظر اور گرد و پیش بدل بدل کر نہیں دکھایا۔ ظاہر ہو انسان کی زندگی کا ہر پہلو اتنا وسیع نہیں ہوتا جتنی حس و عشق کی کشمکش، لیکن حقیقت نگار کی نظر پوری حقیقت پر ہونا چاہیے اور چخوف نے حقیقت کو مد نظر رکھنے کے علاوہ اس میں ایسی جان ڈال دی ہو کہ جو کچھ وہ بیان کرتا ہو، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یا دیکھ چکے ہیں۔ اسی حقیقت کا ایک رُخ مردوں عورتوں کے تعلقات ہیں۔ ایسے ناول نویس بہت ہیں جنہوں نے سطحی دلچسپی کی حد سے گزر کر انسانی فطرت کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا ہو اور کسی نہ کسی قیمت کا موتی لے کر آئے ہیں۔ لیکن ایک دو موتیوں سے زیادہ کسی کے ہاتھ نہیں

اور ان کے مشاہدے میں یہ لوگ ایسے محو ہو گئے کہ انہیں اس خزانے کا خیال ہی نہیں رہا جس میں سے وہ ان چند موتیوں کو نکال کر لائے تھے۔ فرانسیسی انشا پرداز عورت کی چالاکی اور لذت پرستی کے مرقع کھینچنے میں ماہر ہیں اور اس میدان میں کوئی ان کی برابر کی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ انگریز مصنف اب تک محبت کی داستانیں سنانا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، لیکن اب وہ اس سے کچھ اکتا گئے ہیں اور جدید ترین ناول نویس عورتوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ نروانی سیرت کا پورا حق دراصل صرف روسی ادا کر سکے ہیں۔ ان کی معاشرت کا کئی صدیوں سے کچھ ایسا رنگ رہا ہے کہ وہ اخلاقی پابندیاں جو دوسرے ملکوں میں معیار کا کام دیتی ہیں ان کے یہاں تسلیم ہی نہیں کی گئیں، جنسی جذبات ان کے نزدیک اسی قسم کی قدرتی خواہشیں ہیں جیسی بھوک اور پیاس اور کسی نے غلطی سے یا جان بوجھ کر کوئی بے قاعدگی یا زیادتی کی تو وہ اس کے عمل کو فلسفیانہ غور و فکر کا موضوع نہیں بناتے اور نہ اسے اخلاقیات کے کانٹے پر تول کر رتی ماشے کا فرق نکالتے ہیں۔ وہ عشق مجازی کو اس طرح نہیں دکھاتے کہ پڑھنے والا دھوکے سے اس کو حقیقی سمجھ لے اور نہ لذت پرستی کو ایسا سنوارتے ہیں کہ لوگ خواہ مخواہ اس پر فریفتہ ہو جائیں اور ضبطِ نفس کو بے مذاقی یا بے حسی سمجھنے لگیں۔ خوف اس اعتبار سے بھی سچا دسی تھا، اس نے نروانی سیرت کی کسی خصوصیت کو مرکزی حیثیت

ہیں دی ہے، اس نے عورت کو کسی صفت یا کسی عیب کا مجسمہ نہیں ٹھہرایا ہے، اس کے افسانوں کے نسوانی کیرکٹر سب انسان ہیں اور انسانوں میں جو طرح طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں وہ ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اپنے فرانسیسی ہم چشم مولیاں (۱۸۵۰ - ۱۸۹۳) کی طرح چخوف عورتوں سے ڈرنا، نفرت کرنا یا انھیں حقیر اور پست حوصلہ سمجھنا نہیں سکھاتا، اس کا فلسفہ حیات بہت زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ دوسری طرف وہ عورتوں کو دیویاں بنا کر پوجتا بھی نہیں ہے بلکہ مرد عورتیں ایک دوسرے کی صورت اور سیرت سے جواثر لیتے ہیں اس کو وہ نظر انداز نہیں کرتا، جیسے اس کو اور تمام کیفیتیں بیان کرنے میں کمال ہے دیے ہی وہ اس لگاؤ کو جو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، آغاز محبت کے اس فتنے کو جس میں دل و دماغ چور رہتے ہیں، اس بے صبری اور بے چینی اور جدائی کی اُن تکلیفوں کو جو محبت کی دلیل مانی جاتی ہیں بڑے ریسے اور لطیف انداز سے بیان کرتا ہے۔ اس کے افسانے حسن اور عشق کی شعبہ بازیوں سے خالی ہیں، مگر اس کے باوجود ان میں ہزاروں دلچسپیاں ہیں اور وہ حقیقت کو ایسے دل دیز پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا نقش دل سے مٹائے نہیں جھٹکتا۔

سادہ اور موثر حقیقت نگاری کے بعد چخوف کی سب سے قابل قدر صفت اس کی ظرافت ہے۔ اس نے افسانہ نویسی کی بسم اللہ نظر بغیانہ قصوں سے کی تھی اور سنجیدہ، متین اور مستند انشا پرداز بننے کے بعد

بھی اس کی ظرافت میں کوئی کمی نہیں ہوئی البتہ اس میں ذرا نالائقی آگئی۔ اس کی ظرافت کھری اور سچی ہے، وہ عبارت اور الفاظ کی مدد کی محتاج نہیں، اس کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہوتا جسے صرف روسی زبان جاننے والے سمجھ سکیں، وہ مسخرہ پن سے پاک ہے، اس میں کسی کی حقیر نہیں کی جاتی اور اس سے کسی کا دل نہیں دکھتا۔ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ہنستے ہنستے دل پر ایک چوٹ سی لگتی اور آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں، مگر عام طور پر جو ہنسی آتی ہے وہ سیدھی سادھی بے تکلف ہنسی ہوتی ہے۔ چخوف کسی کی ناکامی یا حماقت کا مذاق نہیں اڑاتا کسی خلقی عیب کو اپنی ظرافت کا تختہ مشق نہیں بناتا، اس کی مردم دوستی ہر حالت میں قائم رہتی ہے اور وہ ہنسا ہنسا کر ہم کو بھی مڑم دوست بناتا ہے۔ ان اوصاف کی بدولت اسے دنیا کے تمام مظلوموں میں ایک جداگانہ حیثیت اور خاص مرتبہ حاصل ہے اور بہت کم انشا پرداز اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۱۸۸۸ء میں چخوف کو روسی اکادمی کی طرف سے ”پشکن پرائز“ کا نصف حصہ ملا، اور انعام دیتے وقت اکادمی کے ایک رکن نے اس کی تصانیف پر تنقید بھی کی۔ چخوف کی انشا پردازی کا یہ ابتدائی زمانہ تھا، اس کا شمار نوجوان اور نومشقی مصنفوں میں ہوتا تھا، اس لیے فاضل نقاد نے اس کی قدرتی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ بزرگانہ نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھا اور اس پر افسوس

ظاہر کیا کہ ”مصنف (یعنی چخوف، جس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ زیر بحث تھا) اپنی استعداد کو ایسی فضول باتوں میں ضایع کرتا ہے جو کم و بیش وقتی اور اتفاقی ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے رستہ چلتے کچھ دیکھ لیا اور اسی کا نقشہ کھینچ رہا ہے یا کسی کی باتوں میں اسے کچھ پسند آیا اور اس نے اسے نقل کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی زبان میں رس اور فصاحت ہے، اگرچہ کبھی کبھی اس کی تشبیہیں صحیح نہیں ہوتیں اور محاورے غلط ہوتے ہیں۔“ چخوف کی زبان روزمرہ بول چال کی زبان ہے، جس میں نصاحت اور بلاغت کو کوئی دخل نہیں اور جو تصنع سے بالکل پاک ہے۔ موضوع کے انتخاب پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ دراصل چخوف کی حقیقت نگاری کی تعریف ہے، اور اکادمی کے فاضل نقاد نے غلط طریقے پر یہ صحیح بات کہی ہے کہ چخوف کے قصے ”آورد“ نہیں ہیں، ”آمد“ ہیں اکادمی کے علاوہ چخوف کے خاص انداز پر دوسرے روسی نقادوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایک مشہور اور با اثر نقاد میخائیلوفسکی نے اس کے دماغ کو قابل قدر اور اہم تصورات سے اور اس کے دل کو ایمان کے نور سے خالی پایا، ”اور جس میں یہ نہیں اس میں ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔“ ایک اور نقاد سٹھ جنہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ چخوف ایک روز کسی چہار دیواری کے سایے میں شراب کی بو میں بسا ہوا مردہ پڑا ملے گا۔ ان دونوں حضرات کا مطلب یہ تھا کہ چخوف نے ان گہرے

سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر بحث نہیں کی، جو جن پر غور کرنا ناول نویسوں کا فرض مانا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کا ذکر ناول یا افسانہ کے پیرتے میں نہ کیا جاتا تو سرکاری محتب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ بے شک چخوف کی انشا پردازی کی ایک خامی تھی، لیکن جو شخص اس کی طبیعت اور قومی خدمات سے ذرا بھی واقف ہوتا وہ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا کہ چخوف کو انسانی زندگی کے سدھارنے اور نوع انسانی کا غم غلط کرنے کا حوصلہ نہیں۔ اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہو تو بس اس قدر کہ اس نے نصیحت نہیں کی اور نوجوانوں کو جوش نہیں دلایا۔ روسی زندگی کا کوئی مسئلہ چخوف کی نظر سے پوشیدہ یا اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا، خواہ ہم کسانوں کی جہالت اور جمود کو دیکھیں یا تعلیم یافتہ طبقے کا ذہنی ہیجان، بے صبری، تلون مزاجی اور عقیدے پر عمل کرنے کی نااہلی، خواہ ہم انقلاب کے شیدائیوں کے حوصلے دیکھیں یا قدامت پسندوں کی کج فہمی اور خود ستائی۔ چخوف کا مقصد قوم کی اصلاح کی کسی خاص تدبیر یا تجویز کو مقبول عام بنانا نہیں تھا اور اسی وجہ سے کہ اس کی نظر محدود نہیں تھی، اس کے ذہن پر کوئی خاص حوصلہ یا جذبہ حاوی نہیں ہو سکا۔ اس کا دل درد سے بھر آتے یا رنج سے نڈھال ہو یا غصے سے کانپ اٹھے، اس کا قلم کبھی نہیں لرزتا، وہ انسانی ہمدردی اور محبت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا اور زندہ دلی اور ظرافت سے فضا

کی گرانی اور داستان کی نگین کی بارہلکا کرتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر گناہ معاف کر دیتے ہیں، ہر عیب سے چشم پوشی کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں اور ”جو سب کچھ سمجھتا ہے وہ سب کچھ معاف کر دیتا ہے۔“

چخوف کے منتخب افسانے ڈھائی سو سے کچھ اوپر ہیں۔ ان میں کسی قسم کی ترتیب پیدا کرنا بہت دشوار ہے، اس لیے کہ زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا، انسانی جذبات اور ان کے اثر کی حد بندی کرنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم افسانوں کی نمایاں خصوصیات کے مطابق انہیں تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محض کام چلانے کے لیے ہے۔ کوئی نقاد دو چار نمونے دے چخوف کے افسانوں کی تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، چخوف نے افسانہ نویسی کی ابتدا نظریہ قصوں سے کی۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا مقصد محض ہنسنا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن میں درد، عبرت یا نصیحت کا پہلو بھی ہے۔ ”مقرر“ ”بھٹکے ہوئے“ ”سنگ تراشی کا عجوبہ“ ”تہمت“ ”فالتو“ ”دھونس“ وغیرہ خالص ظرافت کے بے مثل نمونے ہیں جن میں حزن، مایوسی یا درد کا ذرا بھی اثر نہیں۔ ”مقرر“ میں قبرستان کا منظر ہے، ایک صاحب جنھیں بیوی کی بد مزاجی اور شراب پینے کی عادت نے موت کے گھاٹ اتارا ہے دفن کے

جار ہے ہیں، اور آخر میں ایک صاحب جو بہت خوش تقریب سمجھے جاتے تھے مرحوم کی نیکیاں بیان کرنے کو کھڑے ہوتے ہیں۔ فاضل مقرر رہنے والے تو اسی جگہ کے تھے، مگر انھیں اطلاع دیتے وقت مرحوم کا نام نہیں بتایا گیا تھا، بلکہ صرف عہدہ اور وہ سمجھے کہ ایک اور صاحب جو پہلے اسی عہدے پر تھے، راہی عدم ہوئے ہیں۔ بہر حال انھیں تقریر کرنے میں کوئی تکلف نہیں تھا، ان کی تقریر بہت موثر تھی اور اگرچہ مرحوم کا جو حلیہ انھوں نے بتایا وہ غلط تھا اور ان کی زندگی کے جو حالات انھوں نے بتائے وہ بھی غلط تھے، ان کا انداز بیان ایسا پُر درد تھا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اتفاق سے وہ صاحب جنھیں فاضل مقرر سمجھتے تھے کہ زمین کے پیر کیے گئے ہیں سامعین میں موجود تھے اور تقریر کے سلسلے میں جب ان کا نام آیا تو ان کی حیرت اور غصے کی انتہا نہ تھی۔ جب فاضل مقرر سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو ظاہر یہ کہ تقریر کی روانی میں خلل پڑ گیا۔ مقرر نے رُک کر اپنے ان دوست سے جو انھیں بتانے گئے تھے، کہا:-

”ارے بھائی وہ تو زندہ ہی ہے؟“

”کون؟“

”مقرر نے نام بتایا۔“

”ہاں وہ تو زندہ ہیں۔ انتقال تو۔۔ کا ہوا ہی۔“

اس کے بعد دو چار منٹ اور بحث ہوئی۔ پھر دوست نے کہا:
 ”ارے بھائی تم رُک کیوں گئے۔ تقریر کرتے رہو۔ وقفہ اچھا
 نہیں معلوم ہوتا۔“

مقرر نے قبر کی طرف اشارہ کیا اور ایک نئی تقریر شروع کر دی۔
 ”بھٹکے ہوئے“ دو دوست ہیں جن میں سے ایک مہمان ہیں،
 دوسرے جو ایک کھاتے پیتے وکیل ہیں، وہ میزبان ہیں، اور اپنے
 دوست کو اپنی بیوی سے ملانے اور اپنا نیا گھر دکھانے کے لیے
 لائے ہیں۔ گھرانہ کا دیہات کی ایک چھوٹی سی بستی میں ریلوے
 اسٹیشن سے خاصی دور ہے، گاڑی رات کو پہنچی ہے اور رات بھی ایسی
 کہ شرک نظر نہیں آتی۔ مہمان کی بھوک پیاس کی شدت سے حالت
 زار ہے اور میزبان انہیں اپنی بیوی کی محبت اور سلیقے کے قصبے سنا
 اور ان کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے گا اس کی تفصیل بتا کر تسلی دیتے
 ہیں۔ آخر میں بستی دور سے دکھائی دیتی ہے، اور ایک مکان کے
 پاس ٹھہر کر وکیل صاحب خوش خبری سناتے ہیں کہ لیجے منزل مقصود
 پر پہنچ گئے۔ مکان میں ہر طرف اندھیرا ہے، وکیل صاحب اپنی بیوی
 کا نام لے کر پکارتے ہیں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ پہلے وہ سمجھتے ہیں
 کہ بیوی سو گئی ہے۔ پھر خیال ہوتا ہے کہ شاید مذاق کر رہی ہو اور جب
 وہ پکارتے پکارتے تھک جاتے ہیں تو دوست کے کندھوں پر پیر
 رکھ کر کھڑکی کے رستے سے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جسے وہ

سمجھتے ہیں کہ ان کی نشست کا کمرہ ہے۔ کمرے میں مرغیاں اور بطخیں بند ہیں جو ان کے پہنچتے ہی شور مچانا شروع کرتی ہیں اور کھڑکی سے اڑ کر باہر بھاگنے لگتی ہیں۔ وکیل صاحب بہت پریشان ہوتے ہیں، اسی پریشانی نے میں ان کا ہیڈ بیگ جس میں دیاسلائیاں میں گم ہو جاتا ہے اور اسے تلاش کرنے میں انھیں اور بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اس دوران میں مرغیوں کا شور ساری سبئی کو جگا دیتا ہے، لوگ لکھنیں اور ڈنڈے لے کر پہنچتے ہیں اور وکیل صاحب اور ان کے دوست کو چور سمجھ کر گھیر لیتے ہیں۔ وکیل صاحب اور ان لوگوں کے درمیان خوب گالی گلوچ ہوتی ہے اور اسی سلسلے میں وکیل صاحب کو پتا چلتا ہے کہ ایک چور اسے پر وہ غلط طرف مڑ گئے اور دوسری سبئی میں پہنچ گئے ہیں اور جس مکان کو اندھیرے میں وہ اپنا خیال کر رہے تھے کسی اور کا ہے۔

خالص نظریہ انہ فقہوں سے زیادہ دل حبیب وہ افسانے ہیں جن میں چخوف نے ہسنانے کے ساتھ انسانی سیرت کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے، جیسے ”لاٹری کا ٹکٹ“ ”دھونس“ ”گرگٹ“ ”انتقام“ ”لاٹری کا ٹکٹ“ میاں بیوی کی لڑائی کا قصہ ہے۔ بیوی نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا، شوہر اس کا نمبر اخبار میں دیکھتا ہے اور چونکہ خاصی بڑی رقم انعام میں ملنے والی تھی، وہ فوراً روپیہ خرچ کرنے کی بہترین صورتوں پر غور کرنے لگتا ہے۔ پھر

اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بیوی کنجوسی کرے گی، یا روپیہ ایسی طرح خرچ کرے گی جس میں کوئی فائدہ نہ آئے گا اور اس اندیشہ کی بدولت اس کے دل میں بیوی کی طرف سے ہزاروں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی صورت، عادات، شوق، ہر چیز بڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔ بیوی بھی اپنی خوش قسمتی کی خبر سن کر طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگتی ہے، مگر اسے بھی یکبارگی یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر خواہ مخواہ دخل دے کر اس کی ساری تدبیریں الٹ دے گا، اور وہ اپنی جگہ پر شوہر سے بیزار ہو جاتی ہے۔ لیکن کھلم کھلا جنگ ہونے سے پہلے ہی شوہر اتفاق سے ٹکٹ کے نمبر کو غور سے دیکھتا ہے اور تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے اور انھیں کچھ ملے ہی گاہیں۔ اس نے بیوی سے یہ کہہ دیا، دونوں کا مزاج آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ اطمینان سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ دونوں طبیعت کے نیک تھے، اب تک ان میں لڑائی نہیں ہوئی تھی، اور اگرچہ غریب تھے مگر خوش رہتے تھے۔ دولت ملتی تو بگڑ جاتے۔

”دھونس“ کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ایک مسافر کرایے کی گھوڑا گاڑی پر بیٹھے ہوئے جنگل سے گزر رہے تھے۔ شام کا وقت اور رستہ سنان تھا، اکیلے بیٹھے بیٹھے انھیں آپہی آپ چوروں اور ڈاکوؤں کے قصے یاد آنے لگے، اور پھر انھیں ڈر لگا۔ لہٰذا وہی میں غفلت کا عنوان ”نمک کی زیادتی“ ہے۔

کہ رستے میں انھیں ڈاکو لوٹ کر مار نہ ڈالیں۔ گاڑی بان سیدھا سادا
 دیہاتی تھا، مگر دیہاتیوں کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ نیک اور بد
 کی تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور حفظ ماتقدم کے خیال سے انھوں نے
 اپنے گاڑی بان سے باتیں کرنا شروع کیں، اس سے کہا کہ میرے
 پاس تین پستول ہیں، میں ایک وقت میں دس ڈاکوؤں کا مقابلہ
 کر سکتا ہوں اور اگرچہ دیکھنے میں دُبلّا پتلا اور بیمار ہوں، مجھ میں
 بیل کے برابر طاقت ہے، میں کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار
 چکا ہوں اور کئی کو سزا دلوا چکا ہوں۔ یہ باتیں سن کر دیہاتی کے ہلکا
 کھڑے ہوئے اور وہ بار بار مُڑ کر دیکھنے لگا کہ مسافر کہیں پیچھے سے
 پستول تو نہیں مارنے والا ہے۔ مسافر کا یہ حال تھا کہ گاڑی ذرا
 بھی ہلٹی یا چوں چوں کرتی تو وہ کانپ اُٹھتے تھے اور گاڑی بان
 کو مرعوب کرنے کے لیے کبھی اپنی طاقت اور کبھی اپنی حکومت کا قصہ
 سُنا دیتے۔ ایک مرتبہ گھوڑا ذرا تیز ہو گیا تو وہ سہم گئے اور گاڑی
 بان سے کہنے لگے کہ دیکھو۔ تمہیں شاید یقین نہ آتا ہو، میں ابھی پستول
 نکال کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ اب گاڑی بان کو ان کے ڈاکو ہونے میں
 شبہ نہیں رہا، وہ چیخ مار کر گاڑی سے کود پڑا اور یہ کہتا ہوا
 جنگل میں بھاگ گیا کہ بھیا میری گاڑی لے لو، گھوڑا لے لو، مگر
 جان نہ لو۔ ادھر مسافر کی سٹی گم ہوئی۔ گاڑی ہانکتا جانتے نہیں
 تھے۔ جانتے بھی ہوتے تو رستہ نہیں معلوم تھا۔ پہلے وہ بیٹھے رہے

بھر گاڑی بان کو پکارنا شروع کیا۔ وہ پاس ہی جھاڑیوں میں چھپا
 تھا اور جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور اسے یقین ہو گیا کہ مسافر ڈاکو
 نہیں ہو تو وہ ڈرتا ڈرتا جھاڑی میں سے نکلا، مسافر نے بہت کچھ
 تسلی بخشی دے کر اسے آگے چلنے پر راضی کیا اور اپنی زور آوری
 اور پستولوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔

”گرگٹ“ خوشامدیوں پر ایک لاجواب بھبتی ہے۔ ایک تھانہ دار
 نئی وردی پہنے اور ایک پولیس کے آدمی کو ساتھ لیے وہ پہرے
 وقت بیچ بازار سے گزر رہا ہے۔ اتنے میں ایک طرف کچھ شور ہوتا
 ہے اور دم بھر میں سڑک جو پہلے خالی تھی آدمیوں سے بھر جاتی ہے،
 تھانہ دار مجمع کی طرف بڑھتا ہے اور ڈانٹا کر پوچھتا ہے کہ تم سب یہاں
 کیوں جمع ہو گئے ہو۔ مجمع کے بیچ میں سے ایک آدمی اسے اپنی پھیٹی
 قمیص اور خون آلود اٹلی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھیے اس کتے
 نے آپ ہی آپ میری اٹلی کو تو بچ لیا۔ کتا بھی اسی کے پاس سہا
 ہوا بیٹھا ہے اور تھانہ دار فوراً اپنے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ اس کتے
 کو لے جا کر مرڈا ڈالو، یہ لاوارث ہے اور خطرناک ہے۔ لیکن مجمع میں
 سے کوئی مچپکے سے کہتا ہے کہ یہ تو فلاں جنرل کا کتا ہے، تھانہ دار کے
 بتور فوراً بدل جاتے ہیں اور وہ اس شخص کو جسے کتے نے کاٹا تھا
 ڈانٹتے لگتا ہے کہ تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی، جب ہی تمہیں
 اس نے کاٹا جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ کتا کس کا ہے تھانہ دار

کے تیور ایسے ہی بدلتے رہتے ہیں، کبھی وہ مجرم کتے کو مار ڈالنے کا حکم دیتا ہے، کبھی اس بجا پرے کو جسے کتے نے کاٹا تھا لٹکا رہا ہے۔ بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب انسان اپنی غلطی یا کمزوری سے نہیں بلکہ دوسروں کی زیادتی سے منحصر میں بھپس جاتا ہے اور بہت مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔ ”انتقام“ میں سگایف نامی ایک شخص جسے قومی اخلاق درست رکھنے کا حوصلہ ہے اپنی بیوی کو بے وفائی کی سزا دینے کے لیے ہسپتال خریدنے جاتا ہے۔ جس وقت دکان دار ہسپتال دکھانا شروع کرتا ہے سگایف کو تصور میں تین لاشیں پھڑکتی نظر آتی ہیں، لیکن کچھ ارادے کی کم زوری اور کچھ دکان دار کی باتوں کے سبب سے وہ یہ طو نہیں کر سکتا کہ بیوی اور اس کے آشنا دونوں کو مار کر خود کشی کرے، یا صرف آشنا کو مارے یا صرف اپنی بیوی کو۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جذبہ انتقام کی جو آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی ہے وہ کسی کو قتل کرنے سے کچھ نہیں سکتی اور وہ ہسپتال کی جگہ بیڑیاں پکڑنے کا حال خرید کر دکان سے چلا جاتا ہے۔

افسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں حجوف کا مقصد مہا طور پر روسی سیرت اور روسی زندگی کی فضا دکھانا ہے۔ ایک لحاظ سے تو اس کا ہر افسانہ اسی سخت میں آ سکتا ہے، لیکن یہاں ہمیں بحث ان چند افسانوں سے ہے جن میں معاصر حالات اور ذہنیت

اور روسی زندگی کے وہ مسائل چخوف کا موضوع ہیں جنہیں روسی تہذیب کی نرالی خصوصیات سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ اس صورت میں کہیں اور نظر نہیں آتے۔ ”بے مزہ کہانی“، ”اچھے لوگ“، ”گھر پر“، ”برسرِ راہ“ اور ”میرمی سرگزشت“ ایسے افسانوں کے مثالی نمونے ہیں۔ ان سب میں دراصل چخوف نے وہی نوحہ خوانی کی ہے جو اس سے پہلے کے تقریباً ہر روسی انشا پر داز کی تصانیف میں متی ہے، لیکن اپنے خاص طرز پر اور حقیقت کا ایک نیا پہلو روشن کرنے کی غرض سے۔ ان افسانوں کے اشخاص انہیں تعلیم یافتہ زمیں داروں کے بیٹے اور پوتے ہیں جن کے خا کے تورگینف اور گوچر دوف نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اتارے تھے، انہیں کی طرح یہ نئی پود بھی تمام عمر یہی سوچتی رہتی ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، انہیں کی طرح یہ بھی استقلال کی نعمت سے محروم ہے، جسمانی سمود اور ذہنی رجحان نے اسے بھی بے دست و پا کر رکھا ہے، اس کے لیے بھی چین سے دن کاٹنا مشکل ہے اور اس کے دل میں مایوسی اور حیرت کے سراو کی جذبہ پھپھ نہیں سکتا۔ چخوف نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ روسیوں کی سب سے بڑی کم زوری یہ ہے کہ ان کی آرزوؤں میں قوت نہیں اور یہی ان لوگوں کی سب سے نمایاں خامی ہے جن کا ذکر اس کے افسانوں میں آتا ہے۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہمدردی اور ایک دوسرے کی ہمت افزائی، جو کمزوروں کا سہارا اور ان کی تسلی کا سب سے

مؤثر ذریعہ ہو سکتی ہے کسی طرف نظر نہیں آتی۔ چھوٹ نے ہنایت پُر درد اور عبرت انگیز طریقے پر اس بیگانگی کو ظاہر کیا ہے جو انتہائی قرب میں انتہائی فصل پیدا کر دیتی ہے۔ ”بے مزہ کہانی“ ایک بوڑھے پروفیسر کا شکوہ ہے جنہوں نے تمام عمر علم کی خدمت کی ہے، جن کے سینکڑوں شاگرد ہیں، جو سارے ملک میں مشہور ہیں اور جن کی ہر جگہ عزت کی جاتی ہے۔ ان کی بیوی انہیں صبح شام ترکاری کا بھانڈا بتایا کرتی ہیں اور خرچ کی تنگی کی شکایت کیا کرتی ہیں۔ ان کا بیٹا فوج میں نوکری، مگر بجائے باپ کو مدد دینے کے وہ اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے اٹنا اس سے گزارا وصول کرتا ہے۔ ان کی لڑکی جو بچپن میں ان سے بے حد محبت کرتی تھی اپنی فکر وں میں پڑ گئی ہے اور اب اسے باپ سے کوئی مطلب نہیں۔ صبح شام سلام اور رسمی پیار کرنے کے سوا خاندان والوں کو ایک دوسرے سے اور کوئی سروکار نہیں اور سچا پے بوڑھے پروفیسر پر اس سروکاری اور اغراض کے اختلاف کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے علم پر، اس محنت کے انجام پر جس میں انہوں نے زندگی سرف کی ہے اعتبار نہیں رہتا اور دنیا میں ان کا جو آخری سہارا تھا وہ بھی دغا دے جاتا ہے۔ خاندان میں بیوی بچوں کے علاوہ پروفیسر کے ایک دوست کی لڑکی کا تیا بھی ہے جس کا باپ مرتے وقت اسے پروفیسر کے سر دکر گیا تھا۔ کا تیا سے پروفیسر کو بڑی محبت ہے، لیکن عمر کے تفاوت سے دونوں میں ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی

صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ کاتیا کو نامک کا بڑا شوق تھا، مگر شروع جوانی میں اسے ایسی ناکامی اور ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ وہ بیزار ہو کر گھر بھاگ آئی۔ جس زمانے کی بدمزہ کہانی پر و فیر صاحب ہمیں سناتے ہیں اس وقت کاتیا الگ مکان میں رہتی ہے، پر و فیر سے جب ملاقات ہوتی ہے تو وہ بوچھتی ہے کہ کچھ بتائیے کیا کروں اور پر و فیر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دیں۔ کاتیا اپنے غم میں ایسی مبتلا ہے کہ اسے پر و فیر کے غم کا خیال ہی نہیں آتا اور وہ ہر وقت اپنی زندگی کو کارآمد نہیں تو قابل برداشت بنانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ آخر میں جب کاتیا پر و فیر سے رخصت ہو کر کہیں چلی جاتی ہے اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ نہ بڑے پر و فیر کو کبھی کوئی ہمدرد اور غم گسار ملے گا نہ چوان کاتیا کو، تو دل پر مایوسی کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں ہم کسی بے پناہ مصیبت کی داستان کے ورق الٹ رہے ہیں، حالانکہ واقعات کو دیکھتے تو اس قصے میں وہ چیز جسے آسان کا جور و ستم کہتے ہیں بالکل ہے ہی نہیں۔ اسی طرح اچھے لوگ، ایک بھائی بہن کا قصہ ہے جن میں محبت بہت ہے مگر ساکھ ہی مذاق اور خیالات کا ایسا اختلاف ہے کہ وہ حقیقت میں بیگانہ اور ایک دوسرے سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ آخر میں محبت کے باوجود ان میں ناچاتی پیدا ہو جاتی ہے، بہن اپنے دل کے جو صلیے پورے کرنے کو بستر کندھے پر رکھ کر کہیں غریبوں کی سیوا کرنے چلی جاتی ہے، بھائی گھر پر رہ کر مضمون نگاری کا شوق پورا کرتا رہتا ہے اور پھر دونوں نہ کم

ملتے ہیں نہ ایک کو دوسرے کی خبر ہوتی ہے۔ ایسے ہی ڈرامے کی تمہید ”گھر پر“
 ہے، جس میں ایک ہونہار، حوصلہ مند اور سلیقہ شعار لڑکی کا تعلیم سے
 فارغ ہو کر گھر واپس آنا دکھایا گیا ہے۔ لڑکی گھر پہنچ کر اپنے عزیزوں سے
 بڑی محبت سے ملتی ہے اور اس کی بہت خاطر کی جاتی ہے، مگر چند روز بعد
 جب وہ ایک بچی کو جو گھر میں نوکرہ رہتی تھی دیکھتی ہے اور اس پاس کے لوگوں
 سے ملاقات کرنے پر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی ذرا بھی ہنڈ
 اور دل چسپ نہیں تو اس کی کیفیت بالکل بدل جاتی ہے اور اپنی تنہائی
 اور زندگی کی یک رنگی سے نجات پانے کے لیے وہ ایک ڈاکٹر سے شادی
 کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں، نہ ڈاکٹر میں کشش پیدا
 کرنے والی کوئی خوبی ہے اور ایسے میاں بیوی کی زندگی جیسی ہو سکتی ہے
 وہ ظاہر ہے، خصوصاً جب جی بھلانے کو کوئی شغل بھی نہ ہو۔ بعد کی سرگزشت
 افسانے میں بیان نہیں ہوتی۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔
 ”برسرِ راہ“ کا موضوع روسی سیرت کا وہ نمونہ ہے جس کی مثال
 تو رگینف نے ردون کی شخصیت میں پیش کی ہے۔ ردون کی طرح
 چوٹ کا ہیر و لیٹا رت بھی بہت وجیہ آدمی ہے۔ اس کی جوشیلی
 طبیعت اور ایٹا را سے تن دہی اور خود فراموشی کی انتہا تک پہنچا
 دیتا ہے۔ اس کی خوش کلامی لوگوں پر جادو کر دیتی ہے، اس کے ساتھ
 دوسرے بھی اس کے مقاصد کے فدائی بن جاتے ہیں۔ لیکن ردون
 کی طرح اس کی طبیعت میں بھی اس قدر تلون ہے، اس کی تن دہی

استقلال سے ایسی محروم ہو کہ ہر قسم کا نقصان، صدمہ اور ذلت اٹھانے کے بعد وہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے اور جب چالیس سال کی عمر میں وہ اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرتا ہے تو اسے تسکین دلانے کے لیے کوئی کامیابی، کوئی تکمیل کو پہنچا ہوا کام نظر نہیں آتا۔ چخون کے ایجاز نے لیخارف کی سرگزشت کو رودن کی سوانح عمری سے بہت زیادہ پُر تاثیر بنا دیا ہے اور اس کی داستان کا پس منظر بھی بہت زیادہ موزوں اور پُر معنی ہے۔ جاڑوں کے موسم میں جب برف کے بھونچالوں اور طوفانوں سے زمین کانپ رہی ہے، لیخارف، جو کسی دور افتادہ مقام پر ملازم ہو گیا ہے اپنی چھوٹی لڑکی کو ساتھ لیے وہاں جا رہا ہے۔ رستے میں موسم کی ناسازگاری اسے ایک ادنیٰ سڑکے میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے اور یہیں ایک نوجوان لڑکی کو جو اپنے ایک گائوں سے دوسرے گائوں کو جا رہی ہے رات بھر کے لیے قیام کر رہا ہے۔ لڑکی بہت ہوشیار، سلیقہ مند اور ہمت والی ہے۔ باپ اور بھائیوں کو نا اہل دیکھ کر اس نے جائداد کا انتظام اپنے ذمے لے لیا ہے اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔ جب لیخارف اس سے گفتگو چھیڑ کر اپنی ساری سرگزشت سنا تا ہے اور اس کی گرم گفتاری کو اپنی تاثیر دکھانے کا موقع ملتا ہے تو لڑکی کے آنسو بہنے لگتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ذرا دیر اور لیخارف کی غنیمت اس پر اثر ڈالتی رہی تو وہ بھی اس کی گرویدہ ہو جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آتی۔ جب دوسرے دن لڑکی

سلج پر بیٹھ کر روانہ ہونے لگی۔ تو اس نے گھوم کر لیخارف کی طرف اس طرح دیکھا کہ گویا اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ لیخارف اس کے پاس دوڑ کر گیا، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، بس اسے دیکھتی رہی۔۔۔ معلوم نہیں لیخارف کے نکتہ رس ذہن نے اس نظر کی صحیح تعبیر کر لی تھی یا یہ محض ایک خیال تھا، مگر اسے یکبارگی محسوس ہونے لگا کہ اگر وہ لڑکی کے دل کے تاروں کو ذرا اور چھیڑ سکتا تو وہ اس کا بڑھا پا، اس کی سبکی اس کی ناکامیابی سب معاف کر دیتی اور بغیر کسی سوال و جواب کے اس کے پیچھے ہو لیتی۔ وہ بہت دیر تک اسی جگہ کھڑا سلج کی لکھیں دیکھتا رہا۔ سلج کے نشان برف میں چھپ گئے، وہ خود برف سے اس طرح اٹ گیا کہ ایک سفید چٹان معلوم ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں برف کے بادلوں میں کچھ تلاش کرتی رہیں۔“

لیخارف کی لا حاصل کوششیں جنہیں وہ کسی مقصد کے پورے کرنے میں استعمال نہ کر سکا تعلیم یافتہ روسیوں کی روحانی بے چینی کا ایک پہلو تھیں۔ اس بے چینی کی ایک اور صورت ان لوگوں کی جدوجہد میں نظر آتی ہے جو اپنی زندگی میں روسی عوام کے طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے، جن کا خیال تھا کہ اگر تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت یورپی اثرات کے میل سے پاک کر دی جائے تو اس کے کل امراض کا ایک نئے سے علاج ہو جائے گا۔

لے بنیر ہیوں کی کھاڑی جس پر روس میں جاڑوں کے زمانے میں سفر کیا جاتا ہے۔

انشا پردانوں میں تالستانی کی زبردست شخصیت نے اس تصور کی نمائندگی اور اس کا پرچار کیا، اور چخوف کا افسانہ ”میری سرگزشت“ اسی کے اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے کی تصنیف میں بھی چخوف نے اپنا خاص طریقہ چھوڑ کر تالستانی کا طرز اختیار کیا اور دراصل وہ ایک مشق ہے، مگر اتنی کامیاب مشق کہ تالستانی کے بہترین افسانوں سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ”میری سرگزشت“ کا ہیرو پوزلف اپنے آپ کو مزدوری کرنے کے سوا اور کسی کام کے لائق نہیں سمجھتا اور مزدوری کرنے لگتا ہے۔ خاندان کی آبروریزی کی سزا میں اس کا باپ اسے عاق کر دیتا ہے، اس کی بیوی، ایک امیر انجینئر کی لڑکی جس نے آغوشِ فطرت میں زندگی بسر کرنے کے شوق میں اس سے شادی کی تھی کسانوں کی بے تمیزیوں اور دیہاتی معاش سے اُتار کر بھاگ جاتی ہے، لیکن ان سب کے باوجود پوزلف مزدوری کا پیشہ نہیں چھوڑتا۔ چخوف نے اپنے ہیرو کی سیرت، اس کے خیالات، جو سچ پوچھا جائے تو اس کی خلقی مجبوریوں کا نتیجہ ہیں، اس کے ماحول پر ان کا اثر، اس کے خود پرست باپ کا عقیدہ اس کی بہن کی تھپی ہمدردی، اس کے طبقے کے لوگوں کی حیرت اور حقارت آمیز سلوک، یہ سب نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز طریقے پر دکھایا ہے۔ معاشرت کے انقلاب کی اس سے بہتر اور معنی خیز شاید ہی اور کوئی تصویر ہوگی۔

چخوف کا خاص موضوع تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت اور ذہنیت

ہو۔ لیکن ردی عوام کی زندگی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہی۔ وہ افسانے جن میں اس نے کسانوں کے رہتے بہتے کے طریقے اور ان کے اخلاقی فلسفہ حیات کو بیان کیا ہو نکتہ چیں نقادوں کے نزدیک فن کے اعتبار سے زیادہ کامیاب اور حقیقت نگاری کی رو سے بالکل صحیح نہیں ہیں۔ لیکن جہالت، درد کی کیفیتیں اور مغلسی کی مصیبتیں بیان کرنے میں اسے کمال ہو۔ ”اندھیرا“ چند صفحوں میں جہالت اور بے کسی کی ایک لمبی اور دل گداز داستان سنا دیتا ہے کسی ہسپتال میں ایک نوجوان کاشت کار ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور التجا کرتا ہے کہ میرے بھائی کو چھوڑ دیجئے اس کی ماں اور بیوی بچے اسے بہت یاد کرتے ہیں، گھر پر کھانے والے بہت اذیت دے والے کوئی نہیں۔ اس کا بھائی ایک مجرم ہے جسے تین سال کی سزا ہوئی ہے اور وہ ہماری کی وجہ سے چند روز کے لیے ہسپتال بھیجا گیا ہے۔ نوجوان کاشت کار اور تمام افسوس مایوس ہو کر ڈاکٹر کے پاس آیا ہے اور ڈاکٹر اسے کسی طرح یقین نہیں دلا سکا کہ اسے مجرموں کو چھوڑ دینے کا اختیار نہیں۔ کاشت کار ڈاکٹر کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور ڈاکٹر گھبراہٹ سے ہسپتال کے اندر چلا جاتا ہے۔ کاشت کار سمجھتا ہے کہ یہ بے رنجی محض رشوت وصول کرنے کا بہانہ ہے، رشوت دینے کو اس کے پاس روپیہ نہیں اس لیے ایک افسر کی خواہش کرنے کے بعد وہ پھر اپنے پورے باپ کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور دونوں ڈاکٹر کا دل نرم کرنے کے لیے اس کے قدموں پر گر پڑتے ہیں۔

”اندھیرے“ کی طرح ”مجرم“ میں بھی کسانوں کی جہالت اور وہ ذہنی تاریکی جس میں وہ گھرے ہوئے تھے نہایت درد انگیز و نگر ساتھ ہی مضحک صورت میں نظر آتی ہے۔ ایک کسان ریل کی پٹری

بیچ کھولنے کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ اس نے بیچ اس لیے کھولے تھے کہ
 نمپٹنی کی شست کے لیے لنگر کی ضرورت تھی اور اسے سخت حیرت
 ہوتی ہے۔ جب منصف کہتا ہے کہ تم نے ایسی حرکت کی ہے جس سے ریل
 گاڑی کے الٹ جانے اور سینکڑوں مسافروں کے ہلاک ہونے کا
 اندیشہ ہے۔ کسان کو اپنی حرکت سے انکار نہیں اور اسے قید کی سزا
 دی جاتی ہے، لیکن وہ آخر وقت تک اسی خیال میں رہتا ہے کہ کسی
 نے دراندازی کی ہے، کیوں کہ پٹری کے بیچ نکالنا اس کے نزدیک
 ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے کسی بے گناہ اور امن پسند آدمی
 کو سزا دی جائے۔

چخوف کے نوانی کیرکڑوں میں سب سے مشہور ”پیاری“ کی
 ہیروین اولنگا ہے۔ وہ اپنے تروتازہ، مسکراتے ہوئے چہرے اور نیک،
 محبت بھری طبیعت کی بدولت شروع جوانی میں ”پیاری“ کے
 لقب سے مشہور ہوئی۔ پہلے اس کی ایک ٹیشر کے مالک سے شادی
 ہوتی ہے، جب تک وہ اس کے ساتھ رہتی ہے اس کے کاروبار میں
 غدد دیتی ہے اور ہر وقت اور ہر شخص سے ٹیشر کی باتیں کرتی رہتی
 ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا شوہر مر جاتا ہے اور ایک لکڑی کا سوداگر
 اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ دوسرے شوہر کو نامک سے مطلق دیکھپی
 نہیں، ”پیاری“ کبھی ٹیشر نہیں جاتی اور کوئی جانے کو کہتا ہے تو وہ
 جواب دیتی ہے کہ ایسی فضول باتوں کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے

نہ میرے شوہر کے پاس۔ اب اس کی گفتگو کا مستقل موضوع لکڑی کا بھاؤ اور تجارت کی دشواریاں ہو جاتی ہیں اور رات کو بھی اسے خواب میں لکڑیوں اور تختوں کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔ شادی کے چھ سال بعد ”پیاری“ پھر بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کی خبر گیری کے لیے سوائے ایک مویشیوں کے ڈاکٹر کے اور کوئی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر سے اس کی صرف کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے، لیکن یہ ذرا سال قلیق، ”پیاری“ کو مویشیوں کی بیماریوں سے واقف کرنے اور انہیں اپنی گفتگو کا موضوع بنانے کے لیے کافی ہے۔ بد قسمتی سے ڈاکٹر کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور پھر کئی سال تک ”پیاری“ بالکل اکیلی رہتی ہے۔ اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس کے خیالات وہ اختیار کر لے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں سے کیا باتیں کرے۔ آخر میں وہی مویشیوں کا ڈاکٹر ملازمت ترک کر کے اسی شہر میں بسنے کے ارادے سے آتا ہے۔ ”پیاری“ اسے اس کی بیوی اور دس سال کے بچے کو اپنے مکان میں رکھتی ہے اور اس کی زندگی کا چراغ پھر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ بچے کی پرورش میں مشغول اور اس کی روزمرہ زندگی میں بالکل محو ہو جاتی ہے، اسے کھلاتی پلاتی ہے، اسکول کے آدھے رستے تک اس کے ساتھ جاتی ہے اور جو کوئی ملتا ہے اس سے شکایت کرتی ہے کہ چھوٹے درجوں کے سبق بہت مشکل ہوتے ہیں اور لڑکوں سے ایسے سوال پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب انہیں کبھی بتائے نہیں گئے۔

اس قصے پر تنقید کرتے ہوئے تالسائی نے لکھا ہے کہ مصنف کا مقصد عورت کا مذاق اڑانا اور یہ خیال پیدا کرنا ہے کہ عورت کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں، وہ مرد کی شخصیت کا محض ایک عکس ہے۔ تالسائی کی رائے میں چخوف اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوا ہے، کیوں کہ ہم "پاری" پر ہنسنے کی بجائے اس کے جذباتِ ایشار کے فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن چخوف نے درہل کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے بس نسوانی سیرت کا ایک مرقع کھینچا ہے اور ہم اپنے مذاق کے مطابق "پاری" کو مضحک یا محبت و احترام کی مستحق سمجھ سکتے ہیں۔ "پاری" کے علاوہ نسوانی سیرت کی اور بھی قسمیں ہیں جن کے مثالی نمونے چخوف نے "وودو دیا"، "مدو گار"، "بے بس مخلوق"، "پراسرار فطرت" میں پیش کیے ہیں۔ "پراسرار فطرت" فن کے اعتبار سے ایک کارنامہ ہے۔ چخوف نے تین چار صفحوں میں ایک دولت پرست عورت کا روپے پر اپنی جوانی اور حسنِ شمار کرنے کا قصہ خود اس کی زبانی سنایا ہے اور نہایت ظریفانہ طریقے پر ایسی عورتوں کی خود ستائی اور خود فریبی، بناوٹی حوصلہ مندی اور روحانیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

چخوف کا فنی کمال، اس کے احساس کی نزاکت اور گہری انسانی ہمدردی سب سے بہتر ان افسانوں میں ظاہر ہوتی ہے جن کا موضوع دل کا درد ہی یا وہ چھوٹے بڑے صدمے جو ہم میں سے ہر ایک

کو پہنچتے رہتے ہیں یا وہ حسرتیں جو دل کو تڑپایا کرتی ہیں۔ اس طرز کے افسانے بہت ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ بے مثل ہے۔ چخوف کے نقشِ نازک اور باریک ہوتے ہیں، اس کے اشارے اور کنایے پُر معنی، وہ قصے کو کبھی اس طرح نامکمل چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود بخود پڑھنے والے کے ذہن میں انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اسے آپ بیتی معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ ایک ذرا سے واقعے یا معمولی سی بات کے ذریعے سے کسی کی زندگی کی فضا، کسی کے درد کی داستان آنکھوں کے سامنے پھیر دیتا ہے اور وہ ہزار ہا نکتے جو زبان اور قلم سے بیان نہیں ہو سکتے اس کی آدھی کہی ہوئی بات میں بیان ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ”تخصیص“ میں ایک ڈاکٹر کسی امیر کی لڑکی کو دیکھنے کے لیے شہر سے کچھ دور بکلیا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ ایک کارخانے کا مالک ہے۔ اس کا مکان بھی کارخانے کے احاطے میں ہے اور اس طرح لڑکی دلچسپیوں اور صحبت کے لطف سے اس قدر محروم رہتی ہے کہ کتا اُکتا کر وہ خواہ مخواہ بیمار پڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہتا ہے کہ تمہیں ایسی جگہ رہنا اور ایسی زندگی بسر کرنا اپنی قسمت کا لکھا نہ سمجھ لینا چاہیے۔ جب دوسرے دن سویرے ڈاکٹر رخصت ہونے لگتا ہے تو لڑکی سفید کپڑے پہنے اور بالوں میں پھول لگائے ہوتی ہے۔ یہ ذرا سی باتیں بتا دیتی ہے کہ ڈاکٹر کے کہنے کا لڑکی کے دل پر کتنا گہرا اثر ہوا ہے،

اور اب وہ اپنی زندگی میں لطف اور دنیا سے لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرنے والی ہو۔ خوف کا انداز بیان پڑھنے والے کو بھی لڑکی کی امیدوں اور آرزوؤں کے سیٹھے میٹھے جوش میں شریک کر دیتا ہے، اور وہ بھی اس کی خوشی منانے لگتا ہے کہ ایک انسان کے دل کو افسردگی اور غم سے نجات ملی اور اب آزادی کی خواہش اسے دنیا کی سیر کرائے گی اور اس کی شخصیت نشو و پائے گی۔ اسی طرح ایک اور قصے میں ایک عورت جسے اپنے شوہر سے بہت بجا شکایتیں ہیں کسی صحت گاہ میں ایک صاحب سے آشنائی کر لیتی ہے۔ یہ آشنائی اخلاق کی رو سے درست نہیں، لیکن وہ بگڑی ہوئی زندگی کو بنانے کی ایک آخری کوشش ہے اور اس وجہ سے بہت جلد سچی محبت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کو پُرانے رشتے توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی امید نہیں، پھر بھی آخری گفتگو کے بعد انھیں ”معلوم ہونے لگا کہ بس اب تھوڑی سی دیر میں ان کی ہماری دشواریاں رفع ہو جائیں گی اور وہ ایک نئی اور شان دار زندگی بسر کرنے لگیں گے“ اس قسم کے افسانے خوف عموماً ایک لطیف مایوسی کے انداز میں اور پڑھنے والے کے دل میں ایک خوش گوار حسرت پیدا کر کے ختم کرتا ہے۔ ”وہ ایک مصور کی کہانی“ ”اُمی اوپنچ“ ”وہ دسے روچکا“، ”ایک خاتون کی سرگزشت“ ”محبت کے رشتے کو قائم ہو کر ٹوٹے دکھاتے ہیں اور محض اس سبب سے

کہ ان میں مبالغے اور جذبات پرستی سے بالکل پرہیز کیا گیا ہو دہستان اور بھی زیادہ دل گداز ہو جاتی ہو۔ ”جہیز کے سامان“ میں مایوسی کا رنگ بہت گہرا ہو۔ یہ ایک فوجی افسر کی بیوہ کا قصہ ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے سامان تیار کرتی رہتی ہے۔ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بیٹی کی شادی کبھی ہوگی نہیں اور اس لیے ماں بیٹی کا شوق اور اہٹاک دیکھ کر ہمارے آنسو بہتے بہتے رہ جاتے ہیں۔ ”بوسہ“ اور ”دل لگی“ اس طرز کے بہترین افسانے ہیں۔ ”بوسہ“ ایک بد صورت اور بدقع فوجی افسر کا قصہ ہے جو عورتوں کی توجہ سے بالکل محروم رہتا ہے اور اس کی ساری دلی آرزوئیں اندر ہی گھٹ گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ کہیں کھانے اور تاج کی دعوت ہوتی ہے اور چونکہ فوجی افسر کو ساتھ نہ چنے کے لیے کوئی خاتون نہیں ملتی ہے، وہ وقت کاٹنے کے لیے میزبان کے گھر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔ اتفاق سے وہ ایک کمرے میں پہنچتا ہے جو ذراتا ریخا ہے اور یہاں ایک عورت یکبارہ لگی آکر اس سے لپٹ جاتی ہے اور اسے ایک بوسہ دیتی ہے۔ عورت اپنی غلط فہمی محسوس کرتے ہی چلا کر بھاگ جاتی ہے، لیکن فوجی افسر کو یہ ناگہانی پیار یاد رہتا ہے اور جب کبھی اس کا دل سنج سے بھر آتا ہے تو وہ اس واقعے کو یاد کر کے اپنا غم غلط کیا کرتا ہے۔ یوں ہی وہ لوگ جنہیں اپنی آرزوئیں پوری کرنے کی امید نہیں ہوتی کسی اتفاقی بات کو اپنا سہارا بنا لیتے ہیں اور اپنی روکھی ہوئی قسمت کی کسی جھوٹ موٹ

کی مہربانی سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔ ”دل لگی“ میں ایک نوجوان اپنی کسی عزیزہ کو برف پر پھسلنے کے واسطے لے جاتا ہے اور اس وقت جب تختے کی گاڑی بہت تیزی سے نیچے کی طرف پھسلتی ہوتی ہو وہ جھپکے سے ایک پیار کا لفظ کہہ دیتا ہے۔ لڑکی اس طرح پھسلنے سے بہت ڈرتی ہے، لیکن وہ پیار کا لفظ اس کے کان میں پڑ گیا، بدحواسی میں وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ آواز کہاں سے آئی ہے، مگر پیار کا لفظ سننے کے شوق میں اور یہ معلوم کرنے کو کہ آواز کہاں سے آئی تھی وہ بار بار اپنے خوف کے باوجود دل کڑا کر کے اسی طرح پھسلنے پر رضی ہو جاتی ہے۔ لڑکا ہر دفعہ وہی شرارت کرتا ہے مگر لڑکی کو پتا نہیں چلتا اور پیار کا لفظ سننے کا اشتیاق اسے بے چین رکھتا ہے۔ یہی حرکت لڑکے نے ایک مرتبہ اس وقت کی جب لڑکی گھر کے باغیچے میں گھڑی تھی اور اس واقعے کے بہت دنوں بعد بھی وہ اس امید میں رہتی ہے کہ اسے وہ لفظ سنائی دے گا، اس لیے اکثر باغیچے میں جا کر چپ چاپ گھڑی رہتی ہے کہ شاید پھر سنائی دے۔ اس کی شادی ہو گئی، بچے ہوئے، مگر وہ پیار کا لفظ اسے نہیں بھولا اور اسے دوبارہ سننے کا اشتیاق باقی رہا۔

چونکہ بہترین دروان گنیرافانے جن میں لطیف جذبات کی تصویر نہیں ہے، ”دشمن“، ”معصیت“، ”آرزوئیں“، ”رائیکا“ اور ”الیشہ کی شام“ میں۔ ”دشمن“ میں ایک جوان آدمی جس کی بیوی

بیمار ہی ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہی۔ اس روز اس ڈاکٹر کے اکلوتے بچے کا انتقال ہوا ہی اور ڈاکٹر کی بیوی رنج میں دیوانی ہوئی جا رہی ہی۔ ڈاکٹر گھر چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا، لیکن جوان آدمی کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہی۔ اس کے گھر پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہی کہ اس کی بیوی نے بیماری کا بہانہ کیا تھا اور شوہر کی عدم موجودگی میں اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہی۔ جوان آدمی کو بیوی کے مکر و فریب پر غصہ آتا ہی اور اس کے بھاگ جانے کا غم ہی، ڈاکٹر کو اپنے بچے کی موت اور بیوی کی پریشانی کا خیال ستاتا ہی۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے مددے کا مطلق لحاظ نہیں کر سکتا، ڈاکٹر جوان آدمی کو یہودہ اور خود غرض سمجھ کر اس پر خفا ہونے لگتا ہی، نو جوان آدمی ڈاکٹر کو لالچی اور بے حس فرض کر کے اس کی اور اس کے غم کی توہین کرتا ہی اور اس طرح یہ دونوں مصیبت کے مارے جنہیں ایک دوسرے سے ہم دردی کرنا چاہیے تھا خواہ مخواہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ”مصیبت“ ایک بوڑھے گاڑی بان کی داستان ہی۔ اس کا نو جوان لڑکا جس سے اسے بہت محبت اور بڑی امیدیں تھیں مر گیا ہی۔ بیچارے کو کوئی ہمدرد نہیں ملتا اور اس لیے وہ ان تمام لوگوں کو جو اس کی گاڑی میں بیٹھے ہیں اپنے غم کا افسانہ سنانے کی کوشش کرتا ہی۔ لیکن وہ سب اپنی اپنی فکر میں مبتلا ہیں، بوڑھے گاڑی بان کی کوئی نہیں سنتا۔

آخر میں جب وہ گھر واپس ہوتا ہے تو اس کی حسرت ویسی کی ویسی ہی رہ جاتی ہے۔ گھر پر وہ اپنی تنگی ماندی گھوڑی کو پیار کرنے لگتا ہے، یہ ذرا سا پیار ان تمام جذبات کے پھوٹ نکلنے کا رستہ بن جاتا ہے جو اس کے دل میں اُمنڈ رہے تھے، اور ان کے سیلاب کو روکنے کی اس میں تاب نہیں رہتی۔ وہ اپنی گھوڑی کو صطبل لے جا کر اس کے سامنے چار رکھ دیتا ہے اور اسے دل کھول کر وہ ساری رام کہانی سنا دیتا ہے جسے کوئی ہم جنس سننے پر راضی نہ تھا۔ یہی درد جس کی شدت ظرافت کے ذریعے سے کچھ کم کر دی جاتی ہے، ”وانکا“ اور ”آرزوؤں“ کا موضوع ہے۔ ”وانکا“ ایک یتیم لڑکا ہے جسے اس کے سرپرست بڑی تکلیف سے رکھتے ہیں۔ اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنے گائندہ واپس چلا جائے جہاں اس کا خیال ہے کہ اس کا دادا رہتا ہے اور آخر میں وہ اپنی کل شکایتیں ایک میلے کاغذ کے ٹرے پر لکھتا ہے اور ”میرے دادا کو، جو گائندہ میں رہتے ہیں“ پتے کی جگہ لکھ کر کاغذ کو ڈاک کے ڈبے میں ڈال دیتا ہے۔ ”آرزوؤں“ میں ایک مفرد و مجرم دو پولیس والوں سے جو اس کو تھانے پر لینے جا رہے ہیں اپنے ارادے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر جیل خانے میں رکھنے کے بجائے مجھے ساٹی بیرا بھیج دیا گیا تو مجھے امید ہے کہ مجھے کاشت کے لیے تھوڑی سی زمین مل جائے گی، میں اپنا چھوٹا سا باغ لگاؤں گا اور میرے دن بڑے مزے سے کٹیں گے۔ اس کی باتیں سنتے سنتے ایک پولیس والا بڑی بے دردی سے اس سے کہتا ہے کہ تمہاری صحت بہت خراب ہے اور

تم سائی ہیریا میں چھوہینے بھی زندہ نہ رہ سکو گے۔ یہ سن کر مجرم کی ساری
امیدوں پر پانی پھر جاتا ہوا، اس کی آنکھوں کی روشنی دھیمی پڑ جاتی ہوا
کمر جھک جاتی ہوا اور رستے بھر وہ منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا۔

مختصر افسانوں کے علاوہ چخوف نے چند لمبے قصے اور افسانے لکھے
مضامین بھی لکھے۔ ”ڈیوئل“ اور ”سٹیپ“ جو اس کے سب سے لمبے
افسانے ہیں کوئی قابل ذکر خوبی نہیں رکھتے اور ان میں صرف یہ ظاہر
ہوتا ہوا کہ چخوف کا خاص طرز مختصر افسانے کے سوا اور کسی قسم کی داستان
کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کے افسانے نامضامین
خصوصاً ”حسین چہرے“، ”بچے“، ”گریشا“، ”نیند“ وغیرہ بہت اچھے
ہیں۔ ”حسین چہرے“ میں اس نے تین لڑکیوں کی صورتوں کا نقشہ
کھینچا ہے جن کا اس پر بہت اثر ہوا تھا اور وہ میٹھا میٹھا درد بیان کیا
ہے جو حسن کا دیدار دل میں پیدا کرتا ہے۔ ”بچے“ چار پانچ ننھے بچوں کی
داستان ہے جو شام کو والدین کی عدم موجودگی میں باہر کرتاش کھیلے ہیں
اور پھر ایک ہی پلنگ پر لے کر سو جاتے ہیں۔ اسے وہی لکھ سکتا تھا جسے
بچوں سے محبت ہو اور جان کی ہر حرکت کا محسوس مگر شعاع انداز سمجھ
سکتا ہو۔ ”گریشا“ ایک دو برس کے بچے کی سرگزشت ہے اور اس میں
شعور کے آغاز کی کیفیت جس خوبی اور صحت سے بیان کی گئی ہے اس
پر ہر ماہر نفسیات رشک کر سکتا ہے۔ فن کے اعتبار سے ”نیند“ کا درجہ
ان سب سے بلند ہے۔ اس میں ایک آٹھ نو سال کی بچی کی نیند کی

شدت اور وہ اثر جو نیند کی شدت کا نظر اور حواس پر ہوتا ہو دکھایا گیا ہو بیان کی صفت یہ ہے کہ پڑھنے والے پر بھی غنودگی طاری ہو جاتی ہے، بچتی کی طرح اس کی نظر میں بھی فرق آ جاتا ہو اور وہ تمام تکلیفیں اسے بھی محسوس ہوتی ہیں جو بیچارہ کی کچی سہتی ہے۔

چخوف کی زندگی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہوا اور بعض زبانوں میں کئی کئی مختلف ترجمے ہوئے۔ اسے یہ بے نظیر عزت بھی حاصل ہوئی کہ جرمنی کے شہر ہاڈوں وائلر میں، جہاں اس کا انتقال ہوا تھا اس کے مرنے کے چھو سال بعد اس کی مورت بطور یادگار کے نصب کرائی گئی۔ روس کے باہر اب بھی وہ اپنے فن میں کامل اور افسانہ نویسی کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ لیکن روس میں اب اس کی قدر نہیں رہی ہے۔ اس زمانے کے روسی اس دور کو جب چخوف کی شہرت عروج پر تھی پستی اور انحطاط کی انتہا سمجھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ روس میں پھر اس قسم کے لوگ پیدا ہوں۔ چخوف کو انقلاب کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ نئی زندگی کا بڑی عقیدت اور محبت سے خیر مقدم کرتا اور تب شاید روسی نوجوان اس کی یاد تازہ رکھنا اپنا فرض سمجھتے۔ ہم روس کی نئی پود پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، اس لیے کہ اس زندگی اور ان لوگوں پر جن کی چخوف نے جیتی جاگتی تصویریں کھینچی تھیں ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی جو حوصلہ نہ

اور جوانی کے لیے مہلک ہوتی ہے اور نئے دور میں اگر کچھ ہے تو جوش اور جوانی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روسی چخوف کو ہمیشہ کے لیے بھول گئے ہیں۔ جب ان کی نئی زندگی اور نئی تہذیب تکمیل کو پہنچ جائے گی اور انھیں اس کی مہلت ملے گی کہ دائمی اخلاقی مسائل اور انسانی سیرت کے نہ مٹنے والے نقشوں پر غور کریں تو وہ چخوف کی تصانیف کے مجھے ہوئے چراغ کو بھر روشن کریں گے، جن تصویروں پر اب گرد جم رہی ہے انھیں صاف کر کے شوق سے دیکھیں گے اور کوئی تعجب نہیں اگر ان پرانی تصویروں میں انھیں اپنی ہی صورت نظر آئے۔

گیارھواں باب

ماکسیم گورکی (۱۸۶۹ - ۱۹۳۶)

جس طرح روسی زندگی کا ایک بڑا دور انقلاب پر آکر ختم ہوتا ہے ویسے ہی ادیبوں کا ایک سلسلہ ہے جو انقلاب کے طوفان میں غائب ہو جاتا ہے۔ گورکی اس سلسلے کا آخری رکن تھا اور اس کی ابتدائی زندگی اور ادبی خصوصیات کا بیان پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ روسی ناول نویسی کا ایک سلسلہ اس پر صمیم معنوں میں ختم بھی ہو گیا۔ تاسٹائی کے بعد فلسفہ معاشرت و ستہ نفسی کے بعد نفسیات اور روحانیات، چخوف کے بعد تعلیم یافتہ طبقے کی عام زندگی کو ناول کا موضوع بنانا استادوں کے کام میں اصلاح دینا تھا، جو کہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہوتی اور اس کا نتیجہ جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ گورکی نے عوام کی زندگی، ان کے جذبات اور احساسات کی تصویریں کھینچ کر روسی ناول کو قومی زندگی کا مکمل آئینہ بنا دیا۔ اس کے بعد یا تو زندگی بدلتی، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا، یا ناول لکھنا چھوڑ دیا جاتا۔ کوئی تیسری صورت نہ تھی۔

ماکسم گورکی کا اہل نام الک سے مئی ماکسی مووچ مٹیکوٹ تھا۔ وہ شہر اسراخان میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ اد نے حیثیت سے شروع کر کے رفتہ رفتہ جہاز بران کپنیوں کا ایجنٹ ہو گیا تھا۔ گورکی چار پانچ سال کا تھا جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کی ماں اسے لے کر اپنے باپ کے یہاں چلی گئی، جونوٹ گورو د میں رنگریری کا کام کرتا تھا۔ اس وقت سے جوانی تک کی سرگزشت گورکی نے دونوں میں بیان کی ہے، ”بچپن“ اور ”غیروں میں“ اور ایسے ناووں کے لیے اس کی سرگزشت سے بہتر موضوع ملنا بہت مشکل ہے۔ گورکی کے نانا کی حالت اس وقت کچھ اچھی نہ تھی، افلاس کے ساتھ اس کی بد مزاجی اور طبیعت کے اور بہت سے عیب ابھر آئے تھے اور جن لوگوں پر اس کا بس چلتا ان پر وہ اپنا غصہ اتارا کرتا تھا۔ لیکن گورکی کے لیے اس کا نواسا ہونا سرسبز بستی نہ تھی، کہ اگر اسے ایک طرف نانا کی کمینی باتیں سننا اور سختیاں برداشت کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف نانی کی محبت میں اس کے لیے ایک ایسا ٹھکانا تھا جہاں پہنچتے ہی دل کا دکھ اور ظلم کا خوف اسی طرح دور ہو جاتا جیسے ڈراؤنے خوابوں کی وحشت آنکھ کھل جاتے سے۔ باپ کے یہاں تھوڑے دنوں رہنے کے بعد گورکی کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور پھر جلد ہی دق کا شکار ہوئی۔ نانا نے موقع کو غنیمت جانا اور گورکی کو گھر سے نکال دیا۔

اب وہ ”غیروں“ میں پہنچ گیا۔ پہلے اسے ایک جوتے والے کی

دکان پر نوکری ملی، جہاں طرح طرح کے گاہک آیا کرتے تھے۔ یہاں اس نے پہلے پہل دنیا کا حال دنیا والوں کی زبانی سنا، عیاشی اور بدکاری کی دہشت سنیں اور جیسے کتے گلی کوچوں میں غلیظ چاٹتے پھرتے ہیں ویسے ہی آدمیوں کو دوسروں کی گھنگاری کا فضلہ مزے لے لے کر کھاتے دیکھا۔ دکان چھوڑنے کے بعد وہ کئی مہینے تک ایک جہاز کے باورچی خانے میں برتن دھو کر بیٹ پالتا رہا۔ باورچی پہلا شخص تھا جس نے نوجوان گور کی تعلیم پر توجہ کی اور یہ اسی کا احسان تھا کہ گور کی نے ذرا پڑھنا لکھنا سیکھ لیا۔ مگر برتن دھونے کا کام ایسا تھا کہ گور کی کے کیے ہوتا نہ تھا، وہ اس کام سے بچھا چھڑا کر کسی شہر میں ایک آوارہ عورت کے پاس نوکر ہو گیا جہاں شعر و شاعری اور موسیقی کا خاصا چرچا رہتا تھا اور اسے ادب سے ایک لگاؤ ہو گیا جس نے تعلیم کے شوق کو بہت بڑھا دیا۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر شعر اور گیت کو اس طرح برہنہ دیکھ لیں جیسے کہ گور کی نے دیکھا تھا تو ان سے منہ پھیر لیں، لیکن گور کی نے اخلاقی تربیت پائی نہ تھی، اچھے اور بُرے کی اسے تمیز نہ تھی، اس کے لیے بس آدمی کی ذات تھی اور قدرت کی بے پروا صورت گری کہ آدمی کو حبسا چاہتی بنا دیتی۔ اس کے علاوہ گور کی ابھی نابالغ بھی تھا، ورنہ شاید ایسی محبت میں اس کی طبیعت اور زندگی کا رنگ بالکل بدل جاتا۔ ہاں اور ایک بڑا سہارا اس کی غریبی بھی تھی، جس نے بھوک اور سردی کی دلدلیاں رستے کے ادھر اُدھر کھڑی کر کے اسے بٹھکنے سے اس طرح روکا کہ جیسے

اُستاد کی نصیحتیں اور ملنا بچے بھی نہ روک سکتے۔

پندرہ برس کی عمر میں گور کی نے شہر کا زمان کے ایک اسکول میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا اور تعلیم سے مایوس ہو کر اس نے ایک نان بائی کے یہاں ملازمت کر لی۔ جن لوگوں میں وہ یہاں رہتا تھا انھیں تو بھوک اور محنت کی زیادتی نے بے جان کر دیا تھا، لیکن گور کی کو چند ایسے طالب علموں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے اس کے ذہن میں انقلاب پسندی کے بیج بو دیے۔ گور کی نے نان بائی کی دکان کو خیر باد کہی اور جنوب اور جنوب مشرقی روس میں دو تین سال تک پھرتا رہا۔ ۱۸۹۰ میں وہ نوٹ گوردو کے ایک وکیل کا محرر ہو گیا اور وکیل کی ہمدردی اور ہمت افزائی کی بدولت اس کی علمی اور ادبی قابلیت اتنی ہو گئی کہ وہ افسانے لکھنے لگا۔ ۱۸۹۲ میں اس کا پہلا افسانہ شایع ہوا، اور اگرچہ اس وقت وہ پھر آوارہ گردی کرنے لگا تھا، اس نے افسانہ نویسی بھی جاری رکھی۔ تین سال کے اندر اسے اس ذریعے سے خاصی آمدنی ہونے لگی، ۱۸۹۸ میں اس کے افسانوں کا مجموعہ دو جلدوں میں شایع ہوا اور تھوڑے دنوں کے اندر وہ صرف روس میں نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ غیر ملکوں میں مشہور اور ہر دل غریزہ ہو گیا۔

ادبی حلقوں میں حیثیت بڑھ ہی تو گور کی پیربرگ میں آ کر رہنے لگا۔ یہاں اس کے انقلاب پسندوں سے تعلقات ہو گئے۔ وہ خود

کارل مارکس اور اشتراکیت کی تعلیم کا معقد ہو گیا اور اس کی آمدنی کا
 بیشتر حصہ سیاسی کاموں اور انقلاب انگیز خیالات کی اشاعت میں
 صرف ہونے لگا۔ ۱۹۰۰ میں وہ شہر بدر کر کے نوٹ گورد بھیج دیا گیا،
 مگر اس سزا کا اس کے طرزِ عمل پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ۱۹۰۲ میں وہ شاہی
 اکادمی کا رکن منتخب ہوا اور سرکار کے حکم سے یہ انتخاب منسوخ کر دیا
 گیا تو چٹوف کو جو خود کچھ پہلے منتخب ہوا تھا اتنا غصہ آیا کہ اس نے
 وکیت سے استعفا دے دیا۔ تین سال بعد، جب پہلے انقلاب
 کی تحریک اُٹھ رہی تھی تو گور کی قید کر دیا گیا، لیکن اس پر یورپ
 بھر میں ایسی ناراضگی کا اظہار کیا گیا کہ حکومت کو مجبوراً اسے چھوڑ دینا
 پڑا اور اس نے انقلابی کارروائیوں میں پوری شرکت کی۔ انقلاب
 کا خاتمہ کر دیا گیا تو گور کی فستان ہوتے ہوئے امریکہ گیا اور رہتے
 میں ہر جگہ اس کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا۔ امریکہ میں
 بھی کچھ عرصے تک اس کی بڑی قدر رہی، لیکن جب لوگوں کو معلوم
 ہوا کہ وہ بیوی جو گور کی سے ساٹھ آئی ہو بیوی نہیں خالی "دوست" ہو
 تو سیاسی سے بہت خفا ہو گئے۔ گور کی کو اپنی طرف یہ "قدامت پرستی"
 اتنی بُری لگی کہ اس نے امریکہ والوں کے خلاف ایک کتاب لکھ ماری۔
 امریکہ سے گور کی روس واپس نہیں گیا بلکہ چند سال اٹالیہ کے جزیرہ
 کاپری میں صحت کے خیال سے رہا۔ ادبی دنیا میں وہ کافی سراہا
 جا چکا تھا اور لوگ اس کے خاص طرز کے عادی ہو چکے تھے اور اس کی

اب وہ دھوم نہیں رہی تھی۔ اس دور کی دو ممتاز تصنیفیں ”بچپن“ اور ”غیروں میں“ اس کا چرچا بڑھا سکیں، اگرچہ وہ پہلے کے ناولوں سے بہت بہتر ہیں۔

۱۹۱۴ میں یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس وقت گور کی کارویا وہی تھا جو کہ اکثر تعلیم یافتہ روسیوں کا، یعنی وہ گشتِ دُخون پر افسوس کرتا تھا، دونوں فریق میں سے کسی کے ساتھ اسے اخلاقی ہمدردی نہ تھی اور لڑائی کے انجام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ جب ۱۹۱۷ میں انقلاب کے آثار نظر آئے تو گور کی جاگ اٹھا اور انقلاب کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گیا۔ لیکن انقلاب کے فلسفے کا وہ اتنا شدید متاثر نہ تھا، اور انقلابیوں کی سیاست سے اس کو ایسا اتفاق نہ تھا کہ وہ اس تحریک میں اپنی شخصیت کو محو کر دے اور اس کی حیثیت ایک اعلیٰ مرتبہ سرپرست اور نکتہ میں ہمدرد کی سی رہی۔ انقلاب کے رہبروں کو یہ بات پسند نہ تھی اور وہ اس پر اکثر اُچھٹے تھے، لیکن اس نے روسی ادب اور تہذیب کی آبرورکھ لی اور ترجمے کے ان اداروں نے جو گور کی نے اپنا اثر ڈال کر قائم کرائے بہت سے انشا پردازوں کو فائدے سے بچا لیا۔ تصنیف کے لیے تو ظاہر ہے زمانہ موزوں نہ تھا، گور کی نے صرف تین کتابیں اور لکھیں جن میں سے ایک میں تالستانی، کورولنکو، چخوف اور آندریسین وغیرہ سے اس کی جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے کچھ حالات ہیں، دوسری

کتاب ”میری تعلیم گاہیں“ اور ”میری روزنامہ“ ہی۔ ان میں جگہ جگہ پر افسانے اور ناول کا رنگ دکھائی دیتا ہے، لیکن ہیں وہ متفرق مضامین جن میں کمال دکھایا گیا ہے تو بڑے حلقے کے آثار بھی بہت صاف نظر آتے ہیں۔ روس کے مشہور گوئیے شلیا پین نے گور کی کے انتقال پر ایک مضمون لکھا جس میں اس نے گور کی سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے جو کسی حمام میں ہوئی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ میں گور کی سے پہلے بھی مل چکا تھا لیکن اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ میں کو بڑ نکلا ہوا ہے، سارے بدن پر گھسیٹھے اور داغ پڑے ہیں اور زخموں کے گہرے نشان بنے ہیں۔ شلیا پین کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ گور کی پر مصیبتوں کی بے طرح مار پڑی تھی، اس کی طبیعت نے فطرت کے مطابق تعلیم و تربیت کا سہارا لے کر نشو و نما نہیں پائی تھی، اسے اس طرح ٹھوک ٹھوک کر ایک شکل دی گئی تھی جیسے مٹھی دار بننا تھا اور آدمی اور اویس کی حیثیت سے اس کی امتیازی خصوصیت یہی تھی۔ دوسرے غریب سب کچھ جھیلے ہیں اور اس پر بھی ان کی زبان نہیں کھلتی، گور کی کو گویائی نصیب ہوئی اور دنیائے اس کی قدر اس سبب سے کی کہ ادب کے بازار میں ایسا مال آیا نہ تھا۔ روس میں ایسے انشا پر داز بہت کم ہوتے ہیں جنہیں چین سے رہتے اور پیٹ بھر کھانے کو ملا، لیکن ان سب کو تھوڑے بہت عرصے تک شائستگی اور تعلیم سے اثر لینے کا موقع ملا تھا اور تہذیب اور مہذب لوگوں سے

ان کا جو رشتہ قائم ہو چکا تھا اسے افلاس کی تکلیفیں توڑ نہ سکیں۔ وہ اپنی مصیبتیں برداشت کر لے گئے یا ان کے ہاتھوں مر گئے، بہر حال وہ اس طبقے میں کبھی شامل نہ ہو سکے جس میں سے گور کی اُبھر کر نکلا تھا، ان کا معیار شائستگی کا معیار ہوا، غریبی کی پستیوں میں ان کی نظر اخلاق اور تہذیب کی بلندیوں پر رہی۔ گور کی کے ابتدائی افسانے روس کے جاہل اور غریب طبقے کا حال اسی طرح بتاتے ہیں جیسے وہ مٹی اور گھونگھے جو جال کے ساتھ نکل آتے ہیں دریا کی تہ کا۔ اسے اگر شائستگی اور اخلاق کے کسی معیار کا احساس تھا بھی تو اس نے اسے الگ ہٹا کر رکھ دیا، ناظرین کو غریب کے گھر کا منظر دکھانے کے لیے چھت پھاڑ کر نہیں، اسی دروازے سے لے گیا جس سے غریب خود آتے جاتے ہیں، غریب کے دل کا حال بتانے کے لیے اسے شیشے میں رکھ کر نہیں بلکہ غریب کے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دکھایا۔ ایسی صداقت اور بے تکلفی میں بڑی کشش ہوتی ہے اور لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس سے ان کی اپنی آنکھوں کا نور بڑھتا ہے۔

”چلکاش“ (۱۸۹۵)، ”میرا ہم سفر“ (۱۸۹۶) اور ”مالو“ (۱۸۹۷)

گور کی کے پہلے افسانوں کے مجموعے ہیں، اور یہ زیادہ تر اس آوارہ گرد کی یاد گاریں ہیں جو گور کی نے اوڈیسہ اور جنوبی روس میں کی تھی۔ چلکاش ایک بڑا ڈھیٹا اور چلتا ہوا چور ہے۔ اس کے کارنامے اس کے ایک ماتحت اور مددگار کی وجہ سے اور بھی زیادہ شوخ رنگوں

میں نظر آتے ہیں، کیوں کہ اس کا یہ مددگار ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو چوری کرتے وقت مغفرت کی دعائیں بھی مانگتے جاتے ہیں۔ ”مالوا“ میں چلکاش کی روح نے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے روپ میں جنم لیا ہے، اور اس کا یا پلٹ نے جنت اور بیباکی کو دوبالا کر دیا ہے۔ میرا ہم سفر بالکل ہی الگ قسم کا آدمی ہے۔ وہ ہمت کے بجائے ذہانت کے کرشمے دکھاتا ہے، طبیعت کی افتاد نے اسے فلسفی، تجربے نے اسے فغضب کا مردم شناس بنا دیا ہے، وہ اپنے ساتھی کا فلسفیانہ گفتگو سے دل بہلا کر رستہ کاٹنا آسان کر دیتا ہے، اور ہموک لگتی ہے تو کجسوس سے کجسوس کے یہاں سے بھی روٹی حاصل کر لیتا ہے۔ ان سیرتوں اور ان کے کارناموں میں خاص مزہ اس سبب سے پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی داستان میں گور کی نے آپ بیتی اور جگ بیتی کو ملا دیا ہے، ان کی دنیا تخیل کی بنائی ہوئی نہیں ہے، آنکھ کی دیکھی ہوئی ہے اور اس میں اصلیت کا سارا رنگ روپ ہے۔

”مالوا“ کے بعد ”سابق انسان“ کے عنوان سے افسانوں کا جو مجموعہ گور کی نے شایع کیا اس کا موضوع اور ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کی دنیا اور ہے۔ اس میں ہمیں ایسی سیرتیں نہیں ملتیں جو ہمت کر کے دشواریوں کا مقابلہ کرتی ہیں، کسی اور طرح سے ممکن نہیں ہوتا تو چوری اور بد معاشی سے پرٹ پالتی ہیں اور عنبر سے دہتی ہیں نہ پولیس اور قانون سے۔ سابق انسان وہ لوگ

ہیں جنہیں بھوک اور جاڑے نے انسانیت کی ہر صفت سے خالی کر دیا
 ہے، مگر ان کا صبر اور بے حسی ایسی ہے کہ وہ بھوک اور جاڑے کے مارے
 بھی نہیں مرتے۔ گور کی خود بھی انہیں سابق انسانوں میں شامل ہوتے
 ہوتے رہ گیا تھا اور ان کی سیرتیں اور حالات بیان کرتے وقت وہ
 تہذیبی اور اخلاقی حس کو اپنے ذہن میں اسی طرح معدوم کر دیتا ہے
 جیسے کہ وہ اس زمانے میں واقعی تھا۔ وہ شکایت کا ایک حرف
 زبان پر نہیں لاتا، مظلوموں کی فریاد ہم تک نہیں پہنچاتا اور یہی
 انداز، جسے کوئی بے حسی کہے گا اور کوئی خود داری، درہل اس
 معاشرتی نظام کو درہم برہم کر دینے کی سب سے قوی دلیل بن
 جاتی ہے کہ جس میں انسان اس طرح آدمیت سے محروم ہو جائیں۔
 گور کی نے غم کو آنسوؤں میں بہا دیا ہوتا، دل میں درد رکھنے والوں
 کو ترپتے دکھایا ہوتا تو ہماری شرمندگی بہت کم ہو جاتی۔ لیکن سابق
 انسان رونے اور ترپنے والوں میں نہیں۔ ان کی روحانی کیفیت
 کا نمونہ انہیں میں کی ایک لڑکی ہے جو دن بھر ایک ٹوٹی کتھن میں چھپی
 بیٹھی رہتی ہے اس لیے کہ اس کے پاس بدن ڈھکنے کو دو چار پتھروں
 کے سوا کچھ نہیں، اندھیرے میں کتوں کی طرح ادھر ادھر ڈھونڈتی
 پھرتی ہے کہ زمیں پر کوئی کھانے کی چیز پڑی ہو تو بل جائے اور آدمی
 کی آہٹ سن کر ایسی بھاگتی ہے کہ جنگلی جانور دیکھیں تو کھڑے رہ جائیں۔
 گور کی کے پہلے دور کا کارنامہ چھبیس اور ایک ہے۔ یہ قصہ

اس وقت کا ہر جب گور کی نان بانی کے یہاں کام کرتا تھا۔ نان بانی کے چیمبس ملازم زمین کے نیچے ایک تاریک کمرے میں جہاں نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا صبح بڑے سے رات کو دیر تک کام میں لگے رہتے تھے، ان کی تھکن نے بڑھتے بڑھتے آرام کے تصور ہی کو مٹا دیا تھا، زندگی سے انھیں کوئی امید نہ تھی اور وہ ہنسنا تو درکنار بولنا بھی قریب قریب بھول گئے تھے۔ لیکن روز صبح جب ایک لڑکی تازی روٹی خریدنے آتی تھی تو سب سمجھتے تھے کہ ان کی کال کوٹھری میں نور کی ایک کرن پہنچ گئی ہے، اور انھیں ایسی تسلی ہو جاتی کہ وہ دن بھر کی محنت کا خیال کر کے بھی گھبراتے نہ تھے۔ لڑکی بڑی نک چڑھی اور منجلی تھی، وہ بھلا ان بیچارے محنت کے مارے غریب اور بے حس جانوروں کو کیا خاطر میں لاتی، وہ جب کبھی آتی تو دو چار گالیاں دیتی، ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور چلی جاتی۔ اس پر بھی اس کی جوانی اور سخی نے ان کے اُداس دلوں پر ایسا جادو کیا کہ وہ اسے عصمت اور پاکیزگی کا مجسمہ سمجھتے تھے، اس کی بے پردائی پر وہ جلد کرتے تھے اور زبان سے چاہے کچھ نہ کہہ سکتے ہوں وہ حقیقت میں اسی کو دیکھ کر اپنی انسانیت کا یقین کر سکتے تھے۔ ان کی عمریں شاید اسی معصوم عقیدت مندی میں کٹ جاتیں اگر ایک رنگیلا آدمی جسے اپنی صورت پر ناز تھا اور جسے عورتوں کی اندھا دھند قدر دانی نے بہت مغرور کر دیا تھا ان کا نگراں مقرر نہ ہوتا۔ یہ شخص ہر وقت اپنی فتوحات کا ذکر کر کے ان غریبوں کو طعنہ دیا

کرتا تھا اور جب وہ اس کی باتوں سے عاجز آگئے تو کسی کی زبان سے نکل گیا کہ عورتیں ہر طرح کی ہوتی ہیں، کسی کو اپنی عصمت کا خیال ہوتا ہو کسی کو نہیں ہوتا۔ یہ کہہ کر ناغضب تھا، نگراں نے جرح کر کے پتہ چلا لیا کہ وہ اس لڑکی طرف اشارہ کر رہا ہے جو روز صبح روٹی خریدنے آتی ہے، اور اس کا مطلب ہے کہ وہ اس کے جیسے آدمیوں کے فریب میں آنے والی نہیں۔ نگراں نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ لڑکی اسے کچھ خاص طور پر پسند نہ تھی، اور وہ تھی بھی حقیقت میں معمولی صورت شکل اور اچھی طبیعت کی لڑکی۔ لیکن اب جو مردانگی کی آبرو کا معاملہ تھا تو نگراں نے دائیہ کرنا شروع کر دیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نگراں نے لڑکی کے چھبیسوں پرستاروں سے کہہ دیا کہ وہ فلاں جگہ پر فلاں وقت میرے پاس آنے والی ہے۔ ان لوگوں کو اس کی بات کا یقین نہ آیا، مگر وہ نکلی سچی، ایسی سچی کہ یہ بھوے بھالے لوگ بھی شک اور انکار نہ کر سکتے تھے۔ اس کا انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ یہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی غریبی اور سچپاری کو بھول گئے، لڑکی جب خلوت کی جگہ سے نکلی تو انھوں نے دوڑ کر اسے گھیر لیا، منہ سے تو بول نہ پھوٹا، لیکن طرح طرح کے اشاروں سے اور آوازوں سے انھوں نے اپنا غم اور غصہ ظاہر کر دیا۔ لڑکی ایسی ڈھیٹھ اور بے حس تھی کہ اس نے نصیحت اور علامت کی اس بھڑی اور مضحک کوشش سے ذرا بھی اثر نہ لیا، او ان کے حلقے کو توڑ کر گالیاں دیتی ہوئی چلی۔ اسے کیا معلوم تھا

کہ اس کی مراد پوری ہوئی ہی تو ان غریبوں پر آسمان پھٹ پڑا ہی، اور معلوم بھی ہوتا تو کیا وہ ان کی خاطر اپنی طبیعت بدل دیتی۔ اب یہ بیچارے چھبیسوں اپنے کام پر واپس چلے گئے، ہر ایک کی کمر اور زیادہ جھک گئی تھی، ہر ایک کو زمین پر سے نگاہیں اٹھاتے اور ڈر لگتا تھا، اور دلوں پر ایسی مُردنی چھائی تھی کہ جس سے موت کا بھی دم اُلجھتا۔

اس طرح کی حقیقت نگاری چاہے قہنی ادبی خوبیاں اور اخلاقی مصلحتیں رکھتی ہو، انسان کبھی نہ کبھی یہ ضرور محسوس کرتا ہی کہ یہ ایک بند گلی ہی، اسی میں رہ جانا ہو تو خیر، ورنہ آگے جانے کے لیے تو کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا ہو گا۔ دنیا کے دکھ درد کی داستانیں مساکر خاموش ہو جانا ممکن ہی، لیکن بار بار یہی کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ آہستہ آہستہ یہ روٹیا ایک اخلاقی جس پیدا کر دیتا ہی اور داستانِ مٹنے مٹانے والے دونوں کی طبیعت چاہتی ہی کہ مذہب، فلسفے یا کچھ اور نہ ہو تو جنون کی ہوا آکر اس جس کو دور کرے۔ گور کی کو پانچ چھو سال تک حقیقت نگاری کرنے کے بعد خود ہی ایسے فلسفے کی فکر دہن بگر ہوئی جو انسان کو مصیبت اور تکلیف کے دریا کے پار پہنچا سکتا ہو، اور ممکن ہی اسے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ وہ زندگی جس کی تصویر اس نے اُمّاری معنی بغیر کسی سہارے کے قائم نہیں رہ سکتی۔ ڈراما نویس کی اس شاہ کار میں جس کا ذکر روسی ڈراما کے سلسلے میں آیا ہی اس نے پہلی دفعہ اخلاقی تسلی کا ذریعہ ایک اُن پڑھ فلسفی کو بنایا اور پھر آپ اپنا فلسفی

بننے کی دھن میں لگ گیا۔ اسی سلسلے میں اس نے افسانوں کے بجائے ناول لکھنا شروع کیا۔ لیکن ”بچپن“ اور ”غیروں میں“ کے سوا اس کے تمام ناول ابتدائی افسانوں کے مقابلے میں بہت گرے ہوئے تھے اور ایک نئے خدا کو بنا کر کھڑا کرنے کی جو کوشش اس نے ”شہر ادا کو روف“ میں کی وہ خاصی مضحک ثابت ہوئی۔ فلسفے اور شاعری کے لیے اس کی طبیعت بالکل موزوں نہ تھی، ناولوں میں بھی جہاں اس نے اس خاص میدان کو جس میں اس نے آوارہ گردی کی تھی چھوڑا اس کے قدم ڈلگانے لگے۔ ”نوما گوردے یف“ (۱۸۹۹)۔ ”تین آدمی“ (۱۹۰۱)۔ ”نا تو بی کو ژمیا کن“ (۱۹۱۱) صرف ایک حد تک کامیاب ہیں اور یہ حدود ہی جو گور کی کی آپ بیتی کی ہیں۔ ”بچپن“ اور ”غیروں میں“ وہ پھر اُسی دنیا میں داپس چلا گیا جس کے چپے چپے سے وہ واقف تھا، اور اس سفر سے وہ بڑی قیمتی یادگاریں ساتھ لایا۔

فلسفے کے ساتھ گور کی نے انقلابیات میں طبع آزمائی کی، اور اس کا ناول ”ماں“ (۱۹۰۷) ایک زمانے میں انقلابی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن جب انقلاب واقعی عمل میں آیا تو اندھا بھی دیکھ سکتا تھا کہ گور کی کے تخیل کو اس رستے کی منزلوں کا اور نشیب و فراز کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا، اور اب یہ ناول اُستاد کی غلطیوں میں شمار ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ادیب کی حیثیت سے گور کی کی

خاص خدمت یہ تھی کہ اس نے اس طبقے کی نمائندگی کی جو تہذیب اور
 مہذب لوگوں کی توجہ سے محروم رہا تھا اور انقلابی حلقوں میں وہ
 پرانی تہذیب کی نمائندگی کرتا رہا اس سے اس کی شخصی عظمت تو بڑھی
 لیکن اس ماحول سے جدا ہو کر جس میں اس کے ذہن نے پرداز کی
 پہلی مشق کی تھی وہ افسانہ یا ناول نویسی کے کارنامے دکھانہیں سکتا
 تھا اور تہذیبی رہبر بننے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ تھی۔ بیسویں
 صدی کے شروع سے جب اس کے انقلابی تحریک سے تعلقات
 قائم ہوئے اسے آدمی کی حیثیت سے ایک دنیا میں، ادیب
 کی حیثیت سے دوسری دنیا میں رہنا پڑتا تھا۔ اور ان دونوں
 کے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ وہ انھیں ملا کر ایک نہ کر سکا۔ نتیجہ
 یہ ہوا کہ وہ نہ اس کا دنیا کا رہا نہ اُس کا، اور آخر میں اس
 نے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ انقلاب کے بعد کی زندگی کا رنگ ایسا
 تھا کہ کاغذ پر چڑھتا ہی نہ تھا، اور اُس وقت پرانی زندگی
 کی یاد تازہ کرنا بے سود بھی تھا اور نامناسب بھی۔

گور کی کاسن بھی ایسا نہ تھا کہ افسانہ یا ناول نویسی کی کوئی
 نئی طرح ڈالے۔ وہ انشا پردازوں کا سر پرست تو رہا، لیکن
 ان کی رہبری کا اس نے حوصلہ کیا بھی تو اس قدر نہیں کہ انقلابی
 دور کی انشا پردازی میں اس کی شخصیت اور مذاق کا خاص
 اثر دکھائی دے۔ اور سب پہلوؤں کا خیال کیجیے تو یقین

بھی ہو جاتا ہے کہ گور کی کار دیا صحیح تھا۔ کیا معلوم قلم اور تلوار
 کا مقابلہ ہو جاتا، تصویر کا رنگ انقلابی تعلیم سے میل نہ کھاتا،
 اور بے موقع بات کہہ دینے سے انشا پردازی کی رسوائی ہوتی۔

